یادِ رفتگاں

ماہر القادری

مرتبہ

طالب الہاشمی

مکتبہ نشانِ راہ، نئی دہلی

یادِ رفتگاں

جلد اوّل

ماہر القادریؒ

مرتبہ

طالب الہاشمی

مکتبہ نشانِ راہ۔ نئی دہلی

یادِ رفتگاں

جلد اوّل

بار اوّل ــــــــــــــــ جنوری ۱۹۸۵ء ــــــــــــــــ ۱۰۰۰

قیمت ۴۰/= روپے

مطبوعہ:۔ بلس آفسٹ پرنٹنگ ورکس دہلی

فہرست مضامین

نمبر شمار — عنوان — صفحہ

حرفِ چند

طالب ہاشمی

الحمد للہ کہ تین سال کی کاوش کے بعد آج "یادِ رفتگاں" کی پہلی جلد آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ چند سال پہلے "مکتبہ الشرق کراچی" علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک مجموعۂ مضامین "یادِ رفتگاں" کے نام سے شائع کر چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مولانا ماہر القادریؒ نے اپنے ماہنامہ "فاران" کراچی میں (اپریل ۱۹۴۹ء سے مئی ۱۹۷۸ء کے درمیانی عرصے میں) "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت قلمبند کئے۔ کتاب کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے تین جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں ان "رفتگاں" کے تذکرے ہیں جن کے اسماء یا تخلص کا پہلا حرف الف سے ظ تک ہے۔ دوسری اور تیسری جلد میں ان "رفتگاں" کے تذکرے ہوں گے جن کے اسماء یا تخلص حروف ع تا ی سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس موضوع پر مولانا مرحوم کے کچھ متفرق مضامین بھی شامل ہوں گے۔

"یادِ رفتگاں" جن کی یاد میں مولانا ماہر القادریؒ نے اپنے تاثرات قلمبند کئے ہر طبقے اور ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے حتیٰ کہ بعض غیر مسلم بھی ان میں شامل ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین خالصتاً مولانا ماہر القادریؒ کے ذاتی تاثرات ہیں اور ضروری نہیں کہ قارئین کو ان سے اتفاق ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ انھیں بعض مضامین کے کسی پہلو سے شدید اختلاف ہو۔ لیکن بخدا اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ مولانا ماہر القادریؒ کے خیالات کی تشہیر اور تصدیق ——

مقصدِ اشاعت صرف یہ ہے کہ مولانا ماہرالقادریؒ جیسے نابغہ ادب کی نثری کاوشیں محفوظ ہوجائیں۔ آج لکھنے والا ہمارے درمیان موجود ہے اور نہ وہ موجود ہیں جن پر لکھا گیا۔ اگر مولانا مرحوم کے قلم سے کوئی غلط بات سہواً یا غلط فہمی کی بنا پر نکل گئی ہو تو بارگاہِ رب العزت میں دُعا ہے کہ وہ غفور الرحیم اپنی رحیمی کے صدقے ان کی لغزش کو معاف فرمائے اور جس کے بارے میں غلط بات لکھی گئی ہو مولانا کی لغزش کو اس کی نیکیوں میں شامل کردے۔ اگر کسی مضمون کا کوئی پہلو "رفتگاں" میں سے کسی کے ورثا کے لئے دلآزاری کا باعث بنے تو اس کے لئے مرتب اور ناشر دونوں معافی کے خواستگار ہیں اور ان سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ کسی بات کی تردید یا وضاحت کرنا چاہیں تو اختصار کے ساتھ لکھ کر ناشر کو بھیج دیں انشاء اللہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ان کی تردید یا وضاحت کو بھی شامل کر دیا جائے گا۔

اگر علم و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب نے اس کتاب کی خاطرخواہ پذیرائی کی تو انشاء اللہ مختلف موضوعات پر مولانا کے دوسرے نثری شہ پاروں کا انتخاب بھی مستقبل قریب میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں جناب حبیب احمد صدیقی صاحب مدظلہٗ کا صمیم قلب سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اسی طرح جناب علیم ناصری صاحب کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے پروف پڑھنے میں میرے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَانَا۔

بندہ ناچیز

طالب الہاشمی غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جناب حبیب احمد صدیقی صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

مولانا ماہر القادری کو اللہ تعالیٰ نے دولت علم سے بڑی فیاضی سے نوازا تھا۔ وہ بڑے اچھے شاعر، بڑے اچھے نقاد، بڑے اچھے نثر نگار اور بڑے اچھے عالم دین تھے۔

جب تک ہندوستان کی تقسیم نہیں ہوئی تھی اس وقت تک مولانا ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مشاعروں میں بہ اصرار بلائے جاتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ یہاں آ گئے۔ یہاں بھی مشرقی اور مغربی پاکستان کے اچھے مشاعروں میں ان کی شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے مشاعروں میں بھی انہیں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی کی نعمت سے بہرہ مند کیا تھا جو مشاعروں میں ان کی مقبولیت کو چار چاند لگا دیتی تھی۔ مگر وہ ان شاعروں میں سے نہ تھے جو محض اپنی خوش الحانی کی بدولت مشاعروں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مولانا صف اوّل کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا اعلیٰ معیار ان کے قبول عام کا اصل راز تھا۔ ان کی شاعری میں مقناطیسی تاثیر پیدا کرنے کی ضامن ان کی ندرت خیال، رفعت فکر اور شگفتگی بیان تھیں۔ ہر چند اس پیش لفظ کا موضوع مولانا کی شاعری نہیں پھر بھی جی چاہتا ہے کہ اہلِ ذوق کو ان کے لطیف اور بلند پایہ اشعار سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے دس بارہ اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کروں ــــــ

آنکھوں کی تشنگی کا تمھیں تجربہ نہیں
تم دیکھتے رہو گے تو بڑھتی رہے گی پیاس

لطافت نگہِ ملتفت کا کیا کہنا
کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی

ز فرق تا بقدم سحر و نغمہ و مستی
نظر نظر میں فسانہ نفس نفس میں رباب

ان غم زدوں کی بیکسیٔ غم نہ پوچھئے — جو انتظار ہی میں رہے غم گسار کے
دل کی چوٹیں کہیں آواز میں ڈھل سکتی ہیں — اتنی پُرسوز ہے اس پر ادھوری ہے فغاں
میں لوحِ مہ وسال پہ وہ نقشِ وفا ہوں — مٹنے سے اُبھرتا ہے مرا نام ونشاں اور
یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں — غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں
گدازِ شمع سے واقف نہ سوزِ غم کی خبر — الجھ رہا ہے ابھی روشنی سے پروانہ
کبھی گلہ تری بیگانگی سے تھا مجھ کو — جواب ہوئی ہے توجہ تو اک قیامت ہے
گزرے ہوئے شباب کی بس یاد رہ گئی — اور یاد بھی کہ جیسے فریبِ خیال ہو
خیال وفکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں — یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں
اتنی شمعوں کی ضرورت کیا ہے — کیا ابھی اور اندھیرا ہوگا!

یہ اشعار حکایتِ دل ونظر کے علاوہ کاروبارِ زیست کے کچھ اور پہلوؤں سے بھی متعلق ہیں۔ مثلاً آخری شعر ظلم کی تیرگی کے بڑھتے ہوئے اقدام پر توجہ مبذول کراتا ہے اور تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر تیرگی کی مدافعت کے لیے زیادہ شمعیں روشن رکھنے کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔

نظیری نیشاپوری کا ایک نہایت مشہور شعر ہے جس میں وہ محبوب کے حسن کی جاذبیت کا نہایت دلکش انداز میں ذکر کرتا ہے :-

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

مولانا نے بھی اپنے محبوب کے جاذبِ نظر اوصاف کی تصویر کھینچی اور بہت خوب کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں :-

زفرق تا بقدم سحر و نغمہ و مستی — نظر نظر میں فسانہ نفس نفس میں رباب

شاعری کا ذکر چھڑ گیا ہے تو "یادِ رفتگاں" کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی تبصرہ نگاری کی بھی ہلکی سی جھلک دکھا دی جائے۔ مصنفین کی تخلیقات پر تبصرہ کرنے میں مولانا بڑی دیدہ ریزی اور دیانت داری سے کام لیتے تھے۔ تبصرے کے لیے جو کتابیں آتیں انھیں عموماً شروع سے آخر تک پڑھتے اور ان کے حسن وقبح کا پورا جائزہ لیتے تھے۔ عیوب سے صرفِ نظر کر کے صرف محاسن کی داد دینے کو تنقیدی فرائض کے خلاف سمجھتے تھے جس کے باعث انھیں مصنفین

کی خفگی اور کبھی کبھی عتاب سے سابقہ پڑتا۔ مگر وہ کسی سے رورعایت اور اپنی روش میں تبدیلی کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ "فاران" کے فروری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات "یادوں کی برات" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنا مسلک یوں بیان کیا ہے —

"۲۳ سال کی مدت میں ہمارے قلم سے ڈھائی ہزار سے زائد کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ہوا ہے۔ جہاں تک ہمارے امکان میں تھا ہم نے ہر کتاب کو پورے غور و توجہ سے پڑھا اور دیانت کے ساتھ اُس پر رائے کا اظہار کیا۔ کسی مصنف، مترجم، مؤلف یا شاعر و ادیب کے ساتھ ہم نے زیادتی نہیں کی۔ ہر کتاب کے محاسن و معائب کے دونوں رُخ نمایاں کر دیے۔ متعدد اہل قلم اور مصنفین و شعراء نے نہ صرف یہ کہ ہماری تنقید کو گوارا فرمایا بلکہ ان کمزوریوں کا جن پر ہم نے گرفت کی تھی دل سے اعتراف کیا۔ ہاں وہ حضرات جو صرف تحسین و ستائش کی توقع رکھتے تھے ہم سے ناراض ہو گئے۔ احتساب و تنقید کو گوارا کرنے کے لیے بڑے ظرف و تحمل اور دل گردے کی ضرورت ہے۔"

مولانا کی تبصرہ نگاری کی دیدہ ریزی، جانفشانی، دیانت داری اور ہمہ گیری کو واضح کرنے کے لیے میں صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جوش ملیح آبادی کی سوانح عمری "یادوں کی برات" پر مولانا نے فروری ۱۹۷۲ء میں جو تبصرہ کیا تھا وہ "فاران" کے اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تبصرہ پاکستان و ہندوستان میں بہت پسند کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے عالم متبحر نے اسے رسالہ "صدق جدید" میں کئی قسطوں میں شائع کیا۔ مارچ ۱۹۷۲ء کے "فاران" میں اس کی مقبولیت کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ "(ٹیلیفون پر) بالمشافہ اور خطوط کے ذریعہ راقم الحروف کے اس مفصل تبصرے کی اتنی داد دی گئی کہ میں وہ اقتباسات نقل کروں اور پورے کے پورے خط چھاپ دوں تو یہ "اعتراف و ستائش" خود ایک مضمون بن جائے"۔ مولانا نے صرف رئیس امروہوی صاحب کے خط کے کچھ اقتباسات چھاپے جن میں سے ایک یہ ہے:

"یادوں کی برات میں جوش صاحب نے صرف اپنی جسمانی فتوحات پیش

کی ہیں۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ اپنی گہری روحی (اگر روحانی واردات نہیں) سے ہمیں مستفیض کریں گے۔ یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔"

مولانا کے تبصرے کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

" "یادوں کی برات" کو ہم نے شروع سے آخر تک پڑھا۔۔۔ یہ ایک مشاق ادیب اور عظیم شاعر کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے جسے دلچسپ اور رنگا رنگ ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ لکھنے والے نے ڈھکی چھپی ہر بات کسی جھجک، تکلف، اندیشۂ ملامت اور خوف رسوائی کے بغیر بیان کر دی ہے۔ جوش صاحب جنسی معاملات، ہوس ناک واردات اور تجربوں کے اظہار میں شرم و غیرت کو بزدلی اور نامردی سمجھتے ہیں۔ اس لیے "یادوں کی برات" اپنی جگہ عریانی و برہنگی کا کوک شاستر بن گئی ہے۔ کوکا پنڈت زندہ ہوتا تو اس برہنگی کی واقعی داد جوش صاحب کو دیتا۔۔۔۔۔ وصل و ہم آغوشی کے ذکر و بیان میں جنسی جذبات کے لیے بڑی لذت اور کشش ہوتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس لذت اور کشش کی اس کتاب میں فراوانی ہے۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے رنگین و برہنہ مقامات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کریں گے جیسے اُن کے جذبات میں کسی نے شتابہ لگا دیا ۔۔۔۔۔ اس آتش بازی سے اخلاق کے خس خانے بھک سے اڑ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اخلاق باختگی، ان کی نگاہ میں انسانیت کا بہت بڑا شرف ہے۔۔۔۔۔ طوائفیں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے اپنی کم سن لڑکیوں کو جلد سے جلد بالغ اور جنسی معاملات میں بے تکلف دیکھنا چاہتی ہیں۔ "یادوں کی برات" کے فحش و برہنہ مقامات ان نوچیوں کے کام کی چیز ہیں ۔۔۔۔۔ جوش کو سب سے زیادہ دشمنی حیا اور غیرت سے ہے۔"

جوش کی چودہ صاف و شستہ عبارتیں نقل کرنے کے بعد مولانا نے لکھا ہے:

" جوش صاحب کے اس اندازِ بیاں کی ہر صاحبِ ذوق تحسین کرے گا، جو اہلِ قلم زبان کے مزاج کے اصولوں اور نزاکتوں سے بے پروا ہو کر جو جی میں آتا ہے لکھ مارتے ہیں ان کے لیے جناب جوش کا اسلوبِ نگارش نمونہ

بن سکتا ہے کہ بات اس سلیقہ کے ساتھ کہی جاتی ہے اور لفظوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ برتا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب میں لکھنؤ کے قدیم تمدن و تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ بہت سی معروف و غیر معروف شخصیتوں کا اس کتاب کے ذریعہ تعارف ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب میں اردو کے ایسے بہت سے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں آگئی ہیں جن کو آج کل کی نسل بڑی تیزی کے ساتھ بھولتی جا رہی ہے ۔ تیوہاروں، کھیلوں، کھانوں، سواریوں، زیوروں اور کپڑوں وغیرہ کے ناموں کے اعتبار سے یہ کتاب معلومات آفریں بھی ہے ۔ جوش صاحب نے فارسی کے منتخب اشعار جابجا نگینہ کی طرح جڑ دیئے ہیں ۔ "

" اتنی سعی و کاوش کے باوجود یادوں کی برات میں زبان کی کمزوریاں اور لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ دو رباعیوں کے چار شعروں کا قطعہ ہے ۔ فرماتے ہیں:

گلشنِ زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں   دجلۂ خونِ رگِ جاں ہے کوئی کیا جانے

پھولوں کی رنگینی میں خونِ رگِ جاں کے دجلہ کا پایا جانا کتنا بے جا اور خلافِ واقعہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رنگینی کے ساتھ اس کی نسبت عجیب سی لگتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موزخانِ شباب کے شانے ہلائے، (صفحہ ۲۶) تذکرہ نگارانِ شباب، زیادہ حسین اور موزوں ترکیب تھی ۔ اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا، (صفحہ ۲۶) اس جملہ کا پہلا ٹکڑا (اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا) لفظ و معنی اور زبان و بیان ہر اعتبار سے محلِ غور ہے ۔ "

" جناب جوش مترادف الفاظ جمع کرنے کو شاید انشاء پردازی کا کمال سمجھتے ہیں مگر ان کا یہ اندازِ نگارش پڑھنے والے کے اندر اکتاہٹ اور بدمزگی پیدا کر دیتا ہے ۔ لکھتے ہیں —— اودی اودی جھومتی جھمکتی، جھر جھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جوبن والی جوشیلی برسات، گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی، گھومتی، گھماتی، گنگناتی، گمکتی، گاتی، گرجتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی گھونگر والی برکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری گاڑی سینکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار وں

کے درمیان سے گھڑ گھڑم، شائیں شائیں کرتی اور صدہا لائن بنانے والی اتصالی پٹریوں کو تیج میچ قچاک، کچھ کچھ کھچاک اور کٹ کٹ کاٹ کاٹتی ـــــ الالاہٹیں، گھبراہٹیں، شائیں شائیں، غائیں غائیں، دھڑام دھڑام اور ڈھوم ڈھوم اور ڈھائیں۔"

مترادف الفاظ جمع کرنے کی اور کئی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان سب سے طبیعت منغض ہوتی ہے۔ ان مثالوں کے بعد مولانا نے لکھا ہے :

"جوش صاحب کی صوتیاتی جدت اور مترادفات کی بھرمار نے بچاری انشا پردازی کا حلیہ بگاڑ دیا۔"

مولانا نے اور بہت سی مثالیں دی ہیں جن میں الفاظ کا غلط استعمال کیا گیا ہے! ان میں سے صرف دو درج کرتا ہوں :

"دودھ دہی کی ہانڈیوں، مٹھائیوں اور رساول کی بڑی بڑی لیٹیوں کا ایک انبار لگ گیا۔"

اس پر مولانا کو اعتراض ہے کہ :

"لٹیوں کے بجائے ٹھلیوں لکھنا تھا ..... خاص طور پر گاؤں میں رساول کے لیے ٹھلیاں استعمال ہوتی ہیں۔"

"پاؤں میں چھاگل اور جھانجنیں (صفحہ ۲۰۱)۔"

اس پر مولانا نے فرمایا :

"جھانجھ یا جھانج تو ایک قسم کا بڑا مجیرا ہے جو تاشے اور ڈھول کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ عورتیں پیروں میں جھانجھ نہیں جھانجن پہنتی ہیں۔"

زبان کی غلطیوں کی، جن کی تعداد بہت ہے، نشاندہی کرنے کے علاوہ مولانا نے غلط بیانیوں اور ناقابلِ قیاس باتوں پر بھی گرفت کی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے مشہور شاعر کے یہاں اتنی ساری غلطیاں پائی جائیں۔ زبان پر مولانا ماہر القادری کی کامل قدرت رکھنے کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان کی نظر سے کوئی غلط لفظ یا محاورہ بچ کر نہیں جاتا۔ اس لیے بڑے بڑوں کی تحریر میں انھیں غلطیاں مل جاتی ہیں۔

جب کسی ممتاز شخص کا انتقال ہو جاتا ہے تو تعزیتی اعلان (OBITUARY)

یا تعزیتی مضمون اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں جو عموماً متوفی کی زندگی کے مختصر حالات لکھ کر جوارِ رحمت میں جگہ پانے کی دعا پر ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ ماہر صاحب نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے اس میں روایتی طور پر مختصر حالات زندگی لکھنے اور دعائے مغفرت دینے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ متوفی کی زندگی کی مفصل روداد پیش کی جاتی ہے جس میں زندگی کے اہم واقعات کے علاوہ اور بہت سی باتیں بھی درج کی جاتی ہیں۔ ہر شخص کی زندگی میں اہم واقعات کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر انسان میں خوبیوں کے علاوہ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کسی کی صرف خوبیاں بیان کر کے اس کی مکمل تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ اہم واقعات کے علاوہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ اکثر تعزیتی مضامین اس لیے بے جان اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں کہ لکھنے والے غیر اہم واقعات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مولانا اس راز سے واقف تھے کہ ہر انسان کی کہانی دلچسپ ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کی زندگی کے حالات کو تراش خراش کیے بغیر پیش کیا جائے۔ چنانچہ وہ اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ متوفی کے وہ تمام واقعات جو ان کے علم میں ہیں انھیں ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ کوئی اچھا ناول یا افسانہ اسی صورت میں دلچسپ ہوتا ہے جب وہ کرداروں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرے۔ مولانا کردار نگاری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے تعزیتی مضامین بے جان نہیں بلکہ دلچسپ ہیں۔ کسی کے حالات کو سلیقہ سے لکھنا آسان کام نہیں۔ جو دستگاہ مولانا کو حاصل تھی وہ بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔

مولانا بہت خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ ان کے دوستوں اور جاننے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ جن لوگوں پر انھوں نے تعزیتی مضامین لکھے ہیں ان میں بیشتر سے تعلقات یا واقفیت تھی۔ ان کے بیان کردہ واقعات ذاتی علم پر مبنی ہونے کی وجہ سے حقیقت کی چاشنی لیے ہوتے ہیں۔ یہ وہ چاشنی ہے جو ان کے مضامین کی جان ہے اور ان کو دلآویز بنا دیتی ہے۔ ان کے بہت سے تعزیتی مضامین میں سے مجھے جو سب سے زیادہ دلچسپ لگے وہ وہ ہیں جو آغا شورش کاشمیری اور مولانا عبدالماجد پر لکھے گئے۔ ان دونوں کے بارے میں جو مضامین مولانا نے لکھے ان کے اقتباسات پیش کرتا ہوں ——

آغا شورش کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

"چٹان" میں ان کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا اور ذہن و فکر نے اچھا اثر قبول کیا۔ ہفتہ وار "چٹان" جتنا مقبول ہوتا گیا شورش کی شہرت بھی بوئے گل کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ انھوں نے شہرت اور دولت، جو کچھ حاصل کیا اپنی قوتِ بازو سے حاصل کیا، یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے ادب و صحافت کا دبستان بن گئے۔"

"سنہ ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ مشہور ادیب، ناول نگار، مترجم اور صحافی رئیس احمد جعفری مرحوم دفتر "فاران" میں تشریف لائے اور ایک مضمون چھپنے کے لیے عنایت فرمایا۔ یہ مضمون ابوالکلام آزاد سے متعلق تھا۔ اس میں مولانا آزاد کے آبائی وطن — کھیم کرن — کی نشاندہی کی گئی تھی اور ان کے سفرِ عراق و مصر پر تنقید تھی۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا آزاد نے اپنے بارے میں بعض واقعات صحیح نہیں لکھے۔ میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس مضمون کا خلاصہ کر دیتا ...... مگر میں نے ان کا مضمون نہیں چھاپا اور مولانا آزاد کے بارے میں بعض واقعات کی وضاحت خود ان کے قلم سے ضروری سمجھی۔ چنانچہ میں نے مولانا آزاد کی خدمت میں رجسٹرڈ کے ذریعہ عریضہ ارسال کیا ...... دو ہفتے اپنے خط کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں نے دوسرا خط بھی رجسٹرڈ ہی بھیجا ...... مگر میرے کسی خط کا جواب نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے مولانا کے آبائی وطن اور سفرِ مصر وغیرہ کے بارے میں خود تحقیق کی اور اس تحقیق کا خلاصہ ایک مضمون کی شکل میں پیش کر دیا ...... شورش کاشمیری نے مولانا کی مدافعت میں راقم الحروف پر شدید تنقید کی اور ہفتہ وار چٹان میں یہ تک لکھ دیا کہ ماہر القادری کا نسبی تعلق اودھ کے معزول فرمانروا واجد علی شاہ کی ایک ممنوعہ حرم سے ہے۔ ۱

؎ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے — اور اس عجیب و غریب ذہنی جدت و افترا پر ناطقہ کو سچ مچ سر بگریباں اور خامہ کو انگشت بدنداں ہونا پڑا۔ شورش سے جب ملاقاتیں ہونے لگیں تو ان کی اس تنقید کا ذکر آیا۔ فرمانے لگے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کوئی اولاد بھی نہیں چھوڑی جو ان کی مدافعت کر سکتی،

ان کا کوئی شاگرد بھی نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو کیا ہر شخص کو مولانا آزاد کی مدافعت کا حق حاصل ہے مگر مدافعت کو بے بہر دیا تہمت تو نہیں بنناچاہیے ——"

" (لاہور میں مولانا زکی کیفی کی دکان ادارۂ اسلامیات میں) شورش صاحب سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت کے ساتھ معانقہ کیا اور طنز و مزاح کی پھلجھڑیوں اور مزیدار باتوں کے شکر پاروں سے میری تواضع کی۔ یہ غالباً ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے۔"

" اب سے گیارہ برس پہلے کی بات ہے شورش مرحوم کراچی تشریف لائے مجھے فون کیا اور اپنے خاص لہجے میں بولے، "میں آج صبح لاہور سے کراچی آیا ہوں حضور سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

" فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں آغا شورش دو تین بار قید و بند کی مصیبت میں مبتلا ہوئے مگر انھوں نے بڑی عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا۔ ایک بار بھوک ہڑتال بھی کی تھی اور کئی دن تک مسلسل ترک غذا نے ان کی صحت کو بہت کچھ متاثر کر دیا تھا۔ خدا خدا کرکے بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔ پھر وہ کراچی ہسپتال میں جیل خانہ سے منتقل کر دیئے گئے ۔۔۔۔ ان کے ایک دوست کے توسط سے جن سے میری بھی شناسائی تھی شورش کی خیر خبر ملتی رہی۔ ان کے دوست کہا کرتے تھے کہ آغا صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ پھر ایک دن وہ شورش صاحب کا ایک پرچہ لے کر آئے جس پر غالب کا یہ مصرعہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جاتا — لکھا تھا۔"

بدقت تمام مولانا ہسپتال میں شورش صاحب کے کمرے تک پہنچے۔

" مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دس بارہ منٹ ہم دونوں کی بات چیت رہی۔"

" جس جلسہ میں آغا شورش تقریر کرتے اور اس میں راقم الحروف بھی ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے روئے سخن میری طرف رہتا۔ انٹرکانٹنل ہوٹل میں شامِ النور کے مخصوص مقرر آغا شورش بھی تھے۔ تقریر شروع کرنے کے چند منٹ بعد بولے، یہ ماہر صاحب لفظ و بیان اور روزمرہ کی غلطیاں پکڑتے

رہتے ہیں، فلاں مصرعہ میں فلاں لفظ کا الف دب گیا، مضمون نگار نے مذکر لفظ کو مونث لکھ دیا، یہ محاورہ یوں نہیں یوں ہے، اہلِ زبان اس طرح نہیں بولتے۔"

چار سال پہلے کی بات ہے مجلس اتحاد العلماء کے زیر اہتمام لائل پور میں سیرۃ النبی کے کئی اجلاس ہوئے ...... جس دن آغا شورش کاشمیری کی تقریر تھی جلسہ گاہ میں دور تک آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے، مجمع ڈیڑھ لاکھ سے کیا کم ہوگا۔ میرے شیر نے وہ دھواں دھار اور طوفانی تقریر کی کہ پورے ماحول کو شعلہ جوالہ بنا دیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر اس قدر کس کر تنقید کر ڈالی جیسے مقرر کو اپنا مال و دولت عزیز ہے نہ آرام و راحت سے دلچسپی ہے اور نہ اپنی جان پیاری ہے۔ میں اسٹیج پر ہی بیٹھا تھا، بار بار مجھے مخاطب فرماتے تھے ــ کیوں، ماہر صاحب سنا آپ نے آپ اس بات کے گواہ ہیں، اے ماہر القادری پاکستان میں یہ بھی ہو رہا ہے.....

اس تقریر کے ڈیڑھ دو مہینے بعد آغا صاحب گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے رہائی کے بعد شکوہ کیا کہ جس لائل پور میں ڈیڑھ لاکھ کا مجمع "شورش زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا اس کی گرفتاری کے بعد لائل پور کے سو آدمیوں نے احتجاج نہ کیا۔"

" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے شروع شروع میں بہت مداح تھے انھوں نے چٹان میں اس کا اعتراف کیا کہ دہریوں اور کمیونسٹوں سے جیل خانہ میں پالا پڑا اور ان کی صحبت میں میرے دینی عقائد متزلزل ہو جاتے مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر نے مجھے بچا لیا۔ پھر انھوں نے اس مدح و ستائش کے بعد مولانا مودودیؒ پر ایکا ایکی تنقید کی چاند ماری شروع کر دی۔ تقریباً سال سوا سال تک یہی لب و لہجہ رہا۔ ان ہی دنوں جب ہفتہ وار "چٹان" میں مولانا مودودیؒ پر تنقید جاری تھی میرا لاہور جانا ہو گیا۔ ادارہ اسلامیات میں آغا شورش کاشمیری سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا آپ تو مولانا مودودیؒ کے بڑے مداح تھے ان کے بارے میں آپ کی رائے کیسے بدل

گئی۔ فرمایا، بڑے بڑے لوگ میری والدہ کی موت پر تعزیت کے لیے آئے مگر مولانا مودودی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی ۔۔۔۔۔۔ میں نے ان کے جواب میں مولانا موصوف کی بیماری کا عذر پیش کیا اور ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہا کہ آپ کی والدہ محترمہ کی وفات پر آپ کے یہاں پُرسے کے لیے نہ آنے سے ان کے علم و فضل اور سیرت و کردار سب کے سب بے وقعت کیسے ہو گئے ؟ مگر میری کسی دلیل کو آغا صاحب نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی روش پھر بدلی۔ ان کے جی میں اللہ تعالیٰ نے نیکی ڈال دی۔ مولانا مودودی پر جتنی جرح و تنقید کی تھی اس سے کہیں زیادہ مدح و ستائش سے تلافی کی۔"

"راقم الحروف سے آغا شورش کاشمیری یک گونہ روابط رکھتے تھے۔ اپنی نظروں میں مجھ ہیچ مداں کا نام لیا ہے۔ جب بھی خط لکھنے کی نوبت آتی ہر خط میں اپنے دوستانہ روابط کا ضرور ذکر کرتے۔ مگر ان کی ایک روش نظر انداز کرنے کی روش بھی تھی۔ مثلاً میں نے کئی کئی مہینے مسلسل فاران ان کی خدمت میں بھیجا لیکن انھوں نے "چٹان" تبادلہ میں جاری نہیں فرمایا۔ انھوں نے اپنی کتاب تبصرہ کے لیے ڈاک سے بھیجی تو میں نے "فاران" میں پہلی فرصت میں ریویو کر دیا۔ مگر میں نے اپنی کتاب "کاروانِ حجاز" جمیل ہوٹل کراچی میں خود جا کر دی تو اس پر تبصرہ نہیں آیا۔"

"فاران" کے "توحید نمبر" کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرے ایڈیشن کی ڈیڑھ دو سو کاپیاں فروخت ہونے سے رہ گئی تھیں۔ میں نے ہفتہ وار "چٹان" کے منیجر کے پتہ پر "توحید نمبر" کا اشتہار بھیجا کہ اس کی جو اجرت ہو اس کا بل بھیج دیا جائے، بل آتے ہی رقم ادا کر دی جائے گی۔ "توحید نمبر" کا خاصا طویل اشتہار "چٹان" میں چھپا مگر منیجر کا خط آیا کہ آپ سے اشتہار کی اجرت نہیں لی جائے گی۔ اس ایک اشتہار پر "توحید نمبر" کے ستر اسی آرڈر آ گئے۔ یہ آغا شورش کی اعلیٰ ظرفی، سیر چشمی اور دوست نوازی کی دلیل تھی۔"

" سال سوا سال ہوا " فاران " میں پروفیسر محمد سرور کی کتاب " عبیداللہ سندھی " پر مفصل تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہ تبصرہ ایک مشہور اہلِ قلم کو جو عبیداللہ سندھی کے عقیدت مند ہیں پسند نہ آیا۔ انھوں نے نہ جانے آغا شورش کو خط میں کیا لکھ دیا کہ آغا صاحب نے " چٹان " میں مجھ پر تنقید کر ڈالی۔ میں نے آغا شورش کی خدمت میں خط بھیجا کہ میں نے تو کئی برس سے مولانا آزاد کے بارے میں کوئی مضمون نہیں لکھا۔ ہاں پروفیسر سرور کی کتاب " عبیداللہ سندھی " پر " فاران " میں تنقید کی تھی۔ یہ تنقید آپ " چٹان " میں میرا نام لکھے بغیر چھاپ چکے ہیں پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے یا اُن کی مدافعت میں مجھ پر تنقید کس لیے کی گئی۔ اس کے جواب میں ان کا جو خط آیا تھا وہ حسنِ اتفاق سے میرے کاغذوں میں محفوظ رہ گیا ۔۔
۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء۔ ماہر صاحب محترم و مکرم! سلام مسنون۔ آپ کا خط ملا۔ فاران بھی پہنچ گیا۔ ایک دو روز میں تفصیلات لکھوں گا۔ بیماری جا چکی ہے، توانائی واپس نہیں آرہی ہے۔ مولانا آزاد سے متعلق میرے جذبات نہایت نازک ہیں۔ آپ سے تعلق خاطر ہے۔ قلم تلے یوں کہیے دل کی مخلصانہ ٹھیس تھی۔ میں اس سلسلہ میں مفصل بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ صحت ساتھ دے تو عرض کردوں۔ بہرحال میرے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں کہ مجھے آپ سے تعلق خاطر نہیں رہا۔ میں جس مسلک کا انسان ہوں اس میں دوستی کے رشتے پائدار ہوتے ہیں۔ والسلام مخلص شورش کاشمیری۔
۔۔ اس خط کے دو ڈھائی مہینے بعد کراچی تشریف لائے جیبس ہوٹل میں قیام فرمایا۔ مجھے ٹیلیفون کیا۔ مغرب کے بعد آغا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک دو ملنے والے بیٹھے تھے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم حسب معمول خندہ پیشانی کے ساتھ ملے ..... شورش مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی "

" آغا شورش کاشمیری نے مسٹر غلام مصطفےٰ کھر کی گورنری کے مستبد دور میں کلمۂ حق بلند کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی کھر کے ذاتی کردار و حالات کا " چٹان " میں ایسا تجزیہ کیا کہ کھر صاحب چیں بول گئے۔ مسٹر کھر معتقد کی

تاب نہ لا کر شورش مرحوم کے مکان پر پہنچے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر اُس دن سے آغا شورش نے ان کے خلاف لکھنا موقوف کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھر سے ملاقات کے بعد اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ کھر بُرا آدمی نہیں۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی مخالفت میں نظم و نثر کے عنوان اور لب و لہجہ بدل بدل کر "چٹان" میں بہت کچھ لکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی بیباکی، حرفِ برہنہ اور حق گوئی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ مگر سُنا ہے کہ مسٹر بھٹو نے بھی شورش صاحب کے مکان پر قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے بعد عزت مآب وزیر اعظم کے خلاف تنقید کا باب بند کر دیا۔"

"آغا شورش انگریز کے دور میں جب پہلے پہل جیل گئے تو ان کی عمر بہت سے بہت انیس برس کی ہوگی۔ انھوں نے انگریز کے عہدِ استبداد میں اور پاکستان بننے کے بعد حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی مصیبتیں مردانہ وار برداشت کیں۔"

"تقریر و تحریر اور شاعری پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ شاعری میں بھی ان کی طبیعت نے خوب جوہر دکھائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس بارہ شعروں کی غزل یا نظم چند منٹوں میں کہہ کر دم لیتے۔ مشاعرہ چاہے ریڈیو سے ہو چاہے ٹیلی ویژن سے، کتنا ہی بھاری معاوضہ ہو مگر وہ مشاعرے میں شریک نہ ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وصف میں وہ منفرد تھے کہ ان کی زبان سے ان کا کوئی شعر سنا نہ گیا۔"

"لادینیت، مغرب زدگی، مذہبی آزادی اور تجدد کے خلاف بھی انھوں نے قلمی جہاد کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ نے زیارتِ حرمین شریفین کی بھی توفیق عطا فرمائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قادیانیت کے خلاف زبان و قلم سے ان کا جہاد آخری سانس تک جاری رہا۔"

مولانا ماہر القادری مرحوم نے آغا شورش کاشمیری مرحوم کے حالاتِ زندگی کا جائزہ "فاران" کے آٹھ صفحوں میں لیا ہے۔ میرے انتخاب کردہ اقتباسات اس کے تقریباً تہائی ہوں گے۔ آغا صاحب کی مکمل شخصیت تو مولانا کا پورا جائزہ پڑھنے ہی سے سامنے آ

سکتی ہے۔ مگر پھر بھی ان اقتباسات سے شورش مرحوم کی اچھی خاصی تصویر آنکھوں کے آگے آ کھڑی ہوتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ماہر صاحب نے پہلی بار ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ کی بارہ دری میں دیکھا تھا جہاں عظیم الشان پیمانے پر حجاز کانفرنس ہوئی تھی۔ ماہر صاحب مولانا دریا بادی کی فلسفیانہ شخصیت سے مرعوب تھے۔ ماہر صاحب کے حیدرآباد (دکن) کے قیام کے دوران نواب نثار یار جنگ بہادر کے یہاں مولانا دریا بادی کے رسالہ "سچ" کے سب پرانے شمارے محفوظ تھے، وہ سب کے سب ماہر صاحب نے پڑھ ڈالے۔ اس زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی حیدرآباد میں تھے۔ ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں ان کے معرکہ آرا مضامین چھپتے جن کو مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا عبدالماجد دریا بادی ایسے دانشورانِ اسلام سراہتے تھے مگر ——

"غالباً ۱۹۴۱ء میں یا ۱۹۴۲ء میں یہ تغیر بھی دیکھنے میں آیا کہ "صدق" میں (جو مولانا دریا بادی کا رسالہ تھا) مولانا عبدالماجد دریا بادی کے قلم سے مولانا مودودیؒ پر طنز و تعریض کی جانے لگی اور یہ سلسلہ رکنے نہیں پایا چلتا ہی رہا۔ راقم الحروف نے حیدرآباد دکن سے سات آٹھ صفحے کا خط مولانا دریا بادی کی خدمت میں ارسال کیا اور انھیں لکھا کہ مولانا مودودیؒ کی برسوں کی داد و ستائش کے بعد چند مہینے سے "صدق" میں ان پر جو تنقید و جرح فرما رہے ہیں اس کی لم سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر جو نوجوان مسلمان طلبہ مولانا مودودیؒ اور آپ دونوں سے متاثر ہیں اور آپ حضرات کو ایک ہی شجرِ طیبہ کے برگ و بار سمجھتے ہیں وہ آپ کی اس بدلی ہوئی روش سے سخت الجھن میں ہیں، ان کی یہ ذہنی الجھن اور آشفتہ خاطری ان کو دین کے بارے میں مذبذب بھی کر سکتی ہے —— ۳۶ برس پہلے کے خط کی نہ میرے پاس نقل ہے اور نہ اس کی پوری عبارت میرے ذہن میں محفوظ رہی ہے۔ بہر حال میں نے جو کچھ لکھا پوری دردمندی اور سوز و اخلاص کے ساتھ لکھا، مفصل اور مدلل لکھا۔ اس کا جواب مولانا دریا بادی مرحوم کی چند سطروں کا ایک کارڈ ملا جس میں لکھا تھا۔ "آپ کو تبلیغ کا اجر مل گیا مگر آپ کی رائے سے مجھے

اتفاق نہیں ہے۔" ان کی اس تحریر کا میں کیا جواب دیتا۔ انھوں نے تو پتنگ ہی ہتھول سے کاٹ دی۔"

" پاکستان بننے کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں جب "فاران" کا پہلا پرچہ منظر عام پر آیا تو مولانا دریابادی کی خدمت میں "فاران" بھیجا گیا۔ وہاں سے "صدق جدید" تبادلے میں آنے لگا۔ تقسیم ہند سے قبل مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی صاحبزادی کے عقدِ نکاح پر جو خطبہ دیا تھا، وہ اپنی جگہ ادب، انشاء اور اخلاق و عظمت کا شاہکار تھا۔ میں نے درخواست کی کہ اس خطبہ کی نقل عنایت فرمائی جائے۔ مولانا دریابادی نے ہاتھ کے ہاتھ اپنے اس خطبہ کی نقل روانہ فرما دی جسے "فاران" میں شائع کیا گیا۔"

" مولانا مودودی پر طنز و تنقید کا سلسلہ "صدق جدید" میں چلتا رہا۔ اس کے ساتھ پاکستان کی جماعت اسلامی بھی مولانا دریابادی کی طنز و تعریض میں آ جاتی۔ جماعت اسلامی ہند کی کبھی کبھار تعریف کرتے تو اس کے ساتھ مولانا مودودی اور پاکستان کی جماعت اسلامی کی دو چار چھینٹوں سے ضرور تواضع فرما دیتے۔ یہ صورت حال کوئی شک نہیں تکلیف دہ تھی مگر اس کو گوارا کیا گیا اور اس سلسلے میں ایک حرف بھی مولانا دریابادی کو نہیں لکھا۔ لیکن مولانا مرحوم نے ایک اور رُخ اختیار کیا، یعنی قادیانیوں کا مدح آمیز لفظوں میں تذکرہ "صدق جدید" میں آنے لگا۔ قادیانیوں کے کافرانہ عقائد سے وہ متفق نہیں تھے اور مرزا غلام احمد کی دعوتِ نبوت کو درست نہیں سمجھتے تھے، مگر ان کی دوڑ دھوپ اور تنظیمی صلاحیت اور طریق کار کے مداح تھے۔ ان کی تحریروں سے ایسا مترشح ہوتا تھا جیسے مرزا غلام احمد اور قادیانیت کی تکفیر کی تکرار انھیں کھٹکتی ہے۔ میں نے مولانا دریابادی کو دو خط لکھے اور ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی اس روش سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے ..... مولانا نے میرے خطوں کا جواب نہیں دیا..... ان کی اس روش سے تنگ آ کر راقم الحروف نے ایک طویل عریضہ مولانا دریابادی کی خدمت میں ارسال کیا جس میں لکھا کہ ..... نبوت کا

پورا انسٹی ٹیوشن قادیان اور ربوہ میں قائم ہے۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد کے اصل اقوال درج کرتے ہوئے لکھا کہ یہ دعویٰ صریح کفر نہیں تو اور کیا ہے ۔۔۔ میں نے آخر میں لکھا کہ اگر قادیانیت کے بارے میں آپ کا یہی اندازِ فکر رہا تو خدا نہ کرے مجھے آپ کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔۔۔۔
میرے عریضہ کے جواب میں مولانا دریا بادی کا عتاب نامہ آیا جس میں لکھا تھا کہ تمام تعلقات ختم، خط و کتابت موقوف، "فاران" بھیجنا بند کر دیجئے، "صدقِ جدید" بھی تبادلے میں نہیں جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ "فاران" پڑھنا نہیں چاہتے تو نہ پڑھیئے مگر "صدقِ جدید" تبادلہ میں نہیں آئے گا تو راقم الحروف اس کا چندہ بھیجا کر خریدار کی حیثیت سے "صدقِ جدید" کا مطالعہ کرے گا۔"

"اس قضیۂ نا مرضیہ سے قبل مولانا عبدالماجد دریا بادی نے "صدقِ جدید" میں کئی بار لکھا تھا کہ پاکستان میں مُلّا واحدی، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور ماہر القادری سے اردو روزمرہ کے مسائل میں رجوع کرنا چاہیے (مفہوم ترجمانی) مگر اس بدمزگی کے بعد انھوں نے میرا نام لکھنا ترک کر دیا۔ مُلّا واحدی اور خواجہ شفیع دہلوی کے نام لکھ کر "وغیرہ" فرما دیا کرتے، یعنی مولانا مرحوم راقم الحروف کو "خاصانِ اردو" میں سمجھتے تھے مگر اب میرا شمار "وغیرہ" میں ہونے لگا۔"

مولانا دریا بادی کے خویش حکیم عبدالقوی تبصرہ کے لیے مولانا دریا بادی کی کتابیں مولانا ماہر القادری کو بھیجنے لگے اور مولانا ماہر القادری نے اپنی تصنیف "کاروانِ حجاز" عبدالقوی صاحب کے ذریعہ مولانا دریا بادی کو تبصرے کے لیے بھیجی۔ اپنے اور مولانا دریا بادی کے تبصروں کے بارے میں مولانا ماہر القادری لکھتے ہیں:

"مولانا دریا بادی کی کتابیں "فاران" میں تبصرے کے لیے آتیں تو ان پر نقد و تبصرہ کی منصفانہ ذمہ داریوں کے ساتھ ریویو کیا جاتا۔ قضیہ کی ذرا سی بھی ناگواری مولانا مرحوم کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اثر انداز نہ ہونے پاتی، مگر میرے سفرنامہ "کاروانِ حجاز" پر "صدقِ جدید" میں مولانا

عبدالماجد دریا بادی کا تبصرہ اس سے مختلف تھا - ان کا دل مجھ سے مکدر تھا ...... مولانا کے ایک دو اعتراض تو صحیح تھے مگر ان کے دوسرے اعتراضات ان کے مزاج کی جھنجلاہٹ کے ترجمان تھے ۔"

" اس بات کو تقریباً چار برس ہوئے ہیں جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانحعمری "یادوں کی برات" پر فاران میں خاصہ طویل تبصرہ شائع ہوا - اس کے بعد میرے پاس لیبیا سے مولانا ریحان ندوی کا خط آیا کہ میں دریا باد گیا تھا - مولانا عبدالماجد سے آپ کے تبصرہ کا ذکر آیا - وہ اس تبصرہ کو پڑھنا چاہتے ہیں ۔ "فاران" کا وہ شمارہ مولانا دریا بادی مرحوم کو جب ملا تو انھوں نے اپنے کسی عزیز کو کویت خط لکھا - ایک صاحب اس خط کی نقل لے کر میرے پاس آئے جس میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ مدیر "فاران" کو جانتے ہو، یہ وہی ماہرالقادری ہیں جو اپنے کرم فرما تھے مگر ایک مضمون انھوں نے ایسا لکھ دیا تھا جس کی وجہ سے ان سے تعلقات ختم ہو گئے، مگر اب برسوں کے بعد "یادوں کی برات" پر ان کا ایسا تبصرہ آیا ہے کہ جس سے ان کے سات خون معاف ہو جاتے ہیں ، بارک اللہ جزاک اللہ، پھر مولانا دریا بادی نے "صدق جدید" میں مسلسل ڈھائی مہینے تک راقم الحروف کے اس تبصرہ کو شائع فرمایا اور اس کے شروع میں ایک تعریف آمیز نوٹ تحریر کیا جس میں لکھا کہ یہ ایک ایسا سنجیدہ اور متوازن تبصرہ ہے جس پر کسی نقد و اضافہ کی ضرورت نہیں ۔"

" انھوں نے اس زمانہ میں بی اے پاس کیا جب ناموں کے ساتھ بی۔اے لکھا جانا باعث فخر ومباہات تھا...... مولانا نے فلسفہ پر کئی کتابیں لکھیں جس کی بنا پر عبدالماجد دریا بادی "فلسفی" کے نام سے شہرت ہوئی۔ فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف نے ان کو مذہب سے بیگانہ کر دیا۔ ان کی دہریت کے زمانہ کی تحریروں میں مذہب پر طنز و تعریض ملتی ہے پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دہریت کی دھند چھٹنی شروع ہوئی ، مذہب سے جو بیگانگی اور وحشت تھی اس میں ٹھہراؤ پیدا ہوا ، دہریت میں کمی آئی اللہ

اور رسول کے ذکر و فکر سے اُن کے دل کو سکون ملنے لگا۔ خلافت کی تحریک نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ پکے مسلمان بن گئے۔“

”مولانا عبدالماجد دریا بادی اردو زبان اور ادب کے گنے چنے بلند پایہ اہلِ قلم میں ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے تھے۔ طنز نگاری کے بادشاہ، زبانِ روزمرہ کے مستند و معتبر استاد ...... راقم الحروف اس حقیقت کے اعتراف میں جھجک نہیں بلکہ فخر محسوس کرتا ہے کہ مولانا دریا بادی کی تحریروں اور کتابوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔“

”تقسیمِ ہند کے بعد مرحوم نے ہندو راج پر نقد و تبصرہ کا مجاہدانہ فرض انجام دیا، اس وقت جب بھارت کے چار کھونٹ جن سنگھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور مسلمانوں پر آشوبِ قیامت طاری تھا مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان مظالم کی پیرایہ اور عنوان بدل بدل کر نشان دہی کی۔ یہ سب کچھ ان کے قوتِ ایمان کا کرشمہ تھا۔“

”حکومتِ پاکستان نے قادیانیوں کی تکفیر کا جو منصفانہ فیصلہ کیا جس کی تمام دنیا کے مسلمانوں نے توصیف و ستائش کی جیسے ان کی دل کی تمنا بر آئی — مگر اس کا شدید افسوس ہے کہ مولانا دریا بادی نے اس فیصلے پر اپنے قلم سے چھینٹیں اڑائیں۔ ان کی اس روش کو مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے پسند نہیں کیا۔“

”تفسیرِ ماجدی، مولانا عبدالماجد دریا بادی کا عظیم دینی کارنامہ ہے ...... ڈھائی برس ہوئے ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے نڈھال کر دیا۔ علالت کے زمانہ میں بھی نماز باجماعت ادا کرتے۔ علاج معالجہ سے افاقہ ہو گیا مگر یہ افاقہ افاقۂ موت ثابت ہوا۔ عمر کی تیراسی منزلیں طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر متنفس اور جاندار کے لیے مقدر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں ان کی رحلت کی خبر خاموش کہرام بن کر سنی گئی ...... اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔“

ماہر صاحب مرحوم نے مولانا عبدالماجد مرحوم کے حالات کا جائزہ بھی" فاران" کے آٹھ صفحوں میں لیا ہے۔ میں نے جو اقتباسات درج کیے ہیں ایک تہائی سے بھی کم ہوں گے۔ کوشش کی ہے کہ مولانا دریا بادی کی شخصیت ان اقتباسات سے واضح ہو جائے۔ پوری طرح مستفید ہونے کے لیے پورا جائزہ جو اس کتاب میں شامل ہے پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔[لہ] ان دو جائزوں کے اقتباسات پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو بیش لفظ پڑھ کر ہی اندازہ ہو جائے کہ اور تعزیتی مضامین کس نہج کے ہوں گے۔ اُمید ہے کہ قارئین اس کتاب کو دلچسپ پائیں گے اور اس کے توسط سے بہت سی ممتاز شخصیتوں کے حالات سے آگاہی حاصل کریں گے۔

اس کتاب کے شائع کرنے کے لیے جناب طالب ہاشمی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے محض اُن دیرینہ تعلقات کی بنا پر جو مولانا ماہر القادری مرحوم سے تھے یہ قدم اٹھایا ہے تاکہ مرحوم کی ادبی کاوشوں کو جو نہایت گرانقدر ہیں، پیش کر کے ان کا نام زندہ رکھیں۔ توقع ہے کہ وہ مولانا کے عالمانہ تبصروں کو بھی جو کتابوں پر" ہماری نظر میں" کے عنوان سے لکھے جاتے تھے کتابی شکل میں پیش کرنے پر توجہ فرمائیں گے۔ مولانا نے تین ہزار سے زیادہ کتابوں پر تبصرے کیے ہیں، اگر ان میں سے تین سو بھی شائع ہو جائیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ یہ تبصرے اس لیے بہت اہم ہیں کہ منجملہ اوروں کے کچھ نہایت مشہور و معروف شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کا بھی ان میں جائزہ لیا گیا ہے ——

جبیب احمد صدیقی

اسلام آباد —— ۱۲/ اپریل ۱۹۸۲ء

لہ مولانا عبدالماجد دریا بادی پر مولانا ماہر القادری کے تاثرات اس کتاب کی دوسری جلد میں شامل ہیں۔ (مرتب)

درسِ عبرت

از ـــ ماہر القادری

جن مسلم[1] مشاہیر اور بزرگوں کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ انسان تھے فرشتہ نہ تھے اُن کی زندگیوں میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ مرنے والوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کرو، ہم اللہ تعالیٰ سے ان سب کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اللہ پاک اُن سب کی قبروں کو ٹھنڈی رکھے اور قیامت کے دن رسولؐ اللہ کی شفاعت اور خدا کی رحمت و مغفرت انھیں نصیب ہو۔

اس دنیا میں جو آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن جانا ضرور ہے، موت برحق ہے اور اس عالمِ آب و گل سے جدائی یقینی ہے، موت ٹل نہیں سکتی، ملک الموت آہنی قلعوں میں بھی دبے پاؤں پہنچ جاتا ہے، جو یہاں سے جا چکے ہیں، ہم بھی اُن کے پیچھے آرہے ہیں، جانا بہرحال ناگزیر ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے۔

شہرتیں، عزتیں، ناموریاں، عہدے، خطابات، مال و دولت سب کے سب یہاں دنیا ہی میں رہ جاتے ہیں ان میں سے ایک چیز بھی ساتھ نہیں جاتی، کام آنے والی چیز صرف "صالح اعمال" ہیں، مرنے کے بعد کسی شخص کے قدم قدم پر مجسّمے نصب ہو جائیں پھر بھی یہ شہرت اور ہر دلعزیزی اُسے بخشوا نہیں سکتی۔

غافل انسان جاہ و شہرت اور عیش و دولت کی پرچھائیوں کے پیچھے بھاگا بھاگا پھرتا ہے، اوّل تو یہ پرچھائیاں ہاتھ ہی کم آتی ہیں اور ہاتھ آ بھی جائیں تو پرچھائیوں کا اعتبار کیا؟ ادھر شام ہوئی اور پرچھائیاں یہ جا وہ جا! یہ دنیا تو سچ مچ سرائے فانی

---

[1] یہاں مولانا ماہر القادریؒ کے اصل الفاظ یہ تھے "جن مشاہیر اور بزرگوں کا ذکر اوپر کیا ہے"۔ ـــ فی الحقیقت "درسِ عبرت" فاران کے اپریل ۱۹۷۸ء کے شمارے میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت چھپنے والے مضمون (تأثرات) کا تتمہ تھا۔ میں نے اس کتاب کی مناسبت سے مولانا کے الفاظ کو تبدیل کر دیا ہے، اس تصرف کے لیے مولاناؒ کی روح سے معذرت خواہ ہوں۔ (طالب ہاشمی)

ہے۔ سچے موتی جن کے یے یاقوت کی کھرل میں پیسے جاتے تھے، وہ زمین کے نیچے خاک سیاہ تک رہے ہیں، جامِ جمشید کو بھی زمانہ نے توڑ ڈالا، سکندر کا تخت بھی مٹی میں مل گیا، گنج شایگاں کے بھی انقلاب نے دھوئیں اڑا دیئے، موت نے "طرفِ کلاہِ کئے" کو ہی نہیں "چینِ قبائے قیصر" کو بھی مٹا دیا ——— جب دنیا کی ہر حقیقت "شعلۂ مستعجل" ہو تو پھر آدمی کس بات پر فخر اور اعتماد کرے۔

اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے کہ وہیں سدا رہنا ہے، بدبخت اور احمق ہے وہ جس نے اس دنیا کے لیے اپنی آخرت برباد کر دی۔ ہر موت اہلِ بینش کے لیے درسِ عبرت ہے جنازے اور قبریں دیکھ کر اور موت کی خبریں پڑھ کر خود اپنی موت یاد آنی چاہیئے کہ ہم پر بھی یہ عالم گزرنے والا ہے، زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، کیا خبر کہ سانس اندر جاکر واپس آئے یا نہ آئے، ہم نے بات کرتے اور بیٹھے بیٹھے لوگوں کا دم نکلتے دیکھا ہے۔ موت کا فرشتہ آواز دے کر نہیں آتا اس لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے کہ نہ جانے کس وقت قاصدِ اجل آ پہنچے۔

وہ کہ جن کی ذات عالمین کے لیے باعثِ رحمت تھی اور جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا تھا دن میں ستر بار موت کو یاد کیا کرتے تھے اور اُن کے عاشقِ زار غلاموں اور جاں نثار امتیوں کا یہ عالم ہے کہ موت کا بھولے سے بھی خیال نہیں آتا، ہر شخص نشۂ غفلت میں سرشار ہے، سب ہوا و ہوس میں مبتلا ہیں، کوٹ پتلون ہی نہیں جبہ و دستار پر بھی "دنیا" چھائی ہوئی ہے اور دنیا سے ہماری مراد وہ ہوا و ہوس ہے جو آخرت سے غافل بنا دیتی ہے۔

ایک صحابی کی قبر کھودی جا رہی تھی، جنازہ میدان میں رکھا تھا، حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے گردن جھکا کر، مٹی کریدتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"لوگو! اس دن کے لیے کچھ کر رکھو، لوگو! اس دن کے لیے کچھ کر رکھو۔۔۔!"

آؤ ہم اس دن کے واسطے "کچھ کر رکھنے" کے لیے آج ہی سے تیاری شروع کر دیں ——— !

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ !

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

(غالبؔ)

حضرت آرزو لکھنوی

میرا ادبی ذوق ابھی "مراہقت" کے عالم ہی میں تھا کہ آرزو لکھنوی مرحوم کے نام اور کلام سے میں آشنا ہو چکا تھا، مگر یہ تعارف اور شناسائی ادھوری سی تھی، لکھنؤ سے اُن دنوں "سخن سنج" نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا جس میں صرف غزلیں چھپتی تھیں، اُسی رسالہ کی بدولت حضرت آرزو کی چند غزلیں نظر سے گزریں ــــ یہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، اُن دنوں لکھنؤ کے تمام شاعروں میں سب سے زیادہ شہرت اور قبولِ عام عزیز لکھنوی کو حاصل تھا اور اُن کے مجموعۂ کلام ــ "گل کدہ" کا بہت چرچا تھا۔

حیدر آباد دکن میں جناب حیرت بدایونی نے ایک دن یہ شعر سنایا:

قاتلِ جہاں معشوق جو تھے، مرقد ہیں پڑے اُن کے سونے
یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

اس شعر کو سن کر طبیعت پھڑک اٹھی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آرزو لکھنوی کا یہ شعر ہے، اور اُس کے بعد سے مرحوم کا کلام جس رسالہ میں بھی نظر آجاتا، شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ــــ کلکتہ سے ایک فلمی رسالہ "عکاس" نکلتا تھا آرٹ پیپر پر، پوری رعنائیوں اور ظاہری دلچسپیوں کے ساتھ! اُس میں حضرت آرزو کا کلام اکثر و بیشتر چھپتا تھا، اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حضرت آرزو اس رسالہ کے نگران اور سرپرست تھے۔

مشاہیر شعراء سے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن جناب آرزو لکھنوی سے ملنے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی، وہ فلم انڈسٹری سے تعلق پیدا ہونے کے سبب گوشہ گیر سے ہو گئے ــــ اور یہ بھی تھا کہ مشاعروں میں عام طور پر "گلے باز" شاعروں کو بُلایا جاتا تھا، میں "ترنم" سے شعر پڑھنا نہ جانتا تو شاید خود میری پوچھ بھی

نہ ہوتی ـــــ

ہندوستان پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جبکہ بعض نیک نہاد اور امن پسند افراد کسی نہ کسی تقریب سے اتحاد اور یگانگت کا اظہار چاہتے تھے اور اس کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موقع نکالتے تھے، ۱۹۴۱ء میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں نے مل جل کر بمبئی میں "یوم اکبر اعظم" منایا، اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، جناب ضیاء الدین برنی اس مشاعرے کے منتظم تھے، میں حیدرآباد دکن سے چل کر بمبئی آچکا تھا مگر اس طرح کہ کسی نے نہ جانا، اس مشاعرے میں پہلی بار میں نے بمبئی میں اپنا کلام سنایا اور پھر دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بمبئی کے دوران قیام میں ایک ایکٹرس نے اپنے یہاں شب کے کھانے کی دعوت دی اور خاص طور پر کہا گیا کہ حضرت آرزو لکھنوی جو اُسی فلیٹ میں رہتے ہیں اس دعوت میں شرکت فرما رہے ہیں، میرے لیے اس دعوت میں سب سے بڑی کشش یہی تھی کہ اس بہانہ آرزو مرحوم سے ملاقات ہو جائے گی ـــــ اُسی پرتکلف دعوت میں سب سے پہلی بار آرزو مرحوم سے نیاز حاصل ہوا، بڑی گرمجوشی اور تپاک کے ساتھ ملے جیسے وہ مجھے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔

اس دعوت میں جناب جوش ملیح آبادی بھی تھے، کھانے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور ایک شاعر جن پر شراب کا نشہ سوار تھا، اُن سے اور مجھ سے باتوں باتوں میں شدید بدمزگی کی نوبت آگئی، سارا لطف ہی مکدر ہو گیا ـــــ یہ رنگ دیکھ کر لوگوں نے یہ کیا کہ حضرت آرزو، جوش صاحب اور مجھ کو اشارے سے اٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے اور اُن شاعر صاحب سے کہہ دیا کہ وہ تینوں صاحبان تو چلے گئے۔ اس بدمزگی کے بعد محفل کا ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا گیا، مطلب اُن "شاعر صاحب" کا وہاں سے دفع کرنا تھا، وہ چلے گئے تو پھر نئے سرے سے محفل جمی اور حضرت آرزو لکھنوی کی زبان سے زندگی میں پہلی بار اُن کا کلام سُنا، کیا سنجیدگی اور متانت تھی، کیا وقار تھا، داد تحسین پر اُلٹے شرما شرما سے جاتے!

اس کے بعد میرا بمبئی برابر آنا جانا ہوتا رہا، کئی کئی مہینہ وہاں میں نے قیام بھی کیا اور حضرت آرزو سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہے اور موقعہ میسر نہ آتا تو میں خود

اُن کے یہاں جاتا اور اُن کی صحبت سے مستفید ہوتا، کسی نئے آدمی سے آرزو مرحوم میرا تعارف کراتے، یا یونہی میرا ذکر کرتے تو یہ جملہ ضرور کہتے "ان (میری طرف اشارہ کر کے) کے کلام کی صحت کا میں قائل ہوں، اور اس زمانہ میں یہ بہت بڑی چیز ہے......!"

جے، جے ہسپتال (بمبئی) کے قریب جو چوراہہ ہے اُسی کے پاس ایک حکیم صاحب کے مطب میں حضرتِ آرزو شام کے وقت اکثر آکر بیٹھا کرتے تھے اور وہاں اُن سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ بمبئی کے بعد پھر ملاقات "ڈان" کے مشاعرے میں ہوئی، اور ملاقات کیا ہوئی، دور ہی دور سے علیک سلیک ہو کر رہ گئی، اسٹیج پر بہت مجمع تھا، کسی سے ملنے کے لیے بیسیوں سروں کو پھلانگ کر گزرنا ہوتا تھا، مشاعرے کے بعد میں آرزو مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، طعامستان (الٰہی بخش کالونی کا ایک ہوٹل) میں قیام تھا، بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! پاکستان ہی میں رہ جائیے"۔ فرمایا میں یہاں رہنا چاہتا ہوں مگر ایک بار بمبئی جانا بھی ضروری ہے، وہاں میری گولڈن جوبلی منائی جارہی ہے اس میں مجھے شرکت کرنا ہوگی ـــــ اور وہ پھر اسی "ارضِ پاک" کا پیوند ہو کر رہ گئے، سنِ طبعی عمر سے کافی متجاوز ہو چکا تھا مگر ہزار برس کی عمر کے بعد بھی مرنا کوئی نہیں چاہتا، آخری سانس تک دنیا کی اُمیدیں آدمی کو الجھائے رکھتی ہیں۔

یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں کہ دنیا ہیچ ہے
مرتے دم تک آدمی بے آسرا ہوتا نہیں

پچھلے جاڑوں میں لائل پور کاٹن ملز کی طرف سے سالانہ مشاعرہ ہوا تھا، فیض صاحب جھنجانوی اس کے منتظم تھے، انہوں نے مجھے لکھا کہ حضرتِ آرزو لکھنوی کو جیسے بنے مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے راضی کرو، میں مرحوم سے جا کر ملا، کہنے لگے اس بڑھاپے میں اتنا طویل سفر کیسے کروں گا...... پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا کہ آپ مشاعرے والوں کو میرا پتہ لکھ دیجئے، وہ براہِ راست مجھ سے خط و کتابت کریں گے۔ پھر میں جانوں اور وہ جانیں ـــ! ـــ حضرتِ آرزو کے ساتھ آخری مشاعرہ خیرپور میں پڑھا۔

سن اسّی سال سے متجاوز تھا، بلڈ پریشر کے مریض تھے، ذرا ذرا دیر کے وقفہ سے طبیعت بگڑتی رہتی، خوراک بہت ہی کم رہ گئی تھی، چہرے پر شدید اضمحلال کے آثار پائے جاتے تھے مگر دماغ کی صحت کا وہی عالم تھا علمی اور ادبی مسائل پر بڑی ذمہ داری کے ساتھ اظہارِ رائے فرماتے!

مجاز صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ مرنے سے چند دن پہلے میں اُن سے ملنے کے لیے گیا میرے ہاتھ میں "فاران" دیکھ کر لے لیا اور "نقشِ اوّل" پڑھنے میں منہمک ہو گئے، مضمون پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا...... "ماہر...... تک میرا یہ پیام پہنچا دو کہ میں اُن کی رائے سے حرف بہ حرف متفق ہوں......"

مالی حالات ساز گار ہوتے تو میرا یقین ہے کہ حضرتِ آرزو فلم انڈسٹری سے تعلق پیدا نہ کرتے، اُن کے منصب سے یہ فروتر چیز تھی مگر یہ "احتیاج" بُری بلا ہے "شیروں" کو "روباہی" کرتے دیکھا گیا، اردو زبان کی سب سے پہلی بولتی تصویر "عالم آرا" تھی اُس کے بعد اور چند تصویریں منظرِ عام پر آئیں مگر وہ سب گھٹیا قسم کی تھیں۔ ہندوستان کی فلمی دُنیا میں سب سے پہلی ترقی یافتہ تصویر "پورن بھگت" تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرتِ آرزو لکھنوی انھی دنوں میں کلکتہ چلے گئے اور فلمی دُنیا سے وابستہ ہو گئے —— یہ ابتدائی دَور تھا فلمی کہانی اور گانے لکھنے والوں کی آج کی برابر قدر نہ تھی۔ بہت ہی کم معاوضہ پر کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھوائے جاتے تھے —— پھر جب وہ کلکتہ سے بمبئی آئے تو "دھوک" جیسے "فلمی گیتوں" کی شہرت کا ستارہ چمک رہا تھا اور "یہ راگ ہیں دردیلے" اور "آنکھوں میں دل اُتر گیا" جیسے بولوں پر لوگ جھومتے تھے، یہی اسباب تھے کہ حضرتِ آرزو لکھنوی فلمی دُنیا سے وابستہ ہونے کے باوجود خاطر خواہ مالی منفعت حاصل نہ کر سکے ورنہ اتنے زمانہ تک فلمی انڈسٹری سے جس شاعر کا تعلق رہے اُس کے پاس لاکھوں روپیہ ہونے چاہیئے تھے —— فلم انڈسٹری میں جا کر آرزو نے کھویا زیادہ اور پایا کم۔

حضرتِ آرزو مسلّم الثبوت استاد جلال لکھنوی کے صحیح جانشین تھے، فنِ عروض میں اُن کی ٹکر کے ہندوستان اور پاکستان میں دو چار ہی شاعر ہوں گے۔ لکھنؤ کے مکتبِ شاعری کے وہ صحیح نمائندے تھے اردو شاعری کو انھوں نے سلاست دی، سادگی بخشی اور گیسوئے اردو جو منت پذیرِ شانہ تھا اُسے سلجھایا اور سنوارا، اردو زبان میں شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر آرزو ان شاعروں میں سے تھے جن کا کلام سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ فنِ موسیقی میں بھی اُن کو درک تھا اور اس کی جھلک اُن کے شعروں میں پائی جاتی ہے!

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۵۱ء)

سیّد آلِ رضا

اہلِ قلم اور شاعروں کا غائبانہ تعارف ادبی رسالوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ میں ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد دکن پہنچا۔ اُس وقت تک کسی معروف رسالہ میں سید آلِ رضا کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا، اس لیے میں ان کے نام تک سے ناواقف رہا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں کوئی صاحب یو۔پی سے حیدرآباد دکن آئے تھے، انہوں نے ایک کتابچہ مجھے دیا جس میں سیّد آلِ رضا کا کلام درج تھا۔ سیّد صاحب کا یہ شعر:

میرا سینہ تان کر منت سے کہنا ایک اور — اُن کا خالی ہاتھ دکھلانا کہ پیکاں ہوگئے

مجھے پڑھتے ہی یاد ہوگیا، یہ شعر اوسط درجہ کا ہے مگر اس میں حسن و عشق کے معاملات کا جو لطف پایا جاتا ہے اس لطف کو چوٹ کھایا ہوا دل ہی محسوس کرسکتا ہے۔ اس شعر نے مجھے اس لیے بھی چونکا دیا کہ حیدرآباد دکن میں کسی چیز کے ختم ہونے اور نبٹر جانے کو "ہوگیا" بولتے ہیں ——— "کھانا ہوگیا" (یعنی چاول ختم ہوگئے۔ حیدرآباد دکن میں چاولوں کو "کھانا" کہتے ہیں) ——— سید آلِ رضا کا یہ شعر پڑھ کر پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ لکھنؤ میں بھی کسی چیز کے ختم ہوجانے کے لیے "ہوگیا" بولنے کا رواج ہے یو۔پی کے اضلاع میں "ہوگیا" ان معنوں میں نہیں بولا جاتا، میں نے بعض دکنی احباب سے کہا کہ مبارک ہو! لکھنؤ کے ایک شاعر نے "ہوگیا" انہی معنی میں استعمال کیا ہے جن معنی[1] میں اہلِ دکن بولتے ہیں۔

سید آلِ رضا کے اس مختصر سے مجموعہ کلام کے بعد بھی اُن کی غزلیں رسالوں میں پڑھنے کو نہیں ملیں۔ جب میں ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد دکن سے وطن گیا تو وہاں میرے گاؤں کے بعض دوستوں نے کہا کہ اصغرآباد کی ستائیسوں پر سید آلِ رضا کے مرثیے سنے

---

[1] اب سے سو برس پہلے راجہ باقر علی خاں بنڈراول ضلع بلند شہر کے بہت بڑے رئیس تھے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور سامعین نے خوب داد دی، یہ سید آلِ رضا سے دوسرا غائبانہ تعارف تھا۔

غالباً ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو سے ایک طرحی مشاعرہ نشر ہوا تھا، اس میں سید آلِ رضا کی غزل خوب چمکی۔ ریڈیو سننے والوں نے آلِ رضا مرحوم کا یہ شعر جس کا دوسرا مصرع ہے : ؎ ایسی گئی کہ مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

راقم الحروف کو سنایا، یہ ان سے تیسرا غائبانہ تعارف تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ نواب محمود علی خاں (نواب سر احمد خاں کے دادا) رئیس چھتاری کے علاوہ ضلع بلند شہر میں کوئی دوسرا رئیس ان کی ٹکر کا نہ تھا! راجہ باقر علی خاں یو۔ پی کے زمیندار تھے اور پنجاب کے کوٹلہ کے جاگیردار! اس جاگیر کی نسبت سے انہیں وائسرائے کے دربار میں کرسی ملتی تھی، راجہ باقر علی خاں مذہباً شیعہ تھے مگر ملنسار طبیعت پائی تھی، سُنیوں سے اُن کے خوشگوار تعلقات تھے، اُن کے یہاں مجالسِ عزا میں میر انیس اور غالباً مرزا دبیر نے بھی لکھنؤ سے پنڈراول تشریف لاکر مرثیہ خوانی کی ہے۔ راجہ باقر علی خاں کے مرنے کے بعد اُن کی جائیداد اُن کے بیٹوں۔ جعفر علی خاں اور اصغر علی خاں ـــــ میں تقسیم ہوگئی۔

جعفر علی خاں ضرورت سے زیادہ کشادہ دست اور شاہ خرچ تھے۔ آمدنی کم خرچ زیادہ ۔ ساہوکاروں سے قرض دام لینے کی نوبت آگئی اور سود در سود کے چکر نے اُن کو معاشی طور پر بدحال کر دیا، پھر ان کی زمینداری کورٹ ہوگئی۔ گورنمنٹ نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، راجہ جعفر علی خاں کو ماہانہ گزارہ ملتا تھا، اُن کے مرنے کے بعد اُن کے اکلوتے بیٹے راجہ اکبر علی خاں نے بڑی خوش سلیقگی کا ثبوت دیا، اپنی ریاست کو کورٹ سے چھڑا لیا اور ایک خوش حال رئیس اور زمیندار کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے! نواب میر عثمان علی خاں فرمانروائے دکن نے اُن کو دعوت دے کر حیدرآباد بلایا اور وہ کئی دن سرکاری مہمان رہے ـــــ

راجہ باقر علی خاں کے دوسرے بیٹے راجہ اصغر علی خاں نے اپنے حصہ کی زمینداری کو نہ صرف یہ کہ بحال رکھا بلکہ اُسے ترقی دی، ضلع علی گڑھ کے قصبہ اترولی سے چار میل کے فاصلہ پر اصغرآباد نام کی بستی آباد کی جہاں اُن کی شاندار کوٹھی تھی۔ جس کا میل سوا میل کا رقبہ تھا۔ اصغرآباد کے اردگرد آم کے بڑے بڑے باغ تھے راجہ اصغر علی خاں اترولی میونسپلٹی کے برسوں چیئرمین رہے، دو گھوڑوں کی بگھی میں اُن کی سواری نکلتی۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سید آلِ رضا سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد ہوئی، مشہور نقاد و ادیب وقار عظیم (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) مجلہ "ماہِ نو" کے ایڈیٹر تھے اور سینیپیر مارکس کے سرکاری بنگلہ میں رہتے تھے، انہوں نے ۱۹۴۹ء میں اپنے یہاں کراچی کے چند منتخب شعراء کو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ـــــ اصغر آباد میں ہر سال ماہ صفر کے آخری ہفتہ میں تین دن مجالس عزا برپا ہوتیں اس تقریب کا نام "ستائیسویں" پڑ گیا تھا۔ دلی، لکھنؤ، بلند شہر، علی گڑھ وغیرہ مقامات اور اضلاع کے علاوہ مرشد آباد، کلکتہ اور پٹنہ تک سے لوگ مجلسیں سننے کے لیے آتے، جن میں غالب تعداد شیعہ حضرات کی ہوتی۔ مگر سینکڑوں سُنّی بھی شیعوں کے دوش بدوش شریک ہوتے مہمانداری میں شیعہ سُنّی کا کوئی امتیاز نظر نہ آیا میری عمر بہت سے بہت پندرہ سولہ برس کی تھی میں ستائیسویں میں شرکت کے لیے ایک کارڈ لکھ دیتا کہ ہمارے گاؤں (کسیر کلاں) سے اتنے آدمی آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اصغر آباد پہنچتے ہی آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ فلاں نمبر کے خیمہ میں ہمارا قیام ہوگا۔ تین دن کئی ہزار آدمیوں کی مہمانداری، ہر شخص کے لیے چارپائی کا انتظام، خوش ذائقہ قورمہ اور نان! میٹھے میں موتیا، ہر چیز خالص پان، چھالیہ، کتھا، الائچی اور تمباکو چٹھی کے ذریعہ ملتا۔

اصغر آباد کی ستائیسویں میں راقم الحروف نے مولانا سید سبط حسن جائسی کی تقریریں سنیں جن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے مقررین میں ہوتا تھا انہوں نے "اتنی" کا "اتنی" تلفظ کیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ہمارے گاؤں کے لوگ "اتنی اور اتنا" تلفظ کرتے تھے۔ حکیم مرتضیٰ حسن الہ آبادی کی "توحید" کے موضوع پر معرکہ آرا تقریر سُنی۔ مولانا آقا حسن اور مولانا نجم الحسن کو بھی اصغر آباد ہی میں دیکھا، اُس دور کے سب سے بڑے سوز خواں منجو صاحب کو سُنا، منجو صاحب راگ راگنی سے بھی خوب واقف تھے۔ آواز پاٹ دار تھی۔ اُن کی سوز خوانی کا ٹھاٹ سب سے منفرد تھا۔ افسوس ہے نام یاد نہیں آ رہا ہے ایک اور سوز خواں کو بھی سُنا جو منجو صاحب سے بھی سینئر تھے مگر کوکین نے اُن کی آواز کو متاثر کر دیا تھا۔ (غالباً سجاد نام تھا) مرشد آباد کے سوز خواں بھی ایک دو بار آئے، یہ سوز خواں کیا تھے، اچھے خاصے پہلوان تھے، آواز کی وہ گھن گرج جیسے طبل جنگ بج رہا ہے۔ عیوض نام کا ایک نوجوان بھی خاصہ مقبول سوز خواں تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میر انیس کے پوتے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بُلایا، پُرتکلف عصرانہ، سامعین تعلیم یافتہ اور اہلِ ذوق! یہ نشست ہر اعتبار سے کامیاب رہی، اسی محفل میں سید آل رضا مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اُن کی زبان سے اُن کا کلام سُنا، سامعین کی فرمائش پر انہوں نے تین چار غزلیں سنائیں اور مجمع پر چھا گئے۔ اُن کی یہ غزل :——— کہتے ہیں لوگ آپ سے مجھ کو ہے اک لگاؤ

یہ واقعہ بھی خوب ہے تہمت بھی خوب ہے

حاصلِ مشاعرہ تھی۔ پھر اُن سے کراچی کی محفلوں، دعوتوں اور مشاعروں میں ملاقاتیں ہونے لگیں، خود اُن کے یہاں بھی کئی بار شاعروں کے جمگھٹے رہے۔ طرحی غزل میں اُن کی زبان سے برسوں پہلے کا سُنا ہوا یہ شعر اب تک یاد ہے۔

کشت بے آب نے دیکھے ہیں وہ کلے بادل

جو کہیں اور برسنے کو ادھر سے گزرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) - دولہا صاحب عروج کو سُنا۔ مرثیہ خوانی اور اُس کی ادائیگی بس اُن پر ختم تھی۔ اپنے دادا میر انیس کی عین مین یادگار تھے۔ دولہا صاحب جب لکھنؤ میں مجالس پڑھتے تھے تو علامہ شبلی نعمانی ندوہ کے مدرسہ میں چھٹی کرا دیتے تاکہ طلبا دولہا صاحب کی مرثیہ خوانی سن سکیں۔ میں دولہا صاحب کے لب و لہجہ کو بڑی توجہ سے سنتا۔ یہ کہ انہوں نے "سنبھل" کہا یا "سنبھل"۔ منبر پر بیٹھ کر وہ تلوار کے ہاتھ بھی دکھاتے اور گھوڑے کو مہمیز بھی کرتے۔ باؤ صاحب فائق بھی نامور مرثیہ گو تھے مگر دولہا صاحب کی اور ہی بات تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ خاندان دبیر کے شعرا جناب مؤدب اور مہذب بھی ایک بار تشریف لائے تھے۔ ان مرثیہ خوانوں میں نوک جھونک بھی رہی۔

اصغر آباد کی ستائیسوں کی مجالس میرے ذوقِ شعر و سخن کے لیے تربیت گاہ تھیں شیعہ علماء کے علمِ کلام اور ان کے طرز استدلال سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہوئی ——— یہ کہ قرانی آیات سے اہلِ بیت کی مدح و منقبت کے لیے وہ کیا نکتے پیدا کرتے ہیں اور وہ دوسروں پر کس لطافت کے ساتھ چوٹ کر جاتے ہیں۔

دولہا صاحب عروج اور باؤ صاحب فائق کے بعد سید آل رضا کی ان عظیم الشان مجالس میں مرثیہ خوانی بہت بڑا اعزاز تھا۔ ان مجالس میں غالب تعداد لکھے پڑھے لوگوں کی ہوتی اور یہاں اونچے درجہ کا شاعر اور بلند پایہ واعظ و مقرر ہی لب کشائی کر سکتا تھا۔

اب سے دس گیارہ برس پہلے سید آل رضا مرحوم کے ساتھ مشرقی پاکستان کا سفر کیا، ڈھاکہ میں جناب حبیب انصاری کی نوتعمیر شاندار کوٹھی میں تمام شعراء کا قیام رہا، ڈھاکہ کے بعد چٹا گانگ کے مشاعرے میں شرکت کی۔ دونوں مشاعروں میں ان کے کلام کی پذیرائی ہوئی، تیسرا مشاعرہ کھلنا میں ہوا مگر سید صاحب اس مشاعرے میں نہ جا سکے۔ اُن کی صحت سفر کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ ایک دن انہوں نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ میرے بھائی سید ہاشم رضا جب مشرقی پاکستان کے گورنر تھے تو اُن کے بلانے پر میں یہاں نہیں آیا، اس سال مشرقی پاکستان میں آنا مقدر ہو چکا تھا۔

سید آل رضا کو اپنے چھوٹے بھائی سید مسعود رضا اور اپنے جواں بخت و جواں سال فرزند سید قمر رضا کی موت کے پے در پے صدمے سہنا پڑے، اُن کا صبر و تحمل خانوادہ سادات کا صبر و تحمل تھا مگر پھر بھی وہ بجھے بجھے نظر آتے تھے۔

سید آل رضا کا اصل وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا، اس قصبہ میں قاضی ضیا رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے جو قادری سلسلہ تصوف کے شیخ تھے۔ سید صاحب کے والد اودھ چیف کورٹ میں جج رہ چکے تھے۔ انہوں نے معزز خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے میں تربیت پائی، ایل ایل بی کے بعد لکھنؤ میں وکالت کرنے لگے اور پاکستان میں بھی یہی پیشہ اختیار کیا، کئی برس ماتحت عدالتوں (اور غالباً سشن جج) میں وکیل سرکار بھی رہے۔ حضرت فانی بدایونی نے بھی وکیل کی حیثیت سے شہرت نہیں پائی۔ یہی صورت آل رضا کے ساتھ پیش آئی۔ خرچ اخراجات کے معاملے میں وہ محتاط تھے۔ پاکستان بننے کے بعد شروع کے زمانے میں راقم الحروف نے انہیں بس کے انتظار میں مسافروں کی قطار میں کھڑا ہوا دیکھا ہے۔

ایک زمانے میں سید آل رضا کراچی میں ایڈووکیٹ تھے، اُن کے بھائی کاظم رضا انسپکٹر جنرل پولیس اور سید ہاشم رضا پاکستان کے دارالسلطنت کراچی کے ایڈمنسٹریٹر، یہ بخت و اتفاق کی بات تھی۔ مشہور مزاح نگار شاعر مجید لاہوری اس اقبال مند خاندان پہ کبھی کبھی شعروں میں لطیف سی طنز بھی کر دیا کرتے۔ مگر ان اخوان سادات کی اچھی شہرت تھی اور عوام و خواص ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے (اللہ تعالیٰ سید ہاشم رضا کو زندہ و سلامت رکھے کہ وہ شعر و ادب کی محفلوں کی رونق اور آبرو ہیں۔)

سید آلِ رضا مرحوم کے نقش و نگار، رنگ روپ اور قد و قامت میں دلکشی پائی جاتی تھی۔ ان کے جسم پر لباس سجتا تھا، اُن کی نشست و برخاست نستعلیق اور رہن سہن شریفانہ تھا۔ لب و لہجہ میں نرمی اور شائستگی! نعت، مرثیہ، سلام، رُباعی غزل تمام اصنافِ سخن پر بڑی قدرت حاصل تھی، صحتِ زبان کا پوری طرح خیال رکھتے ان کا کلام ہر محفل اور مجلس میں پسند کیا جاتا۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند! قرآنِ کریم سے شغف۔

ع ہزار کرب و بلا ہو مگر نماز نماز

اُن کے سلام کا یہ مصرعہ جگر مراد آبادی کی زبان میں نقشِ ہر در و دیوار ہونے کے قابل ہے۔

سید آلِ رضا نے اَسّی برس کے لگ بھگ عمر پائی، مرنے سے دو ڈھائی برس پہلے محفلوں میں جانا ترک کر دیا تھا، موت اس عالم میں آئی کہ اُن کے ہاتھوں میں قرآن تھا۔ ان کی وفات کو علمی اور ادبی حلقوں میں ایک سانحہ کی طرح محسوس کیا گیا، اُن کی یاد میں بہت سے تعزیتی جلسے منعقد ہوئے، شعراء نے تاریخی قطعے اور غم انگیز اشعار سنائے۔ اونچے درجہ کے اہلِ علم نے اپنی تقریروں میں سید آلِ رضا کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اُن کی شاعری کو عظیم شاعری قرار دیا، خاص طور سے اُن کی مرثیہ نگاری کو سراہا گیا۔ ایک تعزیتی جلسہ میں راقم الحروف نے ارتجالاً یہ قطعہ سنایا:۔

کس قدر غمناک ہے یہ سانحہ — جُرعہ جُرعہ زہرِ غم کو پیجیے
حضرتِ آلِ رضا کی موت پر — لفظ اور معنیٰ کو پرسا دیجیے

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۸ء)

ابر احسنی گنوری

سنہ ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے جب میں کبیر ہائی اسکول ڈبائی (ضلع بلند شہر) میں پڑھتا تھا۔ ہمارے گاؤں (کیسر کلاں) سے پون میل کے فاصلہ پر چھوٹا سا قریہ گودھنہ ہے وہاں اب سے ایک صدی قبل ایک بزرگ حاجی غلام رسول شاہ صاحب نے کئی برس قیام فرمایا تھا۔ ان کا مزار چھتاری[1] کے قریب کالی ندی سے متصل سدھ پور میں ہے مگر گودھنہ میں ان کا عرس ہونے لگا؛ میری کمسنی کا زمانہ، ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں اپنی بے خبری کے سبب ان بدعات میں مبتلا تھا۔ مولود شریف کی محفلوں میں نعتیں بھی پڑھتا اور قیام بھی کرتا۔ حاجی صاحب کے عرس کے سلسلہ میں جو مولود شریف ہوا اس میں احمد بخش ابر گنوری کو پہلی بار دیکھا، وہ ان دنوں چار یا پانچ ساتھیوں کی پارٹی کے ساتھ نعت خوانی کرتے تھے۔ میرے وطن (کیسر کلاں) میں ان کی قرابت اور ان کے وطن (گنور) میں میری عزیز داری تھی۔ گنور اور ڈبائی میں مشاعرے بھی منعقد ہوتے اس طرح ان سے ملنا جلنا رہتا، نعت خوانی اور شعر و شاعری کا ذوق بھی مشترک تھا۔ مولانا ضیاء القادری بدایونی مرحوم بھی اس زمانے میں تحصیل گنور میں رجسٹرار قانون گو تھے۔

غالباً سنہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے میرا گنور جانا ہوا تو پتہ چلا کہ شب میں یہاں طرحی مشاعرہ ہے۔ غزل کہنے کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔ میں نے قریب کی مسجد میں جاکر

---

[1] نواب صاحب چھتاری کا خاندانی قبرستان بھی سدھ پور میں ہے یہ گاؤں انہی کی زمینداری میں شامل تھا کالی ندی کا پل ان کے دادا نواب محمود علی خاں مرحوم نے بنایا تھا۔ یہ بڑے اہل خیر اور مذہبی رئیس تھے۔ نواب چھتاری نے اپنے نامور پابند شریعت دادا کی تربیت اور نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔

غزل کہی ، دن کے گیارہ بارہ بجے مسجدیں نمازیوں سے خالی ہوتی ہیں۔ میری غزل کا مطلع تھا:

پاتا ہوں زخم لاکھوں اپنے دل وجگر میں ۔۔۔ نشتر بھرے ہوئے تھے ظالم تری نظر میں

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے دیر ہوتی جا رہی تھی ، مقطع نہیں ہو سکا۔ میں نے سوچا ابھی آدھا دن پڑا ہے مقطع کہنا کیا مشکل ہے۔ میں نے بیٹھک میں آ کر اپنی غزل سنائی تو ابر صاحب بولے اتنی تھوڑی دیر میں خاصے اچھے شعر تم نے کہے ہیں مگر مقطع ؟ میں نے کہا مقطع بھی ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولے مقطع میں کہے دیتا ہوں۔

ٹکرا رہے ہیں پتھر سر سے اچھل اچھل کر ۔۔۔ وحشت ہے کس بلا کی ماہر تمہارے سر میں

میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر مصرعہ اولیٰ سُن کر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ یہ منظر کتنا عجیب اور خندہ آمیز ہے کہ ربر کی گیند کی طرح راستے کے پتھر اچھل اچھل کر سر سے آ کر لگ رہے ہیں، ٹکرا رہے ہیں ۔۔۔۔۔ !

قصبہ گنور میں طالب صاحب سے ابر گنوری کی شاعرانہ چشمک رہتی تھی مگر وہ اپنے وطن سے لاہور چلے آئے اور پھر وطن کو واپسی کا نام نہیں لیا۔ قصبہ میں ابر ہی اب سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے ، ہمت گنوری کا درجہ اُن کے بعد تھا۔

ابر گنوری کو شاگرد بنانے کا بہت شوق تھا ، لکھنؤ کے رسالہ "سخن سنج" میں ایک یا دو غزلیں میرے نام سے خود کہہ کر میرے علم و اطلاع کے بغیر چھپوا دیں اور میرے نام کے ساتھ "تلمیذ ابر" لکھا۔

پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد میری زندگی کے حالات جن رسالوں میں شائع ہوئے ہیں نے اُن میں لکھا کہ میں کسی اُستاد کا شاعری میں شاگرد نہیں ہوں ، میرے یہ خود نوشتہ مضامین و حالات ابر گنوری کی نظر سے گزرے تھے بلکہ دلی کے ایک ماہنامہ میں تو اُن کے اور میرے قلم کے لکھے ہوئے سوانح حیات ایک ساتھ چھپے ، ماہنامہ "سخن سنج" کی نسبت سے میرا ذکر انہوں نے کبھی نہیں کیا۔

بدایوں ، بریلی ، علی گڑھ ، ایٹہ ، مین پوری ، میرٹھ ، آگرہ وغیرہ اضلاع میں حضرت مولانا احسن مارہروی اور مولانا سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں کے درمیان نوک جھونک رہتی تھی۔ ابر گنوری "سیمابیوں" کے مقابلہ میں "احسنیوں" کے سرگردہ تھے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں راقم الحروف حیدرآباد دکن سے وطن آیا اور وہاں سے بدایوں، ان دنوں اؔبر بدایوں سے متصل بستی نوادے میں اسکول ٹیچر تھے۔ مشہور افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی یہیں کے باشندے ہیں۔ ایک رات کھانے کے بعد خوب شعر خوانی رہی میں نے دو ڈھائی گھنٹہ اپنا کلام سنایا۔ بدایوں کے نامور ایڈووکیٹ مولوی محمد یحییٰ مرحوم بھی اس محفل میں شریک تھے۔ بدایوں کے خوش گو شاعر جناب عروؔج بدایونی نے بھی اپنے یہاں شعر و سخن کی نشست کا اہتمام کیا، تواضع و خاطر داری کا یہ عالم کہ بچھے جاتے تھے۔

اؔبر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ایک تماشا دکھاتا ہوں۔ میرے ساتھ توؔلا بدایونی[1] کے یہاں چلو، میں تمہارا نام نہیں بتاؤں گا، کہوں گا کہ حیدرآباد دکن کے ایک صاحب ذوق آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں! ہم دونوں وہاں پہنچے، گرمی کا زمانہ تھا، توؔلا صاحب کے نصف بدن پر لنگی سا تہبند (ڈھیلا ڈھالا پاجامہ) تھا اور اوپر کا بدن ننگا سن ساٹھ برس سے زیادہ نہ تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ منہ میں دانت ہیں اور نہ پیٹ میں آنت۔ گڑ کی چائے ٹیکا ٹیک دوپہر میں پی رہے تھے۔ حیدرآباد دکن کا ذکر آیا تو بولے مجھ سے لوگوں نے کہا ہے کہ نظام دکن اور مہاراجہ کشن پرشاد میرا پتہ پوچھتے ہیں مگر فانی بدایونی اور ماہر القادری میرا پتہ نہیں بتاتے، میں دکن جانے کا انتظام کر رہا ہوں۔ کچھ سامان بیچ دیا ہے، باقی فروخت کر دوں گا۔ میرا لڑکا دولا بھی میرے ساتھ جائے گا۔ جب ہم دونوں اُن سے مل کر چلے آئے تو یار لوگوں نے لطف لینے کے لیے توؔلا صاحب سے کہا کہ اؔبر گنوری آپ کے یہاں ماہر القادری کو لے کر آئے تھے مگر نام نہیں بتایا، اس پر توؔلا صاحب بکھر گئے۔ مجھے اور اؔبر صاحب کو بے نقط سنائیں، اور اس ملاقات کو سازش قرار دیا۔ سنا ہے کہ اُن کے جن ملنے جلنے والوں نے توؔلا صاحب کو بھرے پر رکھا تھا انہی نے منت سماجت کر کے انہیں حیدرآباد دکن جانے سے جیسے تیسے باز رکھا۔

اؔبر گنوری ضلع بدایوں کے پرائمری اسکولوں میں برسوں ٹیچر رہے۔ اردو مڈل پاس تھے، پھر اعلیٰ قابلیت اور دوسرے امتحانات میں کامیابی حاصل کی، نوادے میں جن لوگوں

---

[1] بڑے ہی مشاق و خوشگوار پُرگو شاعر تھے، دلی کے سہ روزہ "الامان" اور روزنامہ "وحدت" میں ان کا کلام چھپتا تھا اُس نواح میں توؔلا مرحوم کی اچھی شہرت تھی اور اپنی شخصیت کے بارے میں خاصے خوش فہم تھے۔

اُن کا قیام تھا تو شہر بدایوں کے بعض شاعروں سے اُن کی چل گئی، اختر غزنوی اس محاذ کے کمانڈنگ افسر تھے، مقدمہ بازی کی نوبت آگئی یا آتے آتے رہ گئی۔

غالباً ۱۹۲۷ء ہوگا جس زمانے میں اثر احسنی اپنے وطن (قصبہ گنور) میں مدرس تھے، ان دنوں قصبہ ڈبائی میں مشاعرہ منعقد ہوا، باہر کے شعراء بھی مدعو کیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ساغر نظامی مشاعروں کے ہیرو تھے۔ جس دن مشاعرہ تھا، اُسی دن ڈپٹی انسپکٹر مدارس گنور کے اسکول میں معائنہ کے لیے آدھمکے۔ روزی کا معاملہ تھا، محکمہ تعلیمات کے اتنے بڑے افسر کی موجودگی میں چھٹی لے کر مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے اثر صاحب کیسے جا سکتے تھے۔ دوپہر کے بعد معائنہ سے انہیں فرصت ملی، ڈبائی جانے والی دن کی ریل گاڑی جا چکی تھی، مگر مشاعرے میں شریک ہونے کا شوق انہیں بارہ تیرہ میل پاپیادہ گنور سے ڈبائی لے گیا، پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ عین وقت پر ڈبائی کے اکوں کے اڈے پر پہنچے، جب شعراء سواریوں سے اتر رہے تھے اور اُن کو ہار پہنائے جا رہے تھے۔

اثر گنوری کو علم عروض سے بڑا شغف تھا، اُن کی بیاضوں پر ہر غزل پر بحر کا نام مثلاً، رمل مثمن مخبون مقصور ——— متقارب مثمن سالم ——— منسرح مثمن مطوی مکسوف ضرور لکھا ہوتا، ان ناموں کو پڑھ کر مجھے بڑی وحشت ہوتی۔ اس فن میں بھرا انہوں نے تبحر پیدا کیا اور پاک و ہند کے چند چوٹی کے اساتذہ عروض میں اُن کا شمار ہوتا تھا ہندوستان کے ہر صوبہ میں اُن کے شاگرد تھے، یوں سمجھیے کہ اصلاح سخن کا ایک ڈپارٹمنٹ انہوں نے قائم کر رکھا تھا، یو۔پی کے علاوہ بمبئی، مدراس، راجستھان وغیرہ صوبوں کے مشاعروں میں اُن کو بلایا جانے لگا۔ مشاعروں میں چاہے داد ملے یا نہ ملے مگر ان کی استاذی اپنی جگہ مسلم تھی! ترنم خوش آہنگ تھا لیکن پڑھنے میں بعض اوقات گلے کی رگیں پھول جاتیں اور لہجہ بھی کرخت ہو جاتا۔ اوسط درجے کے نثر نگار تھے، چال ڈھال نستعلیق اور نشست و برخاست اور گفتگو سنجیدہ! اُن کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے تو خاصے اچھے شعروں کا مجموعہ منظر عام پر آئے گا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے میرا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب گاؤں کے لوگ مجھے "منجورا"[1] کہہ کر پکارتے تھے۔ پھر اثر نے مختلف

---

[1] منظور حسین میرا نام ہے۔ گاؤں میں معشوق علی کو مشو، عترت حسین کو اترد، عصمت اللہ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شہروں کے مشاعروں میں راقم الحروف کی پذیرائی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور لوگوں کی زبانی سنے۔ "فاران" میں میرے مضامین پڑھ کر تعریف آمیز خطوط لکھتے ایک بار مجھے خط میں لکھا آپ جہاں رہے اور جہاں بھی رہیں گے کامیاب ہر دلعزیز اور محترم ہی رہیں گے۔ فاران کے "توحید نمبر" کی بہت زیادہ مدح و ستائش کی۔

اس بات کو شاید سترہ اٹھارہ برس ہوئے ہوں گے، بزم احسن کے مشاعرے میں وہ کراچی آئے۔ اس کے بعد بھی کئی بار کراچی اُن کا آنا ہوا، اُن کے ساتھ یہ ایمان سوز ٹریجڈی پیش آئی کہ وہ آخر عمر میں بہائی ہو گئے، میں نے انہیں کئی کئی صفحے کے خط لکھے اور طرح طرح سے بہت کچھ سمجھایا کہ بہائیت ضلالت و کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ محمد علی باب اور بہاء اللہ کے حالات پر مشتمل ایک کتابچہ بھی اُن کے پاس بھیجا مگر وہ الٹے مجھے تبلیغ کرتے تھے جیسے وہ حق پر ہیں اور تمام ملت اسلامیہ باطل کی پیرو ہے اس ارتداد میں مالی منفعت کا لالچ بھی شامل تھا۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آنتر کی اہلیہ، داماد اور اولاد نے اس کفر میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کے وطن کے لوگوں کی زبانی اور خطوں سے حال ہی میں معلوم ہوا کہ ابر گنوری کو چند مہینے ہوئے قتل کر دیا گیا، خدا کرے مرنے سے پہلے وہ تائب ہو گئے ہوں اگر بہائی ہونے کی حالت میں مارے گئے تو اُن کا خاتمہ کفر و ارتداد پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان پر قائم رکھے اور ایمان پر خاتمہ بالخیر فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۴ء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ کو اسمو، فیض بخش کو فجو، محمد بخش کو ممدو، عبید اللہ خاں کو باد اللہ خاں، مجتبیٰ خاں کو مجے خاں، رام سہائے کو رمتیا، رام چندر کو رچندا، فتح اللہ کو فتو، باقر کو بانکے، بتول کو بتو، رضیہ کو رجو، اور سکینہ کو سکو کہتے تھے۔

ابراہیم جلیس

چودہ پندرہ سال کی اقامت کے بعد راقم الحروف نے ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد دکن کو خیرباد کہا، اُس وقت تک ابراہیم جلیس مشہور نہیں ہوئے تھے یا یوں کہیے کہ ان کی شہرت کا آغاز تھا اُن سے کہاں اور کس تقریب سے ملاقات ہوئی یہ بھی یاد نہیں آتا۔ حافظہ پر زور ڈالنے کے بعد اتنا یاد آتا ہے کہ حیدرآباد دکن کے کسی ادبی اجتماع میں انہیں میں نے دیکھا ضرور تھا۔

پاکستان بننے کے بعد اُن کی انشاء پردازی کا چرچا سننے میں آیا۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں حیدرآباد دکن کے بعض حضرات میرے پاس آئے اور فرمایا کہ ابراہیم جلیس جیل میں ہیں جس کی وجہ سے اُن کے گھر کے لوگ بہت زیادہ پریشان ہیں اُن کا گھر "غم خانہ" بن کر رہ گیا ہے۔ سُنا ہے سید ہاشم رضا صاحب سے آپ کے تعلقات ہیں، ابراہیم جلیس کی رہائی کے لیے کوئی سبیل نکالیے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہر نظربند اور قیدی کے گھر والے پریشان رہتے ہیں اُن کی پریشانی اور غم واضطراب کسی قیدی اور محبوس کی رہائی کے لیے دلیل نہیں بن سکتے۔ ہاں جن سرگرمیوں کی وجہ سے ابراہیم جلیس کو محبوس کیا گیا ہے اُن کے بارے میں ابراہیم جلیس کی تحریر آپ حاصل کرلیں کہ انہوں نے اپنے سیاسی افکار کو بدل دیا ہے یا قید سے رہائی کے بعد اُن کی سرگرمیاں جاری نہیں رہیں گی، اور انہوں نے اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرلی ہے ——— پھر میں سید ہاشم رضا صاحب سے اس بنیاد پر عرض معروض کرسکتا ہوں، مگر وہ حضرات ابراہیم جلیس کا کوئی پیغام یا تحریر لے کر میرے پاس نہیں آئے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ابراہیم جلیس رہا ہوگئے، اور قلم اُن کی شہرت اور آذوقہ حیات کا ذریعہ ٹھہرا۔ روزنامہ جنگ سے وابستگی نے ابراہیم جلیس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ ادبی اجتماعات میں مرحوم سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں وہ ہمیشہ راقم الحروف سے

جھک کر ملتے، نیاز مندی کا یہ انداز اُن کی بڑائی کی دلیل تھا۔

ابراہیم جلیس بلند پایہ ڈکاہی کالم نویس تھے۔ اُن کی دو تین کتابیں بھی چھپ کر مقبول ہو چکی تھیں، اُن کے اعزاز میں دعوتیں ہوئیں اور استقبالیے دیئے گئے۔ اُن کے والد نے اپنے بیٹے کی عزت و تکریم کے یہ روح افزا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ روزنامہ جنگ سے دو تین بار اُن کا تعلق قطع ہوا اور پھر جڑ گیا۔ پاکستان کے سب سے زیادہ چھپنے والے روزنامہ سے ابراہیم جلیس کی وابستگی اُن کے لیے ہر اعتبار سے فائدہ مند تھی، عزت و شہرت کے ساتھ تنخواہ بھی معقول تھی۔ مگر پھر ایسے حالات پیش آئے کہ روزنامہ جنگ سے اُن کی وابستگی قائم نہ رہ سکی۔ وہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنا ذاتی اخبار نکالا لیکن ان کی توقعات کے برعکس نتیجہ برآمد ہوا۔ جس قلم نے اُنہیں مقبول بنایا تھا وہی قلم ہفتہ وار "عوامی عدالت" میں صرف ہو رہا تھا بلکہ پوری قوت کے ساتھ کارگزار تھا — مگر "عوامی عدالت" سے وابستگی روزنامہ "جنگ" سے قطع تعلق کا نعم البدل نہ بن سکی بلکہ شروع شروع میں تو "بئس البدل" ہی رہی۔

ابراہیم جلیس ترقی پسند ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کمیونزم اور سوشلزم سے متاثر تھا۔ ابراہیم جلیس کے قلم سے بھی انہی افکار کی ترادش ہوتی تھی، مگر سال ڈیڑھ سال اُن کی تحریروں کا یہ رنگ بھی دیکھنے میں آیا جیسے سوشلزم سے دُور اور اسلامی افکار سے وہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ دو تین ادبی اجتماعات میں انہوں نے ایسے مقالے پڑھ کر سنائے جن کا اسلام پسندوں نے خیر مقدم کیا۔

کئی برس کی بات ہے شام ہمدرد میں ابراہیم جلیس کے بڑے صاحبزادے ملے انہوں نے مجھ سے کہا کہ والد کو نہ جانے آپ کیا سمجھتے ہیں، وہ تو نماز پڑھتے ہیں ——
اس اطلاع سے راقم الحروف کو دلی مسرت ہوئی۔ جلیس مرحوم پر مالی پریشانی کا دَور بھی گزرا ہے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار نفع نہیں دے رہا تھا اور پیپلز پارٹی سے اُن کا تعلق تذبذب کا شکار تھا۔ اس بات کو چار برس ہوئے ہوں گے وہ مجھے غالب لائبریری کے قریب سواری کی تلاش میں جاتے ہوئے ملے۔ ان دنوں ابراہیم جلیس کے بارے میں یہ خبر مشہور تھی کہ مسٹر بھٹو سے ان کا معاملہ ہو گیا ہے —— میں نے قدرے طنز آمیز انداز میں کہا، سنا ہے اب تو آپ کے خوب مزے ہیں، بولے یہ خبریں محض افواہ ہیں۔ میں تو کرایہ کے مکان میں

رہتا ہوں اور بس میں سفر کرتا ہوں۔ میرے حالات وہی ہیں ہیں جو پہلے تھے۔
مگر وہ زیادہ دن تک ناساز گار حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مسٹر بھٹو سے اُن کا رابطہ قائم ہو گیا۔ ہفتہ وار "عوامی عدالت" ہی کے ایک کارکن نے بتایا کہ چالیس ہزار روپیہ کے قریب سالانہ اشتہارات اُن کے اخبار کو دیئے جا رہے ہیں۔ یہ اخبار "ڈمی" چھپتا ہے۔ اس نوازشِ عالم بالا کے بعد روزنامہ "مساوات" کی ادارت اُن کو تفویض کی گئی۔ ماہانہ تنخواہ تین ہزار سے کیا کم ہو گی؟ مالی منفعت کے اعتبار سے یہ زمانہ اُن کے لیے سنہری زمانہ تھا۔ "مساوات" میں انہوں نے خوب کھل کر پیپلز پارٹی کی حمایت اور مسٹر بھٹو جیسے ظالم کی تائید و حمایت بلکہ قصیدہ خوانی کی! مارشل لاء نے بھٹو کو معزول کر دیا، تو "مساوات" نے عجیب عجیب طرح کی "خانہ ساز" خبریں شائع کیں اور کمیونسٹ صحافیوں کی وہ ٹیک نک استعمال کی جس میں واقعیت برائے نام زیادہ تر جھوٹ ہی ہوتا ہے۔
ابراہیم جلیس سے میری خط و کتابت نہ تھی، ہاں "عوامی عدالت" میں میرے دو تین مضامین شائع ہوئے تھے مگر گزشتہ عید الفطر پر انہوں نے "عید کارڈ" بھیجا جس میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا:
"آپ کا دیرینہ عقیدت مند گمراہ ابراہیم جلیس"
میں نے جواب میں لکھا کہ اس احساسِ ندامت کے بعد آپ اُس ماحول سے باہر نکل سکتے ہیں، رازق اللہ تعالیٰ ہے ...... !
میری اس تحریر کا اُن کی جانب سے جواب نہیں آیا اور نہ میں جواب کا متوقع تھا۔
اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اُن کا انتقال فالج سے اس حالت میں ہوا کہ مسٹر بھٹو کی حمایت اور تائید میں "مساوات" زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ ابراہیم جلیس کی وفات پر اخباروں نے تعزیتی اداریے لکھے اور ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کو سراہا۔

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۷۸ء)

مولانا سیّد ابنِ حسن جارچوی

ضلع بلند شہر جو راقم الحروف کا مولد و منشا ہے، مولانا ابن حسن مرحوم بھی اسی اسی ضلع کے ایک قصبہ (جارچہ) کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بڑی ریاضت و محنت سے مشرقی اور مغربی علوم میں دستگاہ حاصل کی، درس و تدریس اُن کا مشغلہ تھا، غیر منقسم ہندوستان کے کالجوں اور تعلیمی اداروں سے لے کر پاکستان بننے کے بعد کراچی یونیورسٹی تک جس کی مدت چالیس سال سے کیا کم ہوگی اُن کی وابستگی محکمہ تعلیمات سے رہی اور یہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا! وہ اونچے درجہ کے معلّم تھے، طلبہ کے پڑھانے میں اُن کے علمی تبحر تعلیمی تجربہ اخلاص، محنت اور نرمی و شفقت کی جلوہ گری ایک مثالی کردار تھا۔

مسلم لیگ سے وہ ہندوستان ہی میں وابستہ ہوگئے تھے۔ اور مرتے دم تک یہ ذہنی و فکری تعلق قائم رہا، مسلم لیگ میں جو انتشار پیدا ہوا اور ایک "مسلم لیگ" کی متعدد "لیگیں" بن گئیں، اس کا مولانا جارچوی کو بڑا دُکھ تھا! مگر وہ کیا کر سکتے تھے بر غارت بادِ نما اور اپنے مفاد پر عقیدہ و اصول کو بھینٹ چڑھانے والوں کو بس اللہ تعالیٰ ہی ہدایت اور اصلاحِ حال کی توفیق دے سکتا ہے!

کئی برس سے وہ مفلوج ہونے کے سبب خانہ نشین تھے۔ مگر اس حالت میں کہ پیر لڑکھڑا رہے ہیں دوسرے لوگ سہارا دے کر اسٹیج پر اُنہیں پہنچا رہے ہیں، سیاسی اور مذہبی جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرتے! تقریر کرتے ہوئے ان پر برقی لہر دوڑ جاتی! گرجدار آواز، تقریر میں تسلسل، اندازِ بیان دل نشین، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کچھ ظریفانہ چٹکلے بھی! ان کی تقریر کے دوران سامعین کو زیرِ لب تبسم اخندۂ نشاط

اور قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھا گیا، مگر گدگدیوں کے بعد جب وہ چٹکیاں لیتے تو مجمع ایکا ایکی سنجیدہ (SERIOUS) بن جاتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے مولانا جارچوی کے سوزِ دل کی گرمی اور آتش کدۂ سجاں کی لپٹ سننے والوں کے دل و دماغ تک پہنچ چکی ہے! وہ بیباک اور جری مقرر تھے! ہر دورِ حکومت میں اربابِ اقتدار کی غلط کاریوں پر کس کر تنقید کی۔ اپنی تقریروں میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ملک کا بیڑا شرابیوں اور بدکاروں نے غرق کیا ہے! اور اقتدار کی بھوک نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے! پاکستان کے بدنام صدر یحییٰ خاں مولانا جارچوی کے ہم مذہب تھے مگر پاپوش نگر کے جلسہ سیرۃ النبیؐ میں انہوں نے یحییٰ خاں کی شراب نوشی اور فاسقانہ زندگی پر چوٹیں کیں اور فرمایا کہ پاکستان میں فسق و فجور کا سلسلہ نیچے سے اوپر نہیں پہنچا بلکہ اوپر سے نیچے تک آتا ہے۔

انتقال سے ڈھائی تین مہینہ قبل کراچی یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے اجتماع میں فرمایا کہ —— ہم پاکستانی پیشہ در بھکاری ہو گئے ہیں، امریکہ سے، روس سے، چین سے، انگلستان سے اور جہاں بھی موقعہ مل جائے بھیک مانگتے ہیں۔ دریوزہ گری کا یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا، خدا کے لیے اپنے اللہ پر جو حقیقی رازق ہے بھروسہ کرو اور اپنے دست و بازو کی قوت کو کام میں لاؤ۔

ایک تقریر میں فرمایا کہ حضرت امام حسینؓ کی جنگ پوشیدہ ہتھیاروں کی نہیں کھلے ہتھیاروں کی جنگ تھی۔ ایسی ہی جنگ میں لڑنے والے کی بہادری کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سائنس کے ایجاد کردہ خفیہ اسلحہ نے دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے، اس تباہی میں شجاعت کا نہیں قساوت کا دخل ہے۔

اپنی تقریروں میں مولانا جارچوی "سوشلزم" کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اسلام عبادت ہو یا معیشت، تجارت ہو یا سیاست ہر اعتبار سے مکمل ترین نظام ہے "سوشلزم" قبول کر کے ہم اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت کی نفی و تردید کا وبال اپنے سر نہیں لے سکتے! سوشلزم حکومت کو رازق بناتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کو رازق

سمجھتے ہیں۔

راقم الحروف کو اکابر و مشاہیر کی تقریریں سننے کا بدوِ شعور ہی سے شوق رہا ہے۔ شیعہ علماء ذاکرین اور مقررین میں مولانا سید سبط حسن جائسی، مولانا کبن صاحب، علامہ علی الحائری لاہوری، مولانا مرتضیٰ حسین، مولانا سید محمد دہلوی، علامہ کفایت حسین، مولانا لقا علی بدایونی کی تقریریں اور مواعظ سُنے ہیں۔ یہ حضرات اب دنیا میں نہیں رہے اُن کی تقریروں میں جہاں سُنی اور شیعہ سامعین کا مِلا جُلا اجتماع ہوتا تھا، اس قسم کے فقرے سننے میں آئے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اُمت میں دُنیاداری آگئی" —— یہ خلافت پر طنز تھی!

"عربی کی مشہور ضرب المثل ہے، صاحب البیت ادریٰ بمافیہ! باہر کے لوگ گھر والوں کی طرح گھر کی باتیں کہاں جان سکتے ہیں، راز کی باتیں غیروں کو نہیں اپنوں کو بتائی جاتی ہیں۔"

خانوادۂ علی کی فضیلت کے پردے میں اس نکتہ کی تمام اکابر صحابہ پر زد پڑتی ہے۔ خلفاءِ ثلاثہ کے زمانے میں جو ممالک فتح ہوئے تھے اُن کی جنگوں کا ذکر اس انداز میں جیسے ان جنگوں کا مقصد صرف ملک گیری تھا، اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان میں شریک نہیں ہوئے —— مگر مولانا جارچوی کی زبان سے کسی تقریر میں اس قسم کی خفی و جلی طنز نہیں سُنی گئی، راقم الحروف نے اُن کی بعض تقریروں میں ان کانوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف سُنی ہے۔ یہ روایت بھی مجھ تک پہنچی ہے کہ مولانا جارچوی نے اپنی پرائیویٹ صحبت میں شیعہ حضرات سے کہا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی زوجیت سے شرفِ نسبت کے سبب حضرت عائشہؓ کا ذکر احترام کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اپنے ہم مذہبوں کی محفل میں "تقیہ" کا کوئی موقعہ اور ضرورت نہ تھی!

جہاں تک میرے قیاس اور معلومات کا تعلق ہے مجالسِ عزا میں ذاکری کا وہ نذرانہ نہیں لیتے تھے۔ یہ قیاس میں نے اس بناء پر قائم کیا ہے کہ اگر وہ ایسا

کرتے تو اُن کے رہن سہن اور زندگی میں ترفہ اور خوشحالی پائی جاتی۔ وہ پیشہ ور واعظ اور فیس لینے والے ذاکر نہیں تھے وہ ایک متوکل اور قانع شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

دو چار نہیں بیسیوں جلسوں میں اُن کا اور راقم الحروف کا ساتھ رہا۔ اُن کی تقریر اور میری نعتیہ نظمیں اور کسی کسی جلسہ میں میری تقریر بھی۔ جلسہ گاہوں کو آتے جاتے موٹر کار میں بھی اُن کی ہم نشینی کا موقعہ ملا اور بعض مسائل پر گفتگو بھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے وہ مداح تھے۔

اس بات کو زیادہ سے زیادہ پانچ مہینے ہوئے ہوں گے، جامعہ کراچی میں جلسہ سیرت ختم ہونے کے بعد ہم چائے پی رہے تھے میں نے عرض کیا کہ آپ نے ملک کے انتشار اور بدحالی کا اپنی تقریر میں تجزیہ فرمایا ہے ــــــ مگر اس پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کا ذمہ دار کون ہے؟ کس کے ووٹوں نے ان کا پلہ بھاری کر دیا، میری اس بات کا پس منظر سمجھ کر انہوں نے تردید کی بھرپور زور لہجہ میں بولے! بھائی ماہر! میرے گھر کے بارہ تیرہ ووٹ تھے میں تو جماعت اسلامی کے کارکنوں کے انتظار میں رہا کہ وہ ہمیں پولنگ اسٹیشن تک لے جائیں۔ انہوں نے کوئی شک نہیں سچی بات کہی مگر اپنی سادگی کے سبب وہ انتخابات کے اس قانون سے شاید بے خبر تھے کہ کسی اُمیدوار کا رائے دہندگان کو پولنگ اسٹیشن لے جانا ضابطۂ انتخابات کی خلاف ورزی تھی۔

مولانا سید ابنِ حسن جارچوی کا رنگ سپید اور خوب کھلتا ہوا تھا۔ ناک نقشہ و بیز مگر متناسب، جوانی میں حسین و خوبرو رہے ہوں گے۔ کم و بیش دس سال اسی حالت میں گزارے کہ مفلوج تو ار کے ساتھ چلنا پھرنا دوبھر تھا۔ ایک دن صبح کے اخبارات میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی، پوری قوم نے فرقوں کی سطح سے بلند ہو کر تعزیت اور خراجِ عقیدت کا حق ادا کیا۔ ان کے مرنے کے بعد اس کا اندازہ ہوا کہ اُن کی شخصیت کتنی مقبول شخصیت تھی۔

احمد اسحٰق

اب سے گیارہ بارہ سال پہلے کی بات ہے مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں ایک بیس بائیس سالہ نوجوان سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ اخبار جنگ میں خبروں کے ترجمہ کا کام کرتے ہیں یہ تھا احمد اسحٰق مرحوم سے میرا پہلا تعارف! اس کے بعد اُن سے مسلسل ملنا ہوتا رہا، پھر وہ ریڈیو کے کسی سیکشن سے متعلق ہو گئے، تقریباً دو سال سے وہ روزنامہ "حریت" کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ ماہانہ تنخواہ آٹھ سو کے قریب تھی! احمد اسحٰق کی صحافتی شہرت کا آغاز ہو چلا تھا اور اُن کی صلاحیتوں کے جوہر ابھر رہے تھے کہ عین عالم جوانی میں موت کے فرشتہ نے انہیں دنیا سے اٹھا لیا بلکہ چھین لیا۔

احمد اسحٰق تندرست نوجوان تھے، ایک دن گھر میں خون کی دو تین قے آئیں اور اس کے بعد وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ جناح ہسپتال میں داخل ہو جانا پڑا وہاں اُن کا آپریشن ہوا مگر آپریشن کے بعد بھی منہ سے خون آتا رہا، کمزوری برابر بڑھتی جا رہی تھی انہیں دو چار نہیں خون کی تیس بوتلیں دی گئیں۔ شاید ہی کسی مریض کو اتنی تعداد میں خون دیا گیا ہو، ڈاکٹروں نے پھر ایک دوسرے آپریشن کی ضرورت محسوس کی، مولانا ظفر احمد انصاری اور راقم الحروف جب شام کو جناح ہسپتال پہنچے ہیں تو معلوم ہوا کہ آپریشن تھیٹر میں اُن پر عمل جراحی ہو رہا ہے، اس خبر کے چند منٹ بعد یہ غم انگیز اطلاع ملی کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ شام کے سائے کو اس غم انگیز خبر نے اور زیادہ تاریک کر دیا، اُن کے عزیز اور صحافتی دوست رونے لگے، مشہور افسانہ نگار اور روزنامہ "حریت" کے کالم نویس محمود فاروقی کے تو اس صدمہ سے ہوش و حواس جاتے رہے۔

پیدائشی شاعر کی طرح احمد اسحٰق بھی پیدائشی صحافت نگار تھا، اخبار نویسی کا بارہ چودہ سال کا تجربہ پھر اُن کا ذاتی ذوق، مطالعہ، محنت، ان چیزوں نے اُن کو اونچے درجہ کا صحافی بنا دیا تھا، سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دینی مزاج رکھتے تھے۔ خبریں،

بیانات، مراسلے، اخباری مضامین، غرض جو چیز اُن سے متعلق ہوتی اس میں اسلامی قدروں کو سمونے کی پوری کوشش کرتے۔ روزنامہ "حریت" میں پابندی کے ساتھ سوچی سمجھی پالیسی کے تحت جو لڑکیوں کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں، اس روش سے وہ سخت بیزار تھے! احمد اسحٰق کی نیک مزاجی، خوش کرداری، سلامتی طبع اور دینی فراست کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ تحریک اقامت دین کے دل سے مؤید و حامی تھے، اُن کی صلاحیتیں اُبھر رہی تھیں، بروئے کار آ رہی تھیں اور ان کے جوہر کھلتے جا رہے تھے کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(ماہنامہ فاران" جون ۱۹۶۴ء)

مولانا حافظ احمد سعید دہلوی

تحریکِ خلافت جب شباب پر تھی۔ اُس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہو گی، خلافت سے مسلمانانِ ہند کو کیا والہانہ عقیدت اور ترکوں سے کتنی بے پناہ محبت تھی سارا ملک تحریکِ خلافت کے شور سے گونج رہا تھا، مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کی اتنی اہمیت تھی کہ ؎

ہم ہی نہیں رہے جو خلافت نہیں رہی

جیسے شعر پڑھنے اور سننے میں آتے تھے۔ ہمارے گاؤں (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) میں بھی خلافت کمیٹی قائم تھی اور پورے ضلع کی سب سے فعال کمیٹی تھی۔ میں اس کا سب سے کمسن کارکن تھا۔ وہ "سمرنا فنڈ" کے چندہ کے لیے گاؤں کی مسلم آبادی کے ایک ایک گھر کی پھیری، وہ انگریز دشمنی کا جوش و خروش، وہ جوشیلی نظمیں اور وہ دلوں کو گرما دینے والے نعرے! اُس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کوئی ایسا مسلمان جس کی زندگی میں مذہبیت نہ پائی جاتی ہو، مسلمانوں کا لیڈر اور قائد نہیں بن سکتا تھا وکیل، بیرسٹر اور پروفیسر جیلوں میں جاتے تھے اور وہاں سے چہروں پر ڈاڑھیاں رکھ کر اور گلے میں قرآن حمائل کر کے واپس آتے تھے۔

اس زمانے میں جن علماء کی ملک میں شہرت تھی، اُن میں مولانا احمد سعید دہلوی بھی شامل تھے۔ اخباروں میں اُن کا نام پڑھ کر اور لوگوں کی زبانی اُن کی تقریر کی شہرت سن کر، مولانا مرحوم کے دیکھنے کی تمنا تھی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز کی مخالفت ایمان کی دلیل سمجھی جاتی تھی اور "شمس العلماء" قسم کے عالموں کی مذہبی ساکھ گرتی جا رہی تھی۔

عام طور پر یہ نہیں ہوا کرتا کہ آدمی کے دل میں تمنا پیدا ہو اور اُس کے پورا ہونے کے اسباب بھی معاً فراہم ہو گئے۔ آدمی کو اس کے لیے انتظار کے مرحلوں سے گزارا جاتا ہے۔ برسوں کی تمنا کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی سے ملنے کا شرف ۱۹۲۷ء میں حاصل ہوا اور وہ اس تقریب کے ساتھ کہ مولانا عبدالقدیر بدایونی (سابق مفتی عدالت عالیہ

حیدرآباد دکن) اُن دنوں دلی آئے ہوئے تھے۔ میں بہ تلاشِ روزگار دلی میں مقیم تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سہ روزہ "الجمعیۃ" کی ایڈیٹری سے غالباً اسی ہفتہ سبک دوش ہوئے تھے اور حیدرآباد دکن جانے کی تیاری کر رہے تھے، مولانا عبدالقدیر صاحب نے مجھے مودودی صاحب سے ملایا، اور وہ مجھے لے کر مولانا احمد سعید صاحب کے مکان پر گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا مولانا مرحوم اپنے مکان واقعہ کوچہ چیلان کے بالا خانہ پر روئی کا ٹوپہ پہنے اور رضائی اوڑھے پلنگ پر لیٹے تھے۔ مولانا مودودی نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صحافت و انشا پردازی کا شوق رکھتے ہیں۔ "الجمعیۃ" کی ادارت سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں۔ مولانا احمد سعید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کل یا پرسوں آئیے چنانچہ دوسرے یا تیسرے دن میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔

مجھے اُن دنوں دردِ سر کا دورہ پڑتا تھا۔ یہ دورہ دو تین منٹ سے زیادہ طول نہ کھینچتا، مگر درد کی شدّت کا یہ عالم ہوتا کہ میں آنی سی دیر میں پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ مولانا کا کمالِ فراست تھا کہ مجھے دیکھتے ہی بولے :۔

"آپ کو کوئی بیماری ہے ؟"

میں نے عرض کیا کہ دردِ سر کا دورہ کبھی کبھی پڑ جاتا ہے، اور تھوڑی سی دیر میں افاقہ بھی ہو جاتا ہے۔ ملازمت کا معاملہ تھا۔ میں نے شدّت کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ انھوں نے مجھے ایک عنوان دیا، اور میں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تین چار صفحہ کا ایک مضمون لکھ ڈالا۔ مولانا مرحوم نے میرے لکھے ہوئے مضمون کو بڑے غور سے پڑھا اور فرمایا :

"ہاں! آپ سیاسی عنوانات پر ہاتھ کے ہاتھ مضمون لکھ سکتے ہیں ...."

اس کے دوسرے یا تیسرے دن ہی سے میں سہ روزہ "الجمعیۃ" میں کام کرنے لگا۔ اردو کے اخباروں سے خبروں کا انتخاب مجھ سے متعلق تھا۔ اہم خبروں کی سرخیاں میں خود قائم کرتا تھا، اور اپنی لگائی ہوئی سرخیوں کو اخبار میں چھپا ہوا دیکھ کر طبیعت کو مسرت ہوتی تھی۔ "الجمعیۃ" کے اداریے ہلال احمد زبیری لکھا کرتے تھے، جو ان دنوں ایم اے میں پڑھتے بھی تھے اور اُن کی ذہانت کے سبب مولانا صاحب اُن کو بہت چاہتے تھے۔ زبیری صاحب جس کالج کے طالب علم تھے، اس کی بزمِ ادب کی صدارت بھی غالباً انہی سے متعلق تھی، کئی طرحی مشاعرے انہی کی صدارت میں پڑھے، اس زمانہ

کی ایک غزل کے دو شعر ؎

ہو چکی بیمارِ اُلفت کو تسلی ہو چکی
ایک دُزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے
آپ نے جو کچھ کیا، اچھا کیا میں کیا کہوں
فیصلہ دُنیا کرے گی کون دنیا ساز ہے

سہ روزہ "الجمعیتہ" سے میری وابستگی ایک مہینہ سے زیادہ نہیں رہی، لیکن اس مدت میں مولانا احمد سعید مرحوم سے بار بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ ملا رموزی اس زمانہ میں تو گمنام ہو چکے ہیں مگر اُن دنوں ان کی "گلابی اردو" کی بڑی دھوم تھی، اُن کو میں نے دفتر الجمعیتہ ہی میں دیکھا، حکیم محمد احمد خاں مرحوم سے علاج معالجہ کرانے کے لیے دلی آئے تھے اور مولانا مرحوم سے سفارش و تعارف چاہتے تھے۔

قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں بلیبٹرہ ہے، وہاں کی بڑی آبادی مسلمان جلاہوں کی ہے۔ متعصب اور شر پسند ہندوؤں نے اُن پر حملہ آور ہو کر، گھروں کو لوٹا اور چند مسلمانوں کو آگ میں جلا دیا۔ دفتر الجمعیتہ میں یہ دردناک اطلاع آئی تو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید کے مشورے سے مجھے اس ہولناک واقعہ کی تحقیقات کے لیے بھیجا گیا۔ امروہہ کے دو یا تین بااثر اور تعلیم یافتہ حضرات میرے ساتھ اس تحقیقات میں شریک رہے۔ میں نے چند مظلوم مسلمانوں کے بیانات قلمبند کیے اور مسلمانوں کی جلی ہوئی ہڈیاں اور نیم سوختہ سوت تک اپنے ساتھ لے آیا۔ دلی کی جامع مسجد میں جلسہ ہوا، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے اس دردناک حادثہ پر تقریریں کیں، ریزولیشن پاس ہوئے، حکومت سے مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

میں نے جو رپورٹ مرتب کی تھی، اس پر نظرِ ثانی حضرت مفتی صاحب مرحوم نے کی، بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ زبان و بیان کی غلطیاں درست فرمائیں، پھر اُسے مولانا احمد سعید اور دوسرے اربابِ کار نے پڑھا تب کہیں جا کر میری یہ رپورٹ اخبار "الجمعیتہ" میں چھپی۔

دلی سے وطن چلا آیا، اور سال ڈیڑھ سال رہا، انہی دنوں ملازمت کی تلاش کے بہانے لکھنؤ، نینی تال اور مسوری کی سیر کی، پھر حیدرآباد دکن چلا گیا، اور تقریباً پندرہ سال

کے بعد ۱۹۴۴ء میں پھر دلی آگیا اور اگست ۱۹۴۷ء تک دلی میں مقیم رہا۔

مولانا احمد سعید مرحوم کو دلی کے اس چار سالہ قیام میں آتے جاتے بارہا دیکھا مگر اُن سے ملاقات ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ رجب کی ۲۷ تاریخ کو دلی ریڈیو اسٹیشن پر اُن کی تقریر اور میری نظم تھی۔ بڑی محبت سے ملے اور ایک مجلّد کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ مولانا مرحوم نے قرآنِ کریم کی تفسیر ترجمہ کے ساتھ لکھنی شروع کی تھی، اس کتاب میں چند سورتیں تفسیر ترجمہ کے ساتھ درج تھیں۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا تو متعدد مقامات پر کھٹک پیدا ہوئی، میں اُنھیں اس سلسلہ میں ایک مفصل عریضہ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس دوران میں ہندوستان میں وہ خونیں ہنگامہ پیش آگیا، جس نے مسلمانوں کو متفرق ہونے اور دیس نکالا قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کتاب اسی ہنگامہ کی نذر ہو گئی۔

اب سے چالیس سال پہلے ہندوستان کے پانچ عالموں کی تقریر کا بڑا شہرہ تھا، ان میں سب سے اوّل نمبر مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ تقریر و تحریر میں آپ ہی اپنا جواب تھے، اُس کے بعد مولانا آزاد سبحانی کا نام لیا جاتا تھا، بلکہ یہ تک سننے میں آیا کہ بعض جلسوں میں تو مولانا آزاد سبحانی کی تقریر کے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پھیکی رہی۔ تقسیم ہند سے تین چار سال (غالباً ۱۹۴۴ء میں) قبل ناگپور کی اردو کانفرنس میں مولانا آزاد سبحانی سے ملاقات ہوئی، کمیونزم سے خاصے متاثر تھے، کانفرنس میں تقریر کی مگر الجھی ہوئی سی! وہ سچ مچ پراگندہ مُو اور آشفتہ مزاج نظر آتے تھے، جسم پر ادیب تلے کرتے پہن رکھے تھے، اور اٹھتے بیٹھتے یہاں تک کہ پاخانہ کے لیے لوٹا اٹھاتے ہوئے "نحن خلیفۃ اللہ" اُن کی زبان سے نکلتا تھا۔

مولانا عبدالماجد قادری بدایونی مرحوم بڑے سحر آفریں اور شعلہ بیان مقرر تھے سیرت النبیؐ پر اس قدر ڈوب کر والہانہ انداز میں تقریر کرتے کہ اُن کے عمامے کے پیچ کھل جاتے اور چہرہ فرطِ عقیدت سے تمتمانے لگتا۔ مولانا ماجد میاں مرحوم مترادف الفاظ اپنی تقریر میں خاص طور سے لاتے تھے، ہم بے تکلف دوست اپنی صحبتوں میں بعض شاعروں کی شعر خوانی اور لیڈروں کی تقریر کی نقل اتارتے، تو مولانا عبدالماجد بدایونی کی تقریر کی نقل ان لفظوں میں کرتے :-

"نکلا ایک تلّہ کوہ سے، ایک چٹان سے، ایک تودہ خشت و سنگ سے،

ایک سانپ، ایک مارِ سیاہ، ایک اژدہا، ایک افعی، جو چلا کتراتا ہوا، بل کھاتا ہوا، لہراتا ہوا ...... "

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم دلی کی ٹکسالی زبان میں ایسی شستہ و رواں تقریر کرتے کہ سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتے۔ اُن کی تقریر میں بڑی روانی، آمد اور گھلاوٹ ہوتی تھی، لہجہ شیریں اور طرزِ ادا باوقار! ملت نے انہیں "سحبان الہند" کا خطاب دیا اور قوم کی دی ہوئی یہ خلعت اُن کے قامتِ موزوں پر ٹھیک آئی۔

شیعہ علماء میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے فاضل صدر مولانا سبط حسن صاحب جادو بیان مقرر تھے، اُن کے وعظ شعریت و ادبیت سے لبریز ہوتے تھے، چودھویں صدی میں اُن سے بہتر مقرر شیعہ کمیونٹی میں غالباً پیدا نہیں ہوا۔

ایک زمانہ میں جمیعۃ علماء ہند حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کی ذات سے عبارت تھی بلکہ اُن کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ مفتی صاحب مرحوم سیدھی سادی اسلامی زندگی اور علم و تقویٰ میں منتخب روزگار تھے اور مولانا احمد سعید مرحوم کو اُن سے کوئی نسبت نہ تھی مگر جمیعۃ علماء کا کاروبار زیادہ تر مولانا مرحوم ہی کی فکر و رائے سے چلتا تھا۔ سیاسی مسائل میں مولانا مرحوم، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم خیال بلکہ مقلد تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش میں وہ اُس کیمپ میں تھے جو تقسیم ہند کا مخالف تھا۔ اُن کی رائے کو غلط کہا جا سکتا ہے مگر اُن پر بدنیتی کا الزام لگانے کا گناہ اپنے سر نہیں لیا جا سکتا۔ ان کی رائے میں مسلمانانِ ہند کی خیر خواہی کا جذبہ شریک تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھارت راج میں جہاں تک سرکاری حیثیت اور بھارت کے نیتاؤں کے یہاں رسوخ و تقرب کا تعلق ہے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سب سے بازی لے گئے، مگر مولانا احمد سعید دہلوی کی شخصیت سرکار دربار کے جاہ و جلال کے آگے کسی طرح دب نہ سکی۔

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم خوش تقریر تھے، خوش خوراک اور خوش مزاج تھے، طبیعت میں مزاح بھی تھا اور کبھی کبھی ہنسی مذاق میں خاصے بے تکلف ہو جاتے تھے انگریزی دور میں کئی بار جیل گئے، جس کے سبب اُن کی صحت میں اعتدال باقی نہ رہا تھا۔ وہ مقرر اور لیڈر ہی نہیں علمی اور دینی کتابوں کے مؤلف اور مصنف بھی تھے!

۱۹۴۷ء میں جب دلی کے مسلمانوں پر بپتا پڑی اور اُن کے لیے سچ مچ "زمین سخت اور آسمان دور" ہو گیا تو حکومت کی طرف سے مولانا احمد سعید مرحوم کو پیشکش کی گئی کہ وہ کسی محفوظ ترین مقام پر چلے جائیں، جہاں سرکاری طور پر اُن کی حفاظت کا بندوبست کیا جائیگا مگر مولانا کی خود داری نے اس پیش کش کو یہ کہہ کے ٹھکرا دیا کہ میں دلی کے عام مسلمانوں کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ کر تنہا اپنی اور اپنے گھرانے کی حفاظت گوارا نہیں کر سکتا۔

دلی میں مولانا احمد سعید مرحوم کے بعد بس ایک تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی کی ذات رہ گئی ہے۔ جو دلی کے تمدن و تہذیب کی یادگار رہے۔ گورا شاہی کے بعد سکھ گردی کا زمانہ دیکھنا بھی دلی کی قسمت میں لکھا تھا۔

موت کی دست برد سے کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ قیامت تو ہر جان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے، موت نے "سحبان الہند" کو بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا، وہ بڑھاپے میں دنیا سے اٹھے مگر ملت نے جوانوں کی موت کی طرح اس صدمہ کو محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ "جنت کی کنجی" کے مصنف کو جنت الفردوس میں صلحا و اتقیاء کی معیت و ہم نشینی عطا فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۶۰ء)

علامہ احمد شبلی

مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی معیت میں میرا بمبئی پہلی بار جانا ۱۹۳۳ء میں ہوا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرین ڈرائیو (MARINE DRIVE) ان دنوں زیرِ تعمیر تھا اور اس علاقہ کا سمندری حصہ پاٹا جا رہا تھا۔ چند دن بمبئی میں قیام کرنے کے بعد بحری جہاز سے ہم عراق پہنچے اور وہاں سے واپسی میں پھر بمبئی میں قیام رہا —— دوسری بار ۱۹۴۰ء میں وہاں جانا ہوا۔ تقریب یہ تھی کہ بمبئی میں "یومِ شہنشاہِ اکبر" منایا گیا تھا، اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ تھا۔ جناب ضیاء الدین برنی نے مشاعرے کا دعوت نامہ بھیجا، اور میں حیدرآباد دکن سے روانہ ہو کر مشاعرے کے دن بمبئی پہنچ گیا۔

کرافٹ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں نام کا ایک ہوٹل تھا، سید فضل شاہ مرحوم اس کے مالک اور منتظم تھے۔ اسی ہوٹل میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کئی قطعے اس ہوٹل کی تعریف میں کہے تھے۔ صابو صدیق ہال میں شب میں مشاعرہ ہوا۔ سامعین کے اصرار اور فرمائش پر میں نے کئی چیزیں سنائیں۔ تیسری یا چوتھی غزل پر میں نے گرانی اور گھبراہٹ محسوس کی، دل دھڑکنے لگا۔ یہاں تک کہ باہر صحن میں جا کر میں نے کئی قے کیں۔ بدن پسینہ میں شرابور تھا اور پستی بے حد تھی۔ مشاعرہ گاہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بعض لوگ بولے کہ اس شاعر نے مقدار سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اسی نے اس کی یہ حالت کر دی۔

ماہنامہ "صبحِ اُمید" کے ایڈیٹر جناب عبدالحمید بوہیری جن سے کئی سال سے خط و کتابت تھی، ان سے اسی مشاعرے میں پہلی بار بالمشافہ تعارف ہوا۔ بوہیری صاحب نے اپنے یہاں ایک ضیافت اور اس کے ساتھ شعری نشست کا انتظام کیا، دوسرے دن بمبئی کے اخباروں میں اس ضیافت کی روداد شائع ہوئی۔ علامہ شبلی اس ضیافت کی روداد پڑھ کر "صبح امید" کے دفتر میں آئے، بوہیری صاحب معذرت کرنے لگے کہ آپ کو اس دعوت میں بلانا بھول گیا۔ علامہ بولے کہ کل میرے یہاں ماہر کی، آپ کی اُو

ان تمام شاعروں اور ادیبوں کی دعوت ہے، جو کل کی ضیافت میں شریک تھے۔

علامہ شبیلی کی وہ دعوت بلکہ یوں کہیے پرتکلف عشائیہ آج تک یاد ہے۔ عربی اور مغلئی کھانوں کا وہ لذیذ امتزاج، وسیع دسترخوان، ہر چیز ذائقہ دار اور فراوانی کے ساتھ۔ کھانے کے بعد شعر شاعری ہوئی۔ بس اس دن سے شبیلی مرحوم سے تعارف ہی نہیں دوستی ہو گئی —— اور پھر بمبئی میں ان سے برابر ملنا جلنا ہوتا رہا۔

ایک بار حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کے اعزاز میں شبیلی صاحب نے دعوت دی۔ یہ صحبت بڑی پُرلطف رہی، تین چار گھنٹہ کی نشست مگر ہر شخص محفل سے شگفتہ خاطر اٹھا۔

اب سے دو سال پہلے جب میں بمبئی گیا تھا تو حسب معمول علامہ شبیلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ ان کے مکان کے فرنیچر اور ماحول کو دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے مالی حالات غالباً پہلے سے نہیں رہے۔ بڑھاپے کے سبب کمزوری بھی ان کے چہرے اور بدن سے نمایاں تھی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی اب وہ چند مہینہ سے اس دنیا میں ہیں کہ جہاں جانے کے بعد پھر کسی کی خبر نہیں آتی۔

علامہ شبیلی ہندوستان میں سلطان مسقط کی طرف سے وکیل مختار تھے اور حکومت انگریزی کے خطاب یافتہ خان بہادر! عربی، اردو، فارسی اور بھاشا کے عالم، ساتھ ہی شاعر اور مضمون نگار بھی۔ بمبئی کے رسالوں اور اخباروں میں ان کا کلام اور مضامین ایک زمانہ میں چھپا کرتے تھے۔

اردو شاعری میں "تضمین" معروف صنف ہے، مگر علامہ شبیلی نے اردو شاعری میں "تشطیر" کا اضافہ کیا، اس صنف میں ان کی بعض نظمیں پسند کی گئیں۔ ان کا مطالعہ خاصہ وسیع تھا اور علم و ادب کی جامع صفات رکھتے تھے۔

علامہ شبیلی مرحوم "فاران" کے نہ صرف خریدار بلکہ قدر دان تھے! اتنے دنوں کی شناسائی کے باوجود اصرار کر کے "فاران" کا چندہ بھجوایا، ان کا کوئی عزیز بمبئی سے آتا تو اس کی معرفت سلام کہلواتے، وضعدار، ملنسار، مہمان نواز، علم دوست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی اس شخصیت کے باوجود ہر کسی سے تواضع کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی موت عروس البلاد بمبئی کے ایک ممتاز شہری اور بڑے آدمی کی موت ہے —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

—— (ماہنامہ فاران" جنوری ۱۹۶۲ء)

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم سے تعارف مجلہ "معارف" کے ذریعہ ہوا جس میں اُن کے علمی اور تاریخی مضامین چھپتے رہتے تھے لہٰذا اُن سے تعارف نہ بچپن کا ہے اور نہ بدوِ شعور کا بلکہ اُس زمانہ کا ہے جب میرا شعور خوب پختہ ہو چکا تھا۔

جوناگڑھ کے نواب صاحب کی سگ نوازی کے افسانے بہت کچھ سُن رکھے تھے۔ جوناگڑھ کا یہ کوئی اچھا تعارف نہ تھا۔ جوناگڑھ کا سنجیدہ اور باوقار تعارف قاضی اختر جوناگڑھی کی علمی شخصیت کے واسطہ سے ہوا۔

غالباً ۱۹۴۲ء کا قصہ ہے جب میں بمبئی ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کے لیے گیا ہوا تھا۔ قاضی صاحب مرحوم کرافٹ مارکیٹ کے قریب، جن صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے وہ انڈے اور مرغی کا بیوپار کرتے تھے اور غالباً اُن کا حسن میاں نام تھا۔ انہی صاحب نے ایک دن شب میں مجھے کھانے پر بُلایا اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی سے پہلی ملاقات اسی دعوت میں ہوئی۔ بڑے تپاک اور گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی سی دیر کی بات چیت میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ شعر و شاعری ہوئی۔ میں نے کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ قاضی صاحب مرحوم نے کسی سطحی شعر پر داد نہیں دی۔ اُسی شعر کو سراہا جس میں کوئی بات تھی۔ اس دعوت کے بعد ایک دو بار اور بھی ملنا ہوا۔

یہ بھی سچ ہے کہ پاکستان بننے سے لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہو گئے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پاکستان نے بہت سے ایسے لوگوں سے ملا بھی دیا جن سے متحدہ ہندوستان میں ملنے کی کسی عنوان اُمید ہی نہ تھی۔ پاکستان کو جمع و تفریق کا برزخ سمجھئے۔ قاضی احمد میاں اختر مرحوم سے تفصیلی ملاقات کا موقع کراچی میں ملا۔ ہمدرد دواخانہ سے کچھ آگے بندر روڈ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ جب میں حاضر ہوتا تو یہ ملاقات دس پانچ منٹ کی نہ ہوتی تھی، کسی کسی دن تو دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے لگ جاتے۔ وہ اکثر چائے اور پان

سے تواضع فرماتے۔ طبیعت بہت سادہ اور متواضع پائی تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی کا ایسا امتزاج کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

میں نے اپنی کتاب "دُرِ یتیم" پیش کی اور چند دن کے بعد قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ تمھاری کتاب ایک چوتھائی سے زیادہ نہ پڑھ سکا کہ اُسے پڑھتے میں آنسو ہی نہیں تھمتے۔ اور میں نے اپنی کتابیں جو یہاں سے منتقل کیں تو گھر کے لوگوں نے اصرار کیا کہ "دُرِ یتیم" یہیں رہنے دیجئے۔

مرحوم جب سے سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر حیدرآباد سندھ چلے گئے تھے، اُس وقت سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کم و بیش ڈیڑھ سال سے اُن کا دیدار نہ ہوا تھا۔ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ سیٹھ عبداللطیف صاحب باوانی نے اتوار کے دن تین بجے مجھے موٹر بھیج کر بلوایا اور ملیر میں اپنے نوتعمیر بنگلہ میں لے کر گئے۔ وہاں کچھ میمن سیٹھ صاحبان بھی تھے۔ مگر میری دلچسپی اور مسرت کے لیے علامہ عبدالعزیز المیمن، پروفیسر محمود الحسن خسرو اور قاضی احمد میاں اختر مرحوم کی شخصیتیں وہاں موجود تھیں۔ آئس کریم کا دور چلا۔ اس کے بعد میں نے اپنا نعتیہ کلام سُنایا۔ رات کو اسی بنگلہ میں کھانا بھی تھا۔ مگر مجھے ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ قاضی صاحب سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے کوئی بیس پچیس دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

قاضی صاحب مرحوم جاگیردار تھے اور ریاست کے کسی معزز عہدے پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ مگر طبیعت شریف اور سلیم پائی تھی۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے جو مشاغل ہوا کرتے ہیں اُن سے وہ ہمیشہ گریزاں رہے۔ اُن کی زندگی کا تمام تر حصّہ تحصیلِ علم، مطالعہ، تحقیق اور انشا پردازی میں گزرا۔ نام و نمود کا انھیں شوق نہ تھا۔ علم و ادب کے خاموش خدمت گزار تھے۔ مطالعہ اتنا کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں کم ہی لوگوں نے اتنی کتابیں پڑھی ہوں گی اور کسی نے اُن کی برابر یا اُن سے بڑھ کر مطالعہ کیا بھی ہو تو پڑھی ہوئی چیزیں یاد کسے رہتی ہیں، مگر قاضی صاحب مرحوم کو بہت کچھ پڑھا ہوا مستحضر تھا۔ تاریخ اُن کا خاص فن تھا۔ اور اس فن میں وہ اپنا آپ ہی جواب تھے۔

میں جب بھی حاضر ہوتا کوئی نہ کوئی مسئلہ از خود چھیڑتا۔ اُن سے استفادہ مقصود تھا۔ کتابوں اور مصنفین کے نام، تحریروں کے حوالے سنیں۔ یہاں تک کہ جن چھاپہ خانوں میں

وہ کتابیں چھپی ہیں ان تک کے نام اس قدر تفصیل سے بتاتے کہ سُن کر حیرت ہوتی. جونا گڑھ میں اُن کے پاس نہایت قیمتی کتب خانہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جونا گڑھ کی جمی ہوئی بساط بُری طرح تتر بتر ہو گئی۔ قاضی صاحب اس پُر آشوب دَور میں بھی تین ہزار کے قریب کتابیں کراچی لے آئے جو غالباً کھارادر کے کسی مکان میں انہوں نے رکھوادی تھیں۔

قاضی اختر مرحوم اُردو، انگریزی، عربی اور گجراتی میں یکساں مہارت رکھتے تھے اور ان زبانوں میں انہوں نے معرکہ کے مضامین لکھے ہیں۔ علامہ صاعد بن احمد اندلسی کی کتاب "طبقات الامم" کا اُردو میں نہایت ہی شستہ اور سلیس ترجمہ کیا اور اس پر جو ذیلی نوٹس (NOTES) لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ اور اُن جیسی معلومات کے لوگ اس زمانے میں خال خال ہی ملیں گے۔ فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ سنسکرت بھی پڑھی تھی اور غالباً فرانسیسی زبان سے بھی کسی حد تک آشنا تھے۔

میں نے بعض کثیر المطالعہ لوگوں کو دیکھا ہے کہ کتابوں کو پوری طرح ہضم نہیں کر سکتے اور خیالات میں عجیب اُلجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر قاضی اختر مرحوم انتہائی متوازن اور سُلجھا ہوا دماغ رکھتے تھے۔ وہ کتابوں میں کھو کر نہیں رہ گئے تھے۔ کتابوں سے انہوں نے بہت کچھ اخذ کیا تھا اور ان چمن چمن کے پھولوں اور خرمن خرمن کے خوشوں کو خود انہوں نے اپنی ذاتی تمیزِ خوب و ناخوب سے مرتب کیا تھا۔

ولی گجراتی (یا دکنی) اُن کا خاص بلکہ محبوب موضوع تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سب سے پیش پیش تھے جو ولی کے دکنی ہونے کی نفی کرتے اور اسے گجراتی نژاد بتاتے ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی انہوں نے ایسے مضامین لکھے جو یادگار رہیں گے۔

ایک مسلمان کو اگر دین سے شغف نہ ہو تو خالی علم و فضل اُس کے کس کام کا! دینداری قاضی صاحب مرحوم کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اور ذکرِ گرامی سنتے تو فرطِ محبت و عقیدت سے اُن کا چہرہ تمتمانے لگتا۔ جس زمانے میں ختمِ نبوت کی تحریک پاکستان میں چھڑی ہوئی تھی، ایک دن کہنے لگے کہ جونا گڑھ میں میرے مکان میں خواجہ کمال الدین ٹھہرے ہوئے تھے اور اس کے بالاخانہ میں ایک بزرگ کا قیام تھا۔ خواجہ کمال الدین نے مجھ سے کہا کہ میں ان بزرگ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ خواجہ کمال الدین اُن قادیانیوں

کی طرح نہیں ہیں جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں۔ وہ لاہوری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مرزا صاحب کی بس مجددیت کی قائل ہے۔ اس پر وہ بزرگ بولے کہ بھئی! خواجہ کمال الدین سے میں مل تو لیتا مگر غیرتِ نبوت اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔

یہاں آکر مرحوم کئی سال تک انجمن ترقی اُردو پاکستان کے نائب معتمد رہے۔ یہ اُن کی عسرت کا زمانہ تھا۔ بڑا کنبہ، شاید پانسو سے بھی کم تنخواہ۔ پھر صبح سے شام تک دفتری گھس گھس۔ مگر میں نے اُن کے تیوروں کو ملول نہیں دیکھا۔ پریشان حالی میں وہ اس یقین کے ساتھ شاکر و صابر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت انہیں نصیب ہے۔

دیوبند کے علماء میں علامہ سید انور شاہ کے بہت مداح تھے۔ سب سے زیادہ اثر اُن پر ندوہ کا تھا اور علامہ شبلی نعمانی کو اپنا روحانی اُستاد مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ اس فکر و نظر، علمی تبحر اور کردار کے آدمی کم ہی پیدا ہوتے ہیں!

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ایک بڑے کنبہ کے کفیل تھے۔ اُن کے بعد یہ کنبہ بالکل بے سہارا ہو گیا۔ پاکستانی حکومت اگر قدر شناسی نہ کر سکے تو کٹیانہ اور بانٹوے کے کروڑپتی تاجروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن کے اس نامور فرد کے پسماندگان کو فقر و فاقہ کی مصیبت سے بچائیں۔

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ادیبؔ سہارن پوری

تقسیمِ ہند سے قبل بھساول (صوبہ بمبئی) میں سال کے سال بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا، اسی مشاعرے میں ادیبؔ مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی، اب سے تقریباً بائیس سال پہلے کی بات ہے، اُن کی غزل جو مشاعرے میں کامیاب بھی رہی اور جس نے مجھے بھی متاثر کیا، اس کے دو شعر یہ تھے ؎

آنکھوں کی تمنا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں   اور دل کا تقاضا کہ وہ جلدی سے گزر جائیں
یہ جوشِ بہاراں، یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں   دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں

پھر غزل کے بعد انھوں نے نظم سنائی، عنوان تھا "سہ رد سے کی شام" اس کا یہ شعر تو اُسی وقت دل پر نقش ہو کر رہ گیا، اور آج تک نقش ہے ؎

دُھواں رِستا ہوا کھپریل کے رخنوں سے رہ رہ کر   کہ جیسے برف کی سِل پر کوئی تیزاب ڈال آئے

منظر نگاری کا یہ سماں تو کسی دوسرے شاعر کی نظم میں دیکھنے ہی میں نہیں آیا، اچھوتی تشبیہ اور بے مثل عکاسی! شعر کا یہی وہ آرٹ ہے جہاں مصوّری اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرتی ہے۔

جنابِ ادیبؔ سہارن پوری سے پھر مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، ایک بار دھولیا کے مشاعرے میں تین دن اُن کا ساتھ بھی رہا! مگر اُن سے بے تکلفی اور یارانہ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوا۔ ہر ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جاتے!

۱۹۴۹ء کا ذکر ہے راولپنڈی میں ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی طرف "کل پاکستان مشاعرہ" ہوا۔ پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (بالقابہ) اُن دنوں صرف "بریگیڈیر" تھے، صاحب موصوف نے مشاعرے کی صدارت فرمائی، طرحی مشاعرہ تھا! ادیب سہارنپوری کی غزل کا یہ شعر ؎

راستے جب کبھی ہموار نظر آتے ہیں اور بڑھ جاتا ہے احساسِ شکستہ پائی

حاصلِ مشاعرہ رہا۔ کراچی سے اس مشاعرے میں حضرت سیماب اکبر آبادی، نہال سیوہاروی، ادیبؔ سہارن پوری اور میں شریک ہوئے تھے۔ وہ تینوں تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اک میں ہی سخت جان ہوں، جواب تک جیئے جا رہا ہوں۔

جب بھی باہر کے مشاعرے میں ادیبؔ کا ساتھ ہوتا تھا تو سفر میں اور قیام گاہوں پر کیا کیا قہقہے اور چہچہے رہتے تھے، پورا سفر لطیفوں، چٹکلوں اور ہنسی خوشی میں گزرتا ایک لطیفہ تو الہامی ہے، جو شعراء کی بے تکلفی کی محفلوں میں ہمیشہ دہرایا جاتا ہے!

غالباً ۱۹۵۱ء کی بات ہے، سکھر میں اُردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا، بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی اس میں شریک ہوئے تھے، مشاعرے میں ایک صاحب نے "شہر آشوب" سنایا، درجنوں بندوں کا مسدس تھا، سننے والے بُری طرح اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے، اس کے بعد شعراء صاحبان کی شہر میں دعوتیں ہوئیں، ان دعوتوں میں شعر خوانی لازمی تھی یہ صاحب بھی ہر دعوت میں موجود پائے گئے، ذرا سے اشارے پر جیب سے بیاض نکالی اور نظم سنانی شروع کر دی، سب لوگ بور ہو رہے ہیں مگر یہ ہیں کہ پڑھے جا رہے ہیں —— ہم ایک دن دوپہر میں ایک دعوت سے قیام گاہ پر آئے، ایک پلنگ پر ادیبؔ سہارن پوری لیٹے تھے اور دوسری چارپائی پر میں دراز تھا، ایک نوجوان جو شاعروں کے قیام و طعام کے منتظمین میں شامل تھے اور بڑے خلوص و عقیدت سے شعراء کی خاطر داری کر رہے تھے، ہمارے قریب کرسی پر بیٹھے تھے میں ایک ساتھ تڑپ کر اٹھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ادیبؔ بے ساختہ بول پڑے:

"ماہر صاحب! وہ ان کے والد ہیں۔"

اُن کے اس جملہ پر میرا ہنسی کے مارے یہ عالم کہ پلنگ پر پیروں سے تالیاں بجانے لگا وہ نوجوان خاموش بیٹھا رہا، اُس بیچارے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

میں جو پلنگ سے تڑپ کر اٹھا تھا، تو وہ شاعر جو لمبی لمبی نظمیں سناتا تھا، اُس پر عریاں قسم کی طنز کرنا چاہتا تھا۔ ادیبؔ تاڑ گئے اور اُن کی ذہانت نے میرے ارادے کو بھانپ لیا! ایک نوجوان اپنے باپ کی شان میں نازیبا کلمات کس طرح سن سکتا تھا، ادیب مرحوم کی ذہانت نے مجھے اس مخمصے سے بچا لیا!

ایک صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت تھی، سب لوگ کھانا کھا چکے تو اُس

کے بعد شعر و سخن کی محفل جمی، شعر خوانی شروع ہو چکی تھی، اتنے میں سامنے کے کمرے سے ہوا کے زور سے پردہ ہٹ گیا۔ پردے کے پیچھے خواتین بیٹھی تھیں، میری نگاہ بیساختہ اٹھے ہوئے پردے پر پڑی، اس پر ادیب مرحوم بولے :

"خبردار، ہوشیار، خبردار"

کیا بتاؤں کہ اُن کے اس جملے میں کتنے رموز و اشارات اور کتنی بہت سی شوخیاں اور نفسیاتی نزاکتیں پنہاں تھیں۔

وہ جو مجھے بحث و گفتگو میں کبھی کبھی جلال آ جاتا ہے، تو ادیب سہارن پوری نے میری طبیعت کے اس جلال اور تیزی کو گوارا کیا ہے، اُن کی زندگی میں اس کا خیال نہ آتا تھا، اب سوچتا ہوں تو ندامت محسوس کرتا ہوں۔

ایک محفل میں وہ اپنی مشہور اور کامیاب ترین غزل خوب لہک لہک کر سنا رہے تھے، اُن کے اس شعر پر ؎

باندھ کر عہدِ وفا مجھ سے گیا ہے کوئی   اے مری عمرِ رواں! اور ذرا آہستہ

تو داد و ستائش کی دھوم مچ گئی، جب وہ غزل پڑھ چکے، تو میں نے اسی وقت موزوں کر کے یہ شعر سنایا ؎

سکھ بھی بیٹھے ہیں تری بزم میں او مستِ شباب
چھوڑ سگریٹ کا دھواں اور ذرا آہستہ

سب لوگ ہنسنے لگے، ادیب بھی خوب مسکرائے، اُن کی جگہ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو نہ جانے کتنا بُرا مانتا۔

میں جناب ادیب سہارن پوری مرحوم کا انتہائی بے تکلف دوست تھا اور اُن کی شاعری کا بیباک نقاد بھی! میرے کہنے اور ٹوکنے پر انھوں نے اپنی غزلوں میں تبدیلیاں کی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنی بات پر اڑے رہتے اور میرے مشورے کو قبول نہ کرتے۔ باہر کے مشاعروں میں ایسا بھی ہوا کہ مشاعرہ گاہ میں جانے سے پہلے ادیب مرحوم نے مجھے اپنی بیاض دی اور فرمایا "بھائی! میں نے یہ نئی غزل کہی ہے آج مشاعرے میں پڑھنا چاہتا ہوں تمہاری کیا رائے ہے؟" میں غزل پڑھ کر آزادی کے ساتھ اپنا تاثر بیان کر دیتا، میرے مشورے اور رائے پر وہ اعتماد کرتے تھے!

ادیب کا ترنم بڑا پرسوز تھا، اُن کے لہجہ میں خاص کھنک تھی اور تو اور حضرت جگر مرادآبادی جو شعر و ترنم کے بادشاہ تھے ادیب کے ترنم کو بہت پسند کرتے تھے۔ غزل میں ادیب نے اپنا آہنگ پیدا کیا، مشاعروں اور شعر و ادب کی محفلوں کی تو وہ رونق تھے۔ ان کی کئی غزلیں خاصی مشہور ہوئیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام "رنگ و آہنگ" کئی سال ہوئے جب چھپا تھا، اس کے بعد سے اب تک انھوں نے بہت کچھ کہا۔ دیکھئے! ان کے مرنے کے بعد دُنیا ان کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے جو شاعر اتنے اچھے شعر کہتا ہو ؎

ہزار باندھے لیے عقل و آگہی نے حصار — ترا خیال نہ جانے کہاں سے آتا ہے

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے — فاصلہ بھی میرے اُن کے درمیاں رہنے دیا

یارب اِمتاعِ دیں کو کہاں تک کوئی بچائے — ملتے ہیں روز دشمنِ ایماں نئے نئے

کتنے دل راہ میں لوگوں نے بچھا رکھے ہیں — اے مرے سروِ رواں! اور ذرا آہستہ

اُسے اہلِ دل اور اربابِ ذوق کس طرح بھول سکتے ہیں۔

ادیب سہارن پوری کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ریاست اندور میں گزرا۔ مالوے کی سہانی راتوں کی جھلک اُن کے جوانی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اندور میں وہ کوئی چھوٹا سا کاروبار کرتے تھے، اور اس کاروبار سے اتنا مل جاتا تھا کہ بس گزارا کر سکیں۔ پاکستان آنے کے بعد وہ شروع شروع میں خاصے پریشان رہے، پھر کموڈور خالد جمیل کی نوازش سے نیوی (NAVY) میں جگہ مل گئی۔ انتقال کے وقت وہ ڈاکیارڈ میں لائبریرین تھے۔

کئی سال سے انہیں رمی کھیلنے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس معاملہ میں جگر مرادآبادی کے صحیح جانشین تھے اور اُن کی گدی سنبھالے ہوئے تھے، ان آنکھوں نے اُن کو نماز پڑھتے بھی دیکھا ہے، اللہ اور رسولؐ کا ذکر چھڑ جاتا تو فرطِ عقیدت سے چہرے کا رنگ بدل جاتا، بہت سی نعتیہ غزلیں کہیں اور تقریباً دو سال تک ایک ایک ہفتہ کے وقفہ سے اُنہی کی زبان سے نعتیہ غزلیں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں۔

فوج کے محکمہ میں سال کے سال ملازمین کا طبی معائنہ ہوا کرتا ہے۔ اس سال ادیب مرحوم کے پھیپھڑوں میں معمولی سی تکلیف بتائی گئی، جس کے ازالہ کے لیے ہسپتال میں وہ داخل ہو گئے۔ ایک مہینہ تک اُن کا علاج ہوتا رہا، اس کے بعد انہیں ایکا ایکی تیز بخار آگیا، ڈاکٹروں نے لاکھ تدبیریں کیں مگر بخار کم نہیں ہوا، کمزوری بڑھتی اور حالت

تشویشناک ہوتی چلی گئی۔

مرنے سے دو دن پہلے مجھے یاد کیا، دوسرے دن مجھے اُن کی شدید بیماری کی خبر ملی، میں نے جناب تابشؔ دہلوی کو ٹیلی فون کیا، ہم دونوں جب ہسپتال پہنچے ہیں، تو انہیں گلوکوز پہنچایا جا رہا تھا، بخار تیز تھا اور ہچکی لگی ہوئی تھی، تابشؔ صاحب کو دیکھ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا، پھر میرے ہاتھ کو تھاما، بہت غور سے دیکھا، کئی بار بولنے کی کوشش کی، مگر زبان ساتھ نہ دے سکی، شاید یہ شکایت کرنا چاہتے ہوں ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی　　　　بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ان کی آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں، نہ جانے پوری طرح ہمیں پہچانا یا نہیں پہچانا، ہم باہر آئے تو ایک صاحب نے جو غالباً نیوی میں ملازم تھے مجھ سے چپکے سے کہا کہ میں ہیڈ کوارٹر سے آ رہا ہوں، ہسپتال سے ان کے خطرے کا سگنل پہنچ چکا ہے　　دوسرے دن ادیبؔ کے لڑکے رشید نے ٹیلیفون کیا کہ ڈاکٹروں نے بالکل جواب دے دیا ہے، حالت غیر ہے۔ شام کے چار بجے ادیبؔ مرحوم کے قدردان دوست مرزا مقبول، اُن کی بیگم صاحبہ تابشؔ دہلوی اور میں ہسپتال پہنچے اور وہاں وارڈ میں قدم رکھتے ہی یہ المناک خبر ملی کہ کوئی پانچ منٹ ہوئے ہوں گے، وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کتنی دردناک اور الم انگیز خبر تھی ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں دھند چھا گئی، سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر ان گنہگار اور پتھر آنکھوں نے اس چہکتے ہوئے بلبل کو بستر مرگ پر خاموش دیکھا، مگر اب کیا دھرا تھا، پنچھی اڑ گیا تھا، پنجرہ خالی تھا۔

ادیبؔ مرحوم کے چہرے پر بیماری اور نقاہت کی زردی اور موت کی سپیدی مل چکی تھی، مگر اس کے باوجود چہرہ شگفتہ تھا اور ہونٹوں پر تبسم کی نمود! تقریباً دو گھنٹہ انتظار کے بعد میونسپل کارپوریشن کی لاری آئی، اتنے میں جناب فضل کریم فضلی بھی تشریف لے آئے، وہ صبح اخباروں میں اُن کی علالت کی خبر پڑھ کر بیمار پرسی کے لیے آئے تھے، مگر یہاں آ کر وہ بھی سوگواروں میں شامل ہو گئے۔

دوسرے دن ادیبؔ سہارنپوری کو سوسائٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان سخت جان اور سنگدل ہاتھوں نے ان کی قبر پر مٹی ڈالی، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ (آمین)

ریڈیو اور اخباروں نے اُن کی موت پر غم کا اظہار کیا۔ مگر مرنے والے کے ساتھ لوگوں کی داد و تحسین نہیں، اس کے اپنے اعمال جاتے ہیں، اور ہم سب اسی طرف سے غافل ہیں۔ اسی غفلت نے ہماری زندگیوں کو بہت کچھ "غیر دینی" بنا دیا ہے! قلبِ غافل سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۶۳ء)

آرزو لکھنوی

نام تھا شہنشاہ حسین، آرزو تخلص، خاص لکھنؤ کے باشندے۔ شاعری میں علامہ آرزو لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ نوجوانی لکھنؤ میں اور جوانی کا خاصا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا۔ وہاں بھی اہلِ علم اور اربابِ فن کی صحبت اور ہم نشینی انہیں میسر آئی انگریزی کے ایم۔ اے مگر وضع قطع، لباس، نشست و برخاست اور چہرے مہرے سے اردو کے ادیب فاضل نظر آتے تھے۔ سلام کرنے میں وہ ان کے ہاتھ کی جنبش اور گردن کا خم، اُن کے لکھنوی ہونے کی شہادت دیتا تھا۔

پاکستان میں آنے کے بعد اُن کی ملازمت کا آغاز محکمہ ریڈیو سے ہوا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اردو نظم و غزل ریڈیو سے موسیقار جو نشر کیا کرتے ہیں اُن کے تلفظ کی صحت کی خدمت اُن سے متعلق تھی۔

اسی سال کی مدت میں لکھنؤ کا پہلا دَور پیارے صاحب، رشید، چکبست، صفی عزیز اور ثاقب سے عبارت ہے دوسرے دَور کے قابلِ ذکر شعرا سراج اور قدیر ہیں۔ آرزو صاحب اس کے بعد کے تیسرے دور میں تصور کیے جاتے تھے۔

آرزو لکھنوی مرحوم کی ساری زندگی حسرتوں ہی میں گزری۔ اُن کے حالات کی تنگی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شادی نہیں کی اور شریکِ زندگی کی رفاقت تک سے محروم رہے۔ برسوں سے دل کے مریض تھے، اس نے اُن کو جسمانی طور پر مضمحل بنا دیا تھا اور اس کا فرق کرنا دشوار تھا کہ جسمانی طور پر نازکی اُن کے اضمحلال کا سبب تھی یا اضمحلال کے سبب وہ نازک نظر آتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں کھڑک پور (بنگال) کے مشاعرے میں میرا جانا ہوا تھا آرزو صاحب بھی اُس مشاعرے میں لکھنؤ سے آئے تھے۔ مگر اُن کی شکل و صورت اور تخلص مجھے بالکل یاد نہیں رہا وہ فرمایا کرتے تھے کہ تم سے پہلی بار ملاقات کھڑک پور کے مشاعرے میں ہوئی تھی۔

کراچی میں اُن سے تعارف کے بعد شناسائی اُس کے بعد دوستی اور بے تکلفی بڑھتی ہی چلی گئی میں اور میرے ساتھ دو تین دوست انہیں چھیڑتے رہتے مگر وہ بُرا نہ مانتے جیسے غصہ ہونا، بگڑنا، اور روٹھنا اُن کو آتا ہی نہ تھا، ان کی جگہ کوئی دوسرا تنگ ظرف ہوتا، تو بعض وقت ہمارے مذاق پر ملاحیاں کیا گالیاں دینے پر اُتر آتا۔

اب سے چند سال قبل مشرقی پاکستان کے مشاعروں میں اُن کا ساتھ رہا، یہ سات دن کا طوفانی دورہ بھی یاد رہے گا، صبح کو چل کر دوپہر کے قریب ہوائی جہاز سے ڈھاکہ پہنچے وہاں شب میں مشاعرہ پڑھا۔ دوسرے دن چٹاگانگ میں جادھکے، وہاں کے مشاعرے سے فارغ ہوکر ڈھاکہ آئے اور تیسرے دن ہوائی جہاز سے ایشرڈی کے لیے روانہ ہوئے، پچیس منٹ کا سفر، اس کے بعد چند میل کار میں، پھر ریل میں جو بیٹھے ہیں تو شب میں آٹھ بجے کے بعد کہیں جاکر سید پور پہنچے۔ سید پور کا مشاعرہ پڑھ کر رات ہی میں ٹرین کے ذریعہ کھلنا کے لیے چل پڑے اور چودہ پندرہ گھنٹہ کے مسلسل سفر کے بعد کھلنا پہنچے۔ وہاں کے مشاعرے میں شرکت کرکے دوسرے روز صبح کو کار میں جیسور کے ہوائی اڈہ پر آئے وہاں سے ہوائی جہاز پکڑا اور تیسرے پہر کو ڈھاکہ پہنچا ہوا اُسی شب میں شاعروں اور مشاعروں کے معاملہ میں مشرقی پاکستان کے قطب جناب حبیب انصاری کے دولت کدے پر دعوت اور شعر و سخن کی محفل میں بہت رات گئے تک جاگتے رہے۔ دوسرے دن ڈھاکہ سے کراچی کو واپسی ہوئی وہ جو بچپن میں اڑن کھٹولوں کے قصے اور زمین کی طنابیں کھینچ جانے اور اولیاء اللہ کے طے ارض کی کراماتیں پڑھا کرتے تھے۔ اس سفر میں ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔

جنرل اعظم خاں اُن دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے، "گلستان" ڈھاکہ کا مشہور سینما ہے اُسی میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جنرل صاحب موصوف نے بھی شرکت فرمائی۔ کسی شاعر کو اُس کے شعر پر زیادہ داد ملتی تو وہ غالباً اپنی گرانی گوش کے سبب اپنی بیگم صاحبہ سے کچھ پوچھتے، ارمؔ لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا:-

وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہوگئی
اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہوگئی

تو ہال دادِ تحسین کے شور سے گونج اٹھا اس پر جنرل صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ دریافت کیا۔ جب مشاعرہ گاہ سے ہم قیام گاہ پر آئے تو میں نے کہا ارمؔ صاحب

آپ نے غضب کر دیا۔ مارشل لا کے دور میں ایسا سیاسی مطلع پڑھ دیا۔ وہ چونک کر بولے، اس مطلع کو سیاست سے کیا واسطہ، اور یہ غزل تو میں نے تقسیم ہند سے قبل انگریز کے دورِ حکومت میں لکھنؤ میں کہی تھی۔ اس مذاق میں اقبال صفی پوری صاحب کی شوخی اور ظرافتِ طبع نے اور لطف پیدا کر دیا۔ ارمؔ صاحب کو باور کرایا گیا کہ یہ شعر ارکے حلقوں میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ معاملہ بڑا سنگین نظر آتا ہے اور بھیا ارمؔ! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا، مگر...... !

"یہ زنجیر...... اور بھاری ہو گئی"

اس کی توجیہہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی، اس شعر کو یہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ پچھلے دوروں کے مقابلہ میں موجودہ دور سخت تر ہے۔ ارمؔ بے چارے کے چہرے پر فکر و تشویش کی ہوائیاں سی چھٹنے لگیں، کئی دن مذاق کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور جب اس مذاق کا راز اُن پر کھل گیا، تو برا نہیں مانا۔

ارمؔ سے آخری ملاقات اُن کے مرنے سے دو دن پہلے جناب اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی (نبیرۂ حضرت امیر مینائی) کی صاحبزادی کی شادی میں ہوئی، چند منٹ ہنسی مذاق کی باتیں بھی رہیں، بس پھر دو راتیں گزرنے پائی تھیں کہ دوسری صبح کو اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی — اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ارمؔ لکھنوی خوش گو شاعر تھے، غزل کے مزاج کو پہچانتے تھے، اُن کے ترنم میں انفرادیت کے ساتھ سوز اور کشش بھی تھی بعض مشاعروں میں تو وہ اس قدر کامیاب رہے کہ پھر ان کے بعد کوئی شاعر جم ہی نہیں سکا! اُن کے چند شعر

وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب ستگاری ہو گئی
اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہو گئی

آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا جاتا تھا میں
دفعتہً پیشِ نظر صورت تمہاری ہو گئی

ہم باغِ تمنا میں دن اپنے گزار آئے
آئی نہ بہار آخر، شاید نہ بہار آئے

ٹکرایا ترے در سے اک نعرۂ مستانہ
بے نام لیے تیرا ہم تجھ کو پکار آئے

سر ہو سجدے میں تو پھر آئے کسی کا کیوں خیال
اے معاذاللہ! تیری بندگی تیرے بغیر

کبھی سر بھی رکھ دیں گے قدموں پہ اُن کے
ابھی صرف نقشِ قدم دیکھتے ہیں

کوئی دیکھ کر اُن کو سنبھلے تو جانیں
مگر جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں

مقطع کا مصرعہ ثانی غالبؔ کا مصرعہ — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں — اُن کے تخلص (ارمؔ) کی مناسبت سے لطف دے گیا۔

اسدؔ ملتانی

جناب اسدؔ ملتانی مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے دلّی میں ہوئی تھی۔ اسے بھی سولہ سترہ سال ہونے کو آئے! اُن کے لب ولہجہ اور وضع قطع سے میں شروع شروع میں یہ سمجھا کہ اُن کی سنجیدگی خشکی لیے ہوئے ہے مگر اُن سے جب بار بار ملنا ہوا تو مجھ پر میرے اندیشہ کی یہ غلطی کھلی، وہ سنجیدہ ضرور تھے مگر خشک اور بے لچک نہ تھے۔

اسد صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع تو کراچی میں میسّر آئے، بعض دفعہ اُن کے یہاں کئی کئی گھنٹہ کی صحبتیں اور علمی مذاکرے رہے ہیں مگر طبیعت نے گرانی محسوس نہیں کی، میں ان کی محفل سے کبھی ملول، مکدر اور دل برداشتہ ہو کر نہیں اُٹھا، چلتے وقت ایسا لگتا، جیسے تشنگی اس بزم میں پھر کشاں کشاں لے کر آئے گی اور یہ جانا دوبارہ آنے کی تمہید ہے!

حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ حرمین شریفین کے سفر میں اُن کا ساتھ ہوگیا۔ پانی کے ایک ہی جہاز سے ہم روانہ ہوئے، عرشہ پر دیر تک اُن سے گفتگو اور ساتھ ساتھ اُٹھنا بیٹھنا رہتا۔ حرم کعبہ میں کتنی بہت سی نمازیں اُن کے دوش بدوش پڑھی ہیں اور زانو سے زانو ملا کر صحنِ حرم میں ہم دونوں اس انداز سے بیٹھے ہیں کہ سامنے کعبۃ اللہ ہے اور زائرین ذوق وشوق سے طواف کر رہے ہیں، کعبہ کی مقدس دیواروں کو اسدؔ مرحوم اور میری نگاہوں نے نہ جانے کتنی بار ساتھ ساتھ چوما ہے! اس مقدس سفر کی رفاقت کہیں بھلائی جاسکتی ہے، وہ تو دل پر نقش ہے! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ جس نے حرمِ کعبہ میں ہم دونوں کو یکجا کر دیا تھا، جنّت کے باغوں میں بھی وہ ہمیں یکجا کر دے، کہ وہاں ساتھ ساتھ مل کر گل گشت کریں، نہروں کے پانی کو ایک دوسرے پر اُچھالیں، پھولوں سے کھیلیں، باغوں میں جھولیں، اپنے شعر سُنا سُنا کر حور وغلماں سے داد لیں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ (آمین)

اسدؔ مرحوم کے بنگلہ پر حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی مہینہ میں دو بار وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا موصوف کے وعظ پر آج کل کے مولویوں کے بیان و تقریر کا قیاس نہ کیا جائے، مولانا ایوب صاحب صحیح معنوں میں علوم و معارف کے دریا بہاتے ہیں ان کی بات دماغوں کو مطمئن بناتی اور دلوں میں گھر کرتی ہے مولانا کا وعظ ختم ہونے کے بعد، ہم دو چار آدمی اسدؔ صاحب کے یہاں رک جاتے، بڑے سلیقہ کے ساتھ چائے اور بسکٹوں سے ہماری تواضع کی جاتی اور ڈیڑھ دو گھنٹہ دین و اخلاق پر گفتگو رہتی، اس مذاکرے میں سب سے زیادہ بولنے والا میں ہوتا۔

پاکستان کا دارالسلطنت کراچی سے راولپنڈی تبدیل ہوا تو اسدؔ ملتانی مرحوم کو بھی کراچی سے پنڈی جانا پڑا، اُن کے جانے سے دو ہفتہ قبل میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اپنی فارسی لغت "فاران" کو عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس وعدہ کو اسی ہفتہ پورا بھی کر دیا۔ خیال نہیں یقین تھا کہ پنڈی کی روانگی کے وقت اُن سے پھر ملنا ہو گا مگر میں ایک مشاعرے کے چکر میں باہر چلا گیا اور اُن سے ملنا نہ ہو سکا، اسد مرحوم "فاران" بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے، پنڈی جا کر انہوں نے خط بھیجا کہ "نومبر کا فاران نہیں ملا، اب میرے راولپنڈی کے پتہ پر رسالہ بھیجا جائے"! اس کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ پنڈی کا یہ سفر اُن کا آخری سفر ہے اور پنڈی کی آب و ہوا جس کو صحت مند بتایا جاتا ہے، پاکستان کے اس قابلِ فخر شاعر کو موت کی نیند سُلا کر دم لے گی! اہلِ صحافت کی اس بے ذوقی، قدر ناشناسی اور بے خبری کی انتہا ہے کہ کراچی کے اخبارات میں حضرت اسد ملتانی کی موت کی خبر اس حزنیہ کے کئی دن بعد شائع ہوئی اور وہ بھی غیر نمایاں انداز میں! حالانکہ اسی کراچی کے اخبارات میں بعض ایسے ادیبوں اور شاعروں کا جو اسد ملتانی سے ہر لحاظ سے گھٹ کر تھے کئی کئی دن تک مسلسل ماتم کیا گیا اور سوگ منایا گیا ہے، مجھے تو میرے ایک جاننے والے نے بتایا کہ میں نے ریڈیو سے اسدؔ ملتانی کے انتقال کی خبر سنی ہے! اس خبر کے سنتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے فضا میں ایکا ایکی دُھند سی چھا گئی، یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہوا ہو گا، مگر بعد میں اس "المیہ" کی تصدیق ہو گئی!

اسدؔ ملتانی کے اس فخر کا کیا پوچھنا کہ علامہ اقبال مرحوم کی صحبتوں سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، غالباً اُن کی دو چار غزلوں اور نظموں پر اقبال نے اصلاح بھی دی تھی!

اسدصاحب انگریزی دَور میں ایک سینئر کلرک کی حیثیت سے ملازمت میں داخل ہوئے اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی کر کے حکومتِ پاکستان میں اسسٹنٹ سکریٹری ہو گئے! وہ اس سے زیادہ ترقی کے مستحق تھے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مرحوم کو توڑ جوڑ نہ آتا تھا اور نہ بڑے آدمیوں میں گھس بیٹھنے اور اُن کا دُم چھلا بنے رہنے کو وہ پسند کرتے تھے، پھر بھی اُن کی تنخواہ الاؤنس وغیرہ مل ملا کر بارہ سو روپے سے کیا کم ہو گی، بنگلہ میں رہتے تھے، موٹرنشین تھے، صاف ستھری زندگی، اور بڑے چلن کی زندگی، اخراجات آمدنی کی حدود میں رہ کر!

اسد ملتانی مرحوم کے ساتھ اُن کے چھوٹے بھائی اسلم بال بچوں سمیت رہتے تھے، دونوں بھائیوں میں حد درجہ محبت تھی، سچ مچ یک جان و دو قالب! کہیں دعوت میں، مشاعرے میں جلسہ اور وعظ میں جانا ہوتا تو دونوں بھائی ساتھ ساتھ جاتے! ایسے شفیق و مخلص بھائی کی موت کا اسلم صاحب کو جتنا بھی صدمہ ہوا ہو کم ہے! میں پُرسا دینے کے لیے اُن کے یہاں گیا تھا مگر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک ملتان ہی میں ہیں!

اسد مرحوم انتہائی فرض شناس اور بے تعذر سرکاری نوکر اور بڑے قابل دیانتدار اور مستعد عہدیدار تھے۔ پاکستان کو اس قابلیت اور سیرت و کردار کے افسر میسر آجائیں تو دفتری نظم و نسق آئینہ کی طرح مُجلّا ہو جائے! اوپر کے بڑے لوگ اسد صاحب کو جانتے تھے مگر اس شناسائی سے فائدہ اٹھانے کا خیال تک اُن کے دل میں نہیں آیا، حج کے موقعہ پر منیٰ میں مسٹر غلام محمد سابق گورنر جنرل نے اسد ملتانی مرحوم کو راستہ میں دیکھا تو اپنی کار میں بٹھا لیا اور انہیں لے جا کر سلطان سعود سے ملایا، اسد نے اس واقعہ کو نظم بھی کیا ہے!

اسد ملتانی کا مطالعہ غیر معمولی تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں، ملتان ان کا وطن اور مولد و منشا تھا مگر اردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ دلی اور لکھنؤ کے زباں دانوں سے وہ آنکھیں ملا کر اور سر افتخار بلند کر کے، زبان و محاورہ اور مصطلحات و روزمرہ پر گفتگو کر سکتے تھے، اردو اور انگریزی کا کس قدر پاکیزہ خط تھا۔ اردو تحریریں کتنی شُستہ اور دل کش و سادہ ہوتی تھیں! دفتری ملازمت کے بجائے اگر کوئی علمی ادارہ

ان کو سونپ دیا جاتا، تو اسد ملتانی کی قابلیت کے جوہر وہاں کھلتے!

اسد ملتانی بڑے نستعلیق آدمی تھے، شریف، وضعدار، مہذب اور مؤدب! انہوں نے بڑے معرکہ کی طویل مزاحیہ نظمیں کہی ہیں مگر گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے، بازاری مذاق کی انہیں ہوا بھی نہ لگی تھی، ہلکی اور گھٹیا بات ان کے منہ سے نکلتی ہی نہ تھی! صوم و صلوٰۃ کے پابند، دینداری ان کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے فدائی اور شیدائی، صوفیا کرام کے عقیدت مند مگر شرکت و بدعت سے کوسوں دور اور انتہائی بیزار! پاکستان کو کتاب و سُنت کی بنیاد پر صحیح اسلامی حکومت دیکھنے کے تمنائی! سابق جماعت اسلامی جن دنوں اسلامی دستور سازی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی، اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو آتی، تو بڑی خوشی کا اظہار کرتے!

ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں اسد ملتانی کی برسوں نظمیں چھپتی رہی ہیں، اس لیے اوروں کا کیا ذکر کیجیے، خود میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسد صاحب منکرینِ حدیث کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں مگر اُن سے ملنے کے بعد یہ غلط فہمی دُور ہوئی کہ وہ تو "انکارِ حدیث" کو دین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے ہیں اور سُنتِ رسولؐ کے دین میں حجت ہونے کا محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسٹر پرویز کے وہ بہت مخالف تھے اور شکوہ کرتے تھے کہ یہ شخص علامہ اقبالؒ کو اپنے مسلک کی تائید میں غلط طور پر پیش کرتا ہے۔

اسد ملتانی کو اپنے وطن ملتان سے بڑی محبت تھی اور ان کا اس طرف میلان تھا کہ شاہانِ ماسبق کے دَور میں شہر ملتان کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی، پاکستان میں بھی اس شہر کی وہی مرکزی حیثیت ہونی چاہیئے!

اسد ملتانی نے عاشقانہ غزلیں بھی کہی ہیں، جو شخص غزل کا ایسا مطلع کہہ سکتا ہو سے

رہیں نہ رِند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اُس کے کمالِ غزل گوئی سے کون انکار کر سکتا ہے! مگر انہوں نے اس انداز پر غزلیں کہنا بہت دنوں سے چھوڑ دیا تھا، ان کی شاعری دین و اخلاق کی ترجمان اور اسلام

کے مقدس پیغام کی حامل بن کر رہ گئی تھی۔ مقصدیت ہی مقصدیت ..... مگر تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ! فرماتے ہیں:-

کی فرنگی نے ترقی جو مسلماں بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

وہ ایک مصلح اور صاحب پیغام شاعر تھے! اُن کی شاعری میں زبان کی سادگی و سلاست، بندش کی چستی اور صفائی کے ساتھ گہرا سلوک اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے اعلامہ اقبالؒ سے وہ شدید متاثر تھے مگر اُن کی شاعری میں خود اپنا رنگ بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے! اسد ملتانی کے اُٹھ جانے سے اخلاق و شرافت اور شعر و ادب کو اتنا بڑا نقصان پہنچا ہے، کہ اس کی تلافی کے لیے ایک ایک شاعر پر نگاہ جاتی ہے، اور لوٹ آتی ہے! اللہ تعالیٰ اسد ملتانی کی قبر کو حجلۂ عروسی بنا دے کہ وہ "عروس" کی طرح قیامت تک چین کی نیند سوتے رہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے حصۂ وافر پائیں۔

(آمین ـــــ یارب العالمین ـــــ وغافر المذنبین)

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۶۰ء)

حضرت مولانا اطہر علی

انگریزی دَور کے بنگال کے علماء میں مولانا اطہر علی کا نام راقم الحروف نے اخباروں میں پڑھا تھا، اُن کی زندگی کے بارے میں کوئی نمایاں بات میرے علم میں نہ تھی۔ ناموں کے ساتھ "مولانا" کا لقب دیکھ کر اس طرف بھی خیال جاتا تھا کہ یہ صاحب واقعی عالمِ دین ہیں یا راقم الحروف کی طرح ان کو لوگوں نے "مولانا" بنا دیا ہے، خلافت اور کانگریس کی تحریکیں جب دورِ آغاز میں زوروں پر تھیں، اس وقت مولانا کا لقب بہت ارزاں ہو گیا تھا، کتنے بہت سے قومی ورکر جو عربی نہیں جانتے تھے "مولانا" کہلاتے تھے!

پاکستان بننے کے بعد کراچی میں مولانا اطہر علی سے جو پہلا تعارف ہوا تو پتہ لگا کہ صاحب موصوف خلافت اور کانگریس کے "دورِ مولانا ساز" کے مولانا نہیں ہیں بلکہ بہت بڑے عالمِ دین ہیں اور مشرقی پاکستان کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کراچی میں جب بھی وہ تشریف لاتے کہیں نہ کہیں اُن سے ملاقات ہو جاتی، اُن کی بزرگانہ شفقت نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

نظامِ اسلام پارٹی کی قیادت کے سبب اُن کی شخصیت بہت اہم سمجھی جاتی تھی۔ کراچی میں مرکزی وزیر نورالحق چودھری کی کوٹھی میں مولانا اطہر علی قیام فرماتے تو مولانا ظفر احمد انصاری کی معیت میں وہاں جانے اور اُن سے ملاقات کے مواقع ملتے رہتے۔ ۱۹۵۴ء میں جب راقم الحروف کو فریضۂ حج ادا کرنے کی توفیق وسعادت نصیب ہوئی تو مولانا اطہر علی بھی مکہ مکرمہ میں موجود تھے اس وقت حرم کی توسیع کا آغاز نہیں ہوا تھا، مدرسہ صولتیہ کا دفتر حرم شریف

سے ملحق تھا، وہاں ظہر کی نماز کے بعد مولانا اطہر علی اور مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم سے ملاقات اور بات چیت رہتی۔ فریضۂ حج کی یہ رفاقت نہ بھولنے والی رفاقت ہے۔

مولانا اطہر علی نے برسوں دارالعلوم دیوبند میں رہ کر وہاں کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کی، طالب علمی کے زمانے میں وہ ایک محنتی اور فرض شناس طالب علم سمجھے جاتے تھے۔ سلہٹ کے قریب کشور گنج میں مولانا مرحوم نے دینی مدرسہ کی بنا ڈالی جو رفتہ رفتہ دارالعلوم بن گیا۔ اس مدرسہ کی مشرقی پاکستان میں اچھی شہرت تھی۔ افکار و عقائد اور تعلیم و تنظیم کے لحاظ سے یہ بنگال کا مدرسہ دیوبند تھا۔ مولانا مرحوم نے برسوں مدرس کی حیثیت سے دینی علوم کی تعلیم دی اور سینکڑوں طلباء کو عالمِ دین بنا دیا۔ دیوبند میں رہ کر وہاں کے ماحول کا اتنا گہرا اثر قبول کیا تھا کہ مولانا اطہر علی لباس اور وضع قطع میں یو۔پی کے کسی قصبہ کے رہنے والے مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ پان کھانے کے بہت شوقین تھے اس لیے ہونٹوں پر پان کی سُرخی جھلکتی رہتی! مزاج میں عجلت اور تیزی نہیں سنجیدگی اور متانت تھی باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے۔ اُن کی اُردو تقریر عام فہم اور دل نشین ہوتی۔ اسلام اور پاکستان کے خیر خواہ اور فدائی۔ مشرقی پاکستان میں جب مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور اسلام اور پاکستان سے ربط و عقیدت کا اظہار جرم بن گیا تھا۔ مولانا اطہر علی مرحوم اپنی دینی روش اور پاکستان دوستی کے موقف سے بال برابر ادھر سے اُدھر نہیں ہوئے۔ لوگوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے اس آشوبِ قیامت میں مولانا مرحوم کو درخت پر اُلٹا لٹکایا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، پھر ڈیڑھ دو برس جیل میں قید کاٹنی پڑی، وہ اپنے موقف میں لچک پیدا کر لیتے تو ان اذیتوں سے محفوظ رہ سکتے تھے مگر اُن کا کردار بے لچک تھا اُن کی عزیمت و استقامت نے صاحبِ کردار حق پرست علماء کی تاریخ کو دُہرا دیا۔

مولانا اطہر علی مرحوم نے شیخ مجیب کے "بنگلہ دیش" کو تسلیم ہی نہیں کیا، وہ مرتے دم تک پاکستانی ہی رہے۔ یہاں تک کہ شیخ مجیب اور اس کے خاندان کی ہلاکت کے

ساتھ اُس کے اقتدار کو زندہ درگور ہونا پڑا۔ اور مولانا اطہر علی نے اپنے حق پسند موقف کی فتح اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

مولانا اطہر علی نے جیل سے چھوٹنے کے بعد اپنے دارالعلوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر جمع کیا، اس مدرسہ میں دینی تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی ہے ۔۔۔ مشرقی پاکستان کے حالات اب بہتر ہوتے جارہے تھے مگر مولانا کی پیرانہ سالی کو کام کرنے کی مزید مہلت قدرت کی طرف سے نہ دی جاسکی، اُن کی موت واقعی "موت العالم" کی مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۷ء)

اظہر امرتسری

مولانا اظہر امرتسری مرحوم کی ادب وصحافت کی خدمات بھی شاندار ہیں، اُن کی بعض تاریخی کتابوں نے اُردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر دیا ۔۔۔ اور میرے مخلص دوست محمد عالم صاحب مرحوم ایڈیٹر "عالمگیر" نے بھی اُردو پریس، اُردو اخبار، اردو رسالہ اور اردو پبلشنگ ہاؤس کے پروپرائٹر اور ناشر کی حیثیت سے پچیس سال تک خدمت کی، وہ معاملہ کے بہت کھرے اور صاف تھے۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں آخری بار کوئٹہ میں ملاقات ہوئی اور اب عالم ارواح ہی میں ملنا ہوسکے گا۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل 1951ء)

اعجاز صدیقی

۱۹۳۴ء میں جب راقم الحروف کا تعلق روزنامہ" مدینہ" (بجنور) سے تھا کو کسی صاحب نے مولانا سیماب اکبرآبادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے فرزند اعجاز صدیقی کم عمری میں اچھے خاصے شعر کہتے ہیں مگر اُن سے خط و کتابت کا آغاز کئی برس بعد ۱۹۳۹ء میں ہوا اور ان کا کلام بھی رسالہ" شاعر" میں نظر سے گزرا۔

۱۹۴۱ء میں جے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں راقم الحروف کو حیدرآباد دکن سے بلایا گیا۔ جے پور کے لیے کوئی ٹرین سیدھی نہیں جاتی تھی۔ آگرہ پر گاڑی تبدیل کرنا پڑتی تھی۔ میں نے اعجاز صدیقی کو خط لکھا کہ میں جے پور جانے کے لیے آگرہ ایک دن کے لیے اتروں گا، آگرہ سے جے پور کے لیے فلاں تاریخ کو سیکنڈ کلاس میں میری سیٹ ریزرو کرادیجیے۔ چنانچہ میں تاریخِ مقررہ پر آگرہ پہنچا، اعجاز صاحب نے میری نشست محفوظ کرادی تھی۔ ایک دن ان کا مہمان رہا۔ بڑی محبت اور عزت و احترام کے ساتھ میری خاطر مدارات کی۔ دوپہر کے کھانے میں سبز و تازہ چنوں کا (لونٹ) پلاؤ بہت فی الفور دار تھا۔

قصرالادب اور رسالہ" شاعر" کا تمام کام اعجاز صاحب سنبھالے ہوئے تھے منظر صدیقی مرحوم مولانا سیماب کے سب سے بڑے فرزند اور خوش گو شاعر تھے مگر وہ اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار نکالتے تھے اور والد اور بھائیوں سے الگ دوسرے مکان میں رہتے تھے۔ تعلقات میں تھوڑا سا کھچاؤ بھی محسوس ہوا۔

مولانا سیماب اور راقم الحروف ایک ہی کمپارٹمنٹ میں جے پور کے لیے روانہ ہوئے۔ پاکستان بننے تک اعجاز صدیقی سے مسلسل خط و کتابت رہی۔ میرا کلام اور مضامین رسالہ" شاعر" میں چھپتے رہے، خاص طور سے" شاعر" کی دی ہوئی طرح پر میں غزل ضرور کہتا، اُس دور کا اپنا ایک شعر درج کرتا ہوں۔

ستارہ صبح سو نہ جائے طلوعِ خورشید ہو نہ جائے
زمانہ کروٹ نہ لینے پائے کہ حسن ابھی خواب ناز میں ہے

تقسیم ہند کے بعد مولانا سیماب کراچی چلے آئے اور اعجاز صدیقی بھی آگرے میں نہ رہ سکے، انہوں نے بمبئی کو اپنا مستقر بنایا اور "شاعر" کو انتہائی ناسازگار حالات میں جاری رکھا مستقل مزاجی بڑی چیز ہے اس کی بدولت بڑے بڑے معرکے سر ہو جاتے ہیں۔

ماہنامہ "شاعر" پابندی کے ساتھ "فاران" کے تبادلہ میں آتا، میں کبھی کبھار کوئی غزل بھی بھیج دیتا۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر اور ترقی پسند شاعر سردار جعفری اور اسی مکتبۂ فکر کے دوسرے اہل قلم اور شاعروں سے اعجاز صدیقی کے خاصے گہرے تعلقات تھے، اور "شاعر" کو مستحکم اور مقبول بنانے میں ان تعلقات سے اعجاز صاحب کو فائدہ بھی پہنچا۔ میں نے انہیں ایک بار خط لکھا کہ آپ کے رسالہ میں ترقی پسندوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں اخلاق و روحانیت کی جھلکیاں دکھائی دیں، اعجاز صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کی طرح بننے کی سکت نہیں پاتا۔ میرے لیے بڑی مشکلات اور حالات کی نزاکتوں کا سامنا ہے، ان لوگوں سے تعاون ناگزیر ہے مگر میں بحمد اللہ مسلمان ہوں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے متعدد مقامات سے مشاعروں کی دعوت آئی مگر وہاں جانے کے لیے جی نہیں چاہا — اور برسوں

از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

پر عمل رہا۔ مگر ۱۹۵۸ء میں نخشب جارچوی مرحوم کے شدید اصرار پر بمبئی کے مشاعرے میں شرکت کی، اعجاز صدیقی مرحوم نے مجھے لکھا تھا کہ آپ میرے یہاں قیام کریں۔ میرا قیام تو نخشب جارچوی کے فلیٹ میں رہا، اعجاز صدیقی کے یہاں ایک دن دوپہر کا کھانا کھایا میں نے تاکید کر دی تھی کہ کھچڑی اور دہی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہونی چاہیے زیادہ سے زیادہ قیمہ کا اضافہ۔ اعجاز صدیقی کا فرستادہ آدمی مجھے ان کے یہاں لے کر گیا وہ مزدوروں اور غریب طبقہ کے محلہ میں بہت معمولی عمارت کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ کتنے ہی دوسرے فلیٹوں کا مشترک بیت الخلا تھا۔ ان کے کمرے میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں ایک طرف ان کی بیوی بیٹھی تھیں اور اس پردے نے جو پارٹیشن کر دیا تھا اس میں راقم الحروف نے کھانا کھایا، یہی "قصر الادب" اور ماہنامہ "شاعر" کا دفتر تھا، میں ان کے یہاں مہمان رہتا تو وہ مجھے کہاں ٹھہراتے۔ اس،

کمرے میں جو جگہ خالی تھی اُس میں رسالے رکھے تھے اور کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔

اعجاز صدیقی دو بار کراچی بھی تشریف لائے، مجھے بمبئی سے خط میں لکھا کہ کراچی میں آپ کے سوا میرا کون ہے؟ ۱۹۶۲ء میں اعجاز صدیقی نے ماہنامہ "شاعر" کا جشن منایا، اس سلسلہ میں پاک و ہند مشاعرے کا بھی اہتمام کیا۔ میں نے پہلے مدراس کے مشاعرے میں شرکت کی اُس کے بعد بمبئی آیا اور حکیم مرزا حیدر بیگ کے یہاں قیام کیا۔ "جشن شاعر" کا مشاعرہ خاصہ کامیاب رہا۔ مذاکرے میں میرا پروگرام نہیں تھا مگر بعض شاعروں اور ادیبوں کے اصرار پر میں نے دھواں دھار تقریر کی اور "ترقی پسند شعر و ادب" کی کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوائیں۔ میں نے کہا کہ "خدا کا انکار" ترقی پسندی نہیں بلکہ رجعت اور جہالت ہے۔ زبان و روزمرہ سے بے پروائی اور اخلاق پر طنز اور عریاں نگاری بھی ترقی پسندی نہیں ہو سکتی۔ آزاد شاعری اردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ میری تقریر ختم ہوئی تو علی سردار جعفری نے فرمایا۔

"ماہر صاحب! بہتر فرقوں کی طرح ہمیں بھی قبول کر لیجئے۔"

حکیم مرزا حیدر بیگ شاعروں کے قدردان تھے، میں نے اُن سے کہا کہ اعجاز صدیقی کمرے میں کیا ایک کھولی[1] میں رہتے ہیں، اُن کے لیے آرام دہ فلیٹ کا انتظام آپ جیسے قدردانِ شعر و ادب نہیں کرا سکتے؟ حکیم صاحب نے اس پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اعجاز صاحب کو پیشکش کی تھی — مگر وہ کہتے ہیں..... میرے "پوسٹ بکس" کا کیا ہوگا؟

اعجاز صدیقی انتہائی محنتی اور جفاکش شاعر و ادیب تھے، اپنی ذہانت اور ریاضت و مشقت کی بدولت انہوں نے ماہنامہ "شاعر" کو ہندوستان کا باوقار اور مقبول ماہنامہ بنا دیا۔ اُن کی ایک نظم پر صوبائی حکومت نے پانچ ہزار کی رقم انعام میں دی تھی۔ نثر و نظم پر وہ یکساں قدرت رکھتے تھے، ہندوستان کے شاعروں میں اعجاز صدیقی کو ممتاز مقام حاصل تھا، اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہندوستان میں جب بھی وہ ریل سے سفر کرتے تو مولانا سیماب کے شاگرد اور خود اعجاز صدیقی کے

(LATRINE)

[1] بمبئی میں کوٹھڑی کو کھولی کہتے ہیں جس میں نہ باورچی خانہ ہوتا ہے اور نہ لیٹرین۔

عقیدت مند اسٹیشنوں پر اُن کا خیر مقدم کرتے اور پھولوں کے ہار پہناتے۔ اُن کے ہر سفر میں رسالہ "شاعر" کو نئے خریدار مل جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اعجاز صدیقی کے مالی حالات اب بہت اچھے ہو گئے تھے اُن کو کشادہ اور آرام دہ فلیٹ بھی مل گیا تھا ان کے لڑکے لکھ پڑھ کر ملازمتوں کی معقول تنخواہ پاتے تھے۔ "شاعر" اب کثیر الاشاعت مقبول ماہنامہ تھا۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کی کتابیں بھی فروخت ہوتیں۔ اعجاز صدیقی مرحوم کی کوشش سے "سیماب اکیڈمی" قائم ہوئی اور صوبہ بمبئی یا مرکزی حکومت سے کئی ہزار کی سالانہ امداد بھی ملنے لگی تھی ان کی خوشحالی اور شہرت و عزت کی خبروں سے مجھے دلی مسرت ہوتی۔

ایک دن صبح کو اخبار پڑھا تو اعجاز صدیقی کے ایکا ایکی انتقال کی خبر نظر سے گزری اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ اس سانحہ کا سان گمان بھی نہ تھا اس لیے احساسات و جذبات پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُردو کی خدمت کے لیے ہندوستان میں اُن کی ضرورت تھی مگر کیا کیا جائے مشیت کو یہی منظور تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۸ء)

اعظم ہاشمی

اعظم ہاشمی مرحوم سے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ملاقات ہوئی مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں اُن کا اکثر و بیشتر آنا جانا رہتا، وہاں اُن سے ملاقات ہوتی رہتی، سُرخ روس کے انقلاب اور اشتراکی اقتدار نے نہ جانے کتنے ترکستانی مسلمانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کردیا۔ اعظم ہاشمی مرحوم بھی انہی مظلوم مہاجرین میں شامل تھے! غیر منقسم ہندوستان میں وہ انتہائی بے سر و سامانی کی حالت میں وارد ہوئے، ترکستان میں اُن کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ اُن کا فکر اور کردار خالص دینی تھے۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جماعت اسلامی کے مرکز پٹھان کوٹ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس چلے گئے اور وہاں کئی سال رہے، مولانا موصوف کی ہم نشینی، صحبت اور دارالسلام پٹھان کوٹ کے ماحول نے اُن کے دینی افکار و خیالات کو اور نکھار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا اُن پر خاص فضل تھا کہ گھر سے بے گھر ہونے کے بعد بھی پردیس میں دینی فضا میسر آئی۔

کراچی میں برسوں سے اُن کا تعلق محکمہ ریڈیو کی ترکستانی نشریات سے تھا، اپنے اس فریضہ کو وہ پابندیٔ وقت، دیانت، فراست و بصیرت اور اخلاص کے ساتھ انجام دیتے۔ آمدنی اتنی کہ گھر کے خرچ کا بڑی مشکل سے پورا پڑتا تھا، لباس بہت معمولی مگر کسی کے دست نگر نہیں رہے جو مل گیا اسی پر قناعت۔ فروتنی اور کسر نفسی اُن کی زندگی کا تابناک رُخ تھا۔ کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تو ذمہ دارانہ انداز میں ایک ایک لفظ کو تول کر زبان سے ادا کرتے۔

اعظم ہاشمی مرحوم نے ترکستان کے خونیں انقلاب اور اپنی ہجرت کے واقعات کو خاصی تفصیل سے قلمبند کیا۔ اُن کے یہ مضامین سب سے پہلے اردو ڈائجسٹ نے شائع

کیے، پھر دوسرے رسالوں اور اخباروں میں نقل کیے گئے۔ یہ مضامین روسی ترکستان میں مسلمانوں کی تباہی اور اشتراکی انقلاب کی اسلام دشمنی اور چنگیزیت کی معتبر دستاویز سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ خود کن مصیبتوں سے جان ہتھیلی پر رکھ کر ترکستان سے ہندوستان پہنچے ہیں اور کن دشواریوں اور خطروں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ تفصیل بھی بڑی عبرت انگیز ہے ان کی مادری زبان ترکی تھی مگر وہ اردو تحریروں میں ایک مشاق ادیب نظر آتے ہیں۔ جن دنوں ان کے مضامین کا سلسلہ شائع ہو رہا تھا اُن کو ریڈیو اسٹیشن سے مکان آتے ہوئے زخمی کیا گیا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ مگر ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ کہیں اعظم ہاشمی مرحوم کے مضامین اس قاتلانہ حملے کا سبب نہ ٹھیرے ہوں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اعظم ہاشمی کئی ہفتے صاحبِ فراش رہنے کے بعد پھر اچھے ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر زخموں کے نشان میں نے بھی دیکھے تھے۔ اس سانحہ کے بعد اُن کی عزیمت میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا۔

کئی سال ہوئے ان کی لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ خداداد کالونی میں ان کا مکان تھا، وہاں مہاجر ترکی علماء کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اُن کی نشست و برخاست میں کس قدر وقار اور اُن کے چہروں پر کتنا نور تھا۔ ایک ترکی عالمِ دین نے نکاح کا خطبہ اس دلکش انداز میں پڑھا کہ سننے والے جھومنے لگے۔ شادی میں لذیذ کھانے بڑے سلیقہ کے ساتھ چنے گئے۔ کھانا لانے اور رکھنے میں کسی قسم کی بھاگ دوڑ اور چیخ پکار نہیں! دین آدمی کو سلیقہ بھی سکھاتا ہے!

دو مہینے ہوئے جب اخبارات سے معلوم ہوا کہ انہیں کینسر ہو گیا ہے، اسی مرض میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے —— اعظم ہاشمی اپنی ذات سے دینی کردار کا اچھا نمونہ تھے، نیک اعمال کی وافر زادِ راہ وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ غفرلہ اللہ تعالیٰ!

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۲ء)

مولانا افتخار احمد بلخی

مولانا افتخار احمد بلخی سے پاکستان بننے اور کراچی آنے کے بعد ہی ملاقات ہوئی، وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے، برسوں کی رکنیت کے بعد پھر علیحدہ ہو گئے مگر اختلافات کے باوجود بعض مفرورین کی طرح جماعت کے درپے آزار نہیں رہے، محتاط انداز اور نرم لہجہ میں کبھی کبھار کسی اختلاف کا ذکر فرماتے، مولانا بلخی مرحوم نے معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے سبقاً سبقاً درس نظامی پڑھا تھا۔ ان کی پوری زندگی درس و تدریس میں گزری، کراچی میں بعض کالجوں سے وابستہ رہے پھر کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں لیکچرار کی پر اُن کا تقرر ہو گیا، وہاں تنخواہ بھی معقول تھی اور آخر میں اُن کے مالی حالات اطمینان بخش ہو گئے تھے۔ ریڈیو سے ان کی تقریریں برسوں خاصی تعداد میں نشر ہوتی رہیں، ان کی تقریریں اور درس پسند کیے جاتے تھے۔ مگر اب تین چار برس سے اس میں خاصی کمی آگئی تھی!

شگفتہ قلم مصنف اور مترجم تھے، "فتنۂ انکارِ حدیث کا پس منظر" بڑے معرکہ کی کتاب لکھی فتنۂ انکارِ حدیث کے رد میں یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ راغب الطباخ کی عربی کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا جس کی پہلی جلد "تاریخ افکار علوم اسلامی" کے نام سے معارف اسلامیہ (کراچی) نے شائع کی، دوسری جلد چھپ رہی ہے۔ یہ کتاب اسلامی افکار و علوم کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کوئٹہ کے مولانا عبدالعزیز مرحوم نے پہلی جلد کے ترجمہ کی نظر ثانی فرمائی اور پھر وہ مجھے دیکھنے کے لیے دی گئی میں نے کہیں کہیں قلم لگایا۔ ایک دن راقم الحروف نے پروفیسر خورشید احمد اور مولانا بلخی مرحوم کو اپنے یہاں بلا کر تفصیل سے بتایا کہ میں نے جن لفظوں اور جملوں کو بدلا ہے اُن کے کیا اسباب و وجوہ ہیں، ترجمہ کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ مولانا بلخی مرحوم اپنے تمام علم و فضل کے باوجود مجھ ہیچمدان اور کم سواد کی باتیں غور و توجہ سے سنتے رہے۔ یہ اُن کی حق پسندی اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل تھی۔ دو سال ہوئے علامہ تمنا عمادی کو لے کر غریب خانہ پر تشریف لائے اور بڑی پر لطف علمی گفتگو رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ علامہ تمنا عمادی کے مسودات کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے۔ "فاران" میں مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میری فرمائش کو کبھی نہیں ٹالا، اور بعض اوقات میری فرمائش کے بغیر ہی کوئی مقالہ بھیج دیا کرتے۔

اس سال حج کی سعادت انہیں نصیب ہوئی، مگر مکہ معظمہ میں بیمار پڑ گئے اور اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے، خوش قسمت تھے کہ حرم کی مقدس سرزمین اُن کا مدفن و مرقد قرار پائی۔[1] (ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۴ء)

---

[1] اور الحمدللہ یہ خوش قسمتی خود مولانا ماہر کے حصے میں بھی آئی (مرتب)

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

علی گڑھ کی نمائش میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے سب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا تھا، یہ غالباً سن ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے نمائش میں مسلم یونیورسٹی کا جو کیمپ لگتا تھا، وہاں شب کے کھانے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی نے مجھے مدعو کیا، دوسرے پروفیسر صاحبان سے بھی ملاقات ہوئی، ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم بھی اس دعوت میں شریک تھے!

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مسلم یونیورسٹی کی لیکچراری چھوڑ کر کراچی چلے آئے اور کئی سال تک سندھ مسلم کالج کے پرنسپل رہے، یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے! انہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ کام کیا، کراچی کے اونچے حلقوں میں اُن کی بڑی عزت تھی!

تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے تمام خطوں میں صرف اردو مشاعرے ہوا کرتے تھے، اردو مشاعروں کے توڑ پر "کوی سمیلن" کی بنیاد ہندوؤں نے ڈالی۔ ہر صوبہ کے مسلمان اُردو سے محبت کرتے تھے، اردو کے مقابلہ میں کسی علاقائی زبان کی رقابت اور ہمسری کا وہم تک کسی مسلمان کے دل میں نہیں آتا تھا۔ کراچی میں بھی پاکستان بننے سے پہلے بڑے معرکہ کے مشاعرے ہوئے ہیں۔ پیر الٰہی بخش صاحب جو اُن دنوں سندھ کی صوبائی حکومت میں وزیرِ تعلیم تھے، ایک بار تمام شعراء ان کے مہمان رہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں کراچی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہا تھا اور ڈاکٹر امیر حسن صدیقی رخصت پر کراچی سے علی گڑھ آرہے تھے۔ دہلی ریلوے جنکشن پر اُن سے ملاقات ہوگئی۔ بڑی گرم جوشی سے ملے اور اس کا افسوس ظاہر کیا کہ مشاعرے کے دنوں میں وہ کراچی سے باہر ہوں گے ـــــ مگر دوسرے سال اس کی تلافی ہوگئی، کراچی میں بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے شاعروں کو اپنے یہاں

دعوت میں بلایا۔

۱۹۴۷ء میں پھر مشاعرہ ہوا، مہینہ تو یاد نہیں رہا، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز ہو چکا تھا، میں دلی سے کراچی ریل میں آیا تھا مگر واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی، ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ سندھ کے نامور ادیب پیر حسام الدین راشدی اور مشہور قومی کارکن جناب محمد امین کھوسو نے ہوائی اڈے پر راقم الحروف کو " خدا حافظ " کہا۔

حضرت جگر مراد آبادی، روش صدیقی اور راقم الحروف کو رائل ہوٹل میں مشاعرے والوں نے ٹھہرایا تھا۔ پھر سیٹھ محمد گلزار صاحب اپنے مکان واقع سرائے روڈ میں مجھے لے آئے، یہاں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لے آئے ان کے ساتھ جناب حسن محمود (سابق وزیر اعظم بہاولپور) بھی تھے، جو ان دنوں غالباً کراچی میں تعلیم پا رہے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کسی نہ کسی دعوت، جلسہ یا تقریب میں ملاقات ہوتی رہتی، جمعیتہ الفلاح میں کوئی ادبی جلسہ یا قومی تقریب ہوتی تو راقم الحروف کو خاص طور سے یاد فرماتے، کئی بار جمعیتہ الفلاح کے نعتیہ مشاعرے کی صدارت کے لیے راقم الحروف کو نامزد کر دیا۔

سندھ مسلم کالج کی پرنسپلی سے ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کی علیحدگی صوبائی عصبیت کا شاید پہلا شکار تھا۔ پھر انہوں نے اسلامیہ کالج کی بنا ڈالی مگر کالج کے سرپرست ایم اے قریشی سے اختلاف ہو گیا۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اسلامی میں ان کا تقرر ہوا اور کم و بیش پندرہ سولہ برس ملازمت کرنے کے بعد جب پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہیں تو یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اسلامی کے صدر تھے۔

ڈاکٹر صاحب برسوں سے دل کے مریض تھے مگر ان کے اندر کام کرنے کی غیر معمولی لگن اور تڑپ پائی جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں، دل کا دورہ پڑا، گولی کھا کر چند منٹ کے لیے بیٹھ گئے اور افاقہ ہوتے ہی پھر کام شروع کر دیا۔ چہرے سے مریض معلوم ہوتے تھے مگر آواز میں تندرست آدمیوں کی آواز سے زیادہ توانائی تھی۔

جمعیۃ الفلاح کی شاندار عمارت اور اس ادارے کا استحکام اور ترقی ڈاکٹر صاحب کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جمعیۃ الفلاح کے انگریزی آرگن "وائس آف اسلام" میں کئی کئی ہزار روپیہ ماہوار کے اشتہارات انہی کے رسوخ و اثر سے ملتے تھے جمعیۃ الفلاح کی خدمات انہوں نے کسی معاوضہ یا الاؤنس کے بغیر انجام دیں۔ اس معاملے میں وہ بڑے محتاط اور ایثار پسند تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں گیارہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سے کئی کتابوں کا اردو ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ پاکستان سے باہر کے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں بھی ایک دوبار انہیں توسیعی لیکچر دینے کے لیے بلایا گیا ——— علم، فکر، تقریر و تحریر اور مطالعہ میں ان کے اندر انتظامی صلاحیت اور کام کرنے کی انرجی زیادہ پائی جاتی تھی ——— قومی فنڈ کی فراہمی کے معاملہ میں وہ دوسرے مولانا شوکت علی تھے۔

اسلام، ملت اور پاکستان سے انہیں غیر معمولی شغف تھا، اسلام اور پاکستان کی خیرخواہی اور عقیدت و محبت ان کے ریشہ ریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ تین شادیاں کیں مگر بے اولاد رہے۔ جمعیۃ الفلاح ان کی معنوی یادگار ہے جو ان کے نام کو زندہ رکھے گی۔

کراچی یونیورسٹی کے قبرستان میں ڈاکٹر صاحب کو جگہ ملی، جنازے میں وائس چانسلر، پروفیسروں اور لیکچراروں کی خاصی بڑی تعداد شریک تھی، علمی اور دینی حلقوں میں ان کے سانحۂ ارتحال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۷۲ء)

پیر الٰہی بخش

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے، ان دنوں راقم الحروف حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ بنگلور کے ایک تجارت پیشہ دوست کے شدید اصرار پر بمبئی جانا پڑا۔ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے دو افسروں سے جو میرے شناسا تھے اُن صاحب کی سفارش کی، کئی ہزار ٹن مونگ پھلی وغیرہ کی سپلائی کا معاملہ تھا مگر کام بنا نہیں۔ بمبئی سے چل کر کان پور اور لکھنؤ میں مشاعرے پڑھے پھر چند دن وطن میں قیام کیا اور وہاں سے دلی آیا۔

انہی دنوں کراچی میں اردو کانفرنس اور مشاعرہ ہونے والا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے کارکن صلاح الدین صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ کراچی کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے ہامی بھر لی۔ میں نے اپنے ساتھی شاعروں سے کہا کہ راستے میں ٹھہرتے اور سیر کرتے ہوئے کراچی چلیں گے۔ صابر دہلوی، ظریف دہلوی اور راقم الحروف دلی سے چل کر لاہور پہنچے۔ وہاں ایک دن سیر و تفریح کی، پھر ہم راستے میں سکھر اُترے، ہم نے تانگہ والے سے کہا کہ سکھر بیراج جانا چاہتے ہیں، اس نے ہمیں سرکس کے دروازے پر جا کر اُتار دیا۔ تانگہ والے کی اس حرکت پر غصہ سے زیادہ ہنسی آئی۔ ایک دن سکھر میں رہے، پہاڑی پر جو ایک بزرگ کی قبر ہے وہاں فاتحہ پڑھنے گئے تو مجاور سے تلخ کلامی کی نوبت آ گئی اور ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ سکھر کے بعد دوسری منزل حیدرآباد کا قیام تھا۔ پھر ہم کراچی پہنچے اسٹیشن پر منتظمین مشاعرہ اور بعض معززینِ شہر نے استقبال کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے محمد میراں شاہ مرحوم جو اُن دنوں سندھ اسمبلی کے اسپیکر تھے پلیٹ فارم پر موجود تھے اُن کی گردن میں کارتوسوں کی پیٹی اور پستول لٹکا ہوا تھا۔

پیر الٰہی بخش اُن دنوں محکمہ تعلیم کے وزیر تھے، باہر سے آنے والے شعراء انہی

کے مہمان تھے۔ ایک کوٹھی میں شاعروں کو ٹھیرایا گیا، دو نوکر اور باورچی ہماری خاطرداری کے لیے متعین تھے۔ باورچی شاعروں کی فرمائش پر طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرتا، کھانے پینے کی دوسری چیزوں اور مسالوں کے ساتھ زعفران اور بید مشک بھی باورچی کی تحویل میں رہتا۔ چار پانچ دن بڑے لطف اور عیش و تفریح میں بسر ہوئے۔ خمار بارہ بنکوی بھی ہمارے ساتھ ٹھہرے اور روش صدیقی مرحوم بھی! شاعروں نے ہیرا پھیری سے سرود و نغمہ کا لطف بھی اٹھایا مگر روش صاحب ان صحبتوں میں شریک نہیں رہے۔

اردو کانفرنس کا خطبۂ استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے پیر الٰہی بخش مرحوم نے پڑھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس برات کے دُولھا تھے۔ کانفرنس ہر اعتبار سے کامیاب رہی مگر مشاعرہ کامیاب تر رہا۔ پیر صاحب سے روزانہ ملاقات ہوتی، انھوں نے شاعروں کے ساتھ بڑی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتے دیا کہ وہ وزیر ہیں اور ہم شعراء عام آدمی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے ہر صوبہ کے مسلمان اردو زبان کو دل و جان سے چاہتے تھے اور اردو زبان کو صوبائی زبانوں کا حریف اور مدِ مقابل نہیں سمجھتے تھے ہر جگہ صرف اردو کے مشاعرے ہوتے تھے۔ پنجابی، سندھی اور گجراتی مشاعروں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ کراچی کے علاوہ سندھ کے شہروں میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم تھیں مگر سندھی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کوئی ادارہ نہیں تھا اور ہو بھی تو وہ مشہور نہ تھا۔ کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں غالبؔ اور اقبالؔ کے نام پر بزم اور انجمنیں قائم تھیں مگر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام پر نہ کوئی درسگاہ تھی نہ بزم و انجمن تھی نہ کوئی سڑک اُن کے نام سے منسوب اور مشہور تھی۔ انگریزی حکومت نے کسی شاعر اور ادیب کے پروپیگنڈے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کی کافیاں سندھ کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہت مقبول تھیں مگر سندھ کے باہر اُن کی شہرت اور تعارف نہ تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے شاہ صاحب کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت حجاب میں کیوں رہی جو کتابیں اور مضامین حضرت شاہ بھٹائیؒ پر آتے رہتے ہیں اُن سے ایسا لگتا ہے جیسے شاعرانہ عظمت کے علاوہ ولایت و روحانیت اور تصوف و طریقت میں بھی وہ مولانا رومؒ کے ہم پلّہ ہیں۔ مثنوی مولانا روم کی مدح و توصیف میں

بہت مشہور شعر ہے :

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں درزبان پہلوی

چنانچہ شاہ بھٹائی صاحب کی شاعری کے بارے میں بھی کہا گیا کہ وہ سندھی زبان کا قرآن ہے ۔ یہ تمام انکشافات تقسیم ہند کے بعد ہوئے ہیں ۔ کوئی شک نہیں شاہ لطیف بھٹائی سندھی زبان کے شاعر اعظم ہیں اور اُن کا کھلے دل سے احترام کرنا چاہیئے مگر شعروادب کے مسائل میں یونیورسل وسعت خیال کی ضرورت ہے ۔ ہم اس تصور سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم کسی شاعر کو صرف اس لیے منظر عام پر لائیں کہ وہ ہماری زبان اور وطن کا شاعر ہے اور کسی دوسرے شاعر کو اس وجہ سے گھٹائیں کہ وہ غیر زبان کا شاعر ہے اور ایک دوسرے خطہ سے تعلق رکھتا ہے ! شعروادب پر صوبائی عصبیت کی چھاپ تنگ نظری ہے ۔

کراچی کے مشاعروں میں شرکت کے لیے راقم الحروف کا آنا ہوتا تو پیر حسام الدین راشدی صاحب کے یہاں چلتے پانی اور کھانے کی پرتکلف دعوتیں رہتیں ۔ ہم دونوں کا خاصہ وقت ایک دوسرے کی معیت میں گزرتا ۔ ۱۹۴۶ء کے آخر یا ۱۹۴۷ء کے آغاز میں راقم الحروف کراچی سے دلی ہوائی جہاز سے گیا تو اُس دن صبح سے شام کے چار بجے تک پیر حسام الدین راشدی صاحب اور سردار محمد امین خاں کھوسو (مرحوم) کا ساتھ رہا ۔ ان دونوں حضرات نے ہوائی اڈے تک مشایعت کی زحمت گوارا فرمائی ۔

اُردو کالج اور انجمن ترقی اردو جس عمارت میں ہیں ، یہ ہندوؤں کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔ پیر حسام الدین صاحب کی کوششوں سے یہ وسیع اور شاندار عمارت انجمن ترقی اردو کو الاٹ ہوئی ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے پیر صاحب کو بڑی عقیدت تھی اور پیر صاحب کو بھی مولوی صاحب بہت چاہتے تھے ۔ دو تین بار مولوی صاحب کراچی میں پیر راشدی صاحب کے یہاں مہمان رہے ۔ اس زمانے میں پیر صاحب موصوف اردو زبان کے شیدائی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کے انتہائی قدردان تھے ۔ وہ خود اردو زبان کے محقق ادیب ہیں اور اردو ہی کے ذریعہ انہیں شہرت اور عزت ملی ، اور دولت بھی ! مگر گزشتہ سات آٹھ برس سے اُن کا رویہ اردو زبان کے ساتھ بیگانگی اور غیریت کا رویہ رہا ہے اور اس میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے ۔ فکرونگاہ کی یہ تبدیلی

ایک معمہ ہی نہیں المیہ بھی ہے ۔ اور اُن کے ہم قدیم نیاز مندوں کے لیے اس کا جو غم ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ۔ برسوں کے شدید صبر و ضبط کے بعد دل کی خلش کے کاغذ پر منتقل ہونے کی نوبت آئی ۔

ذکر تھا پیر الٰہی بخش مرحوم کا، مگر ایک دوسری ہی داستان چھڑ گئی ۔ تقریر و تحریر میں کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ داستان موضوع سے اس لیے غیر متعلق نہیں ہے کہ پیر الٰہی بخش مرحوم نے اپنے دورِ وزارت میں اردو کے لیے بہت کچھ کیا ۔ کراچی کی جو عمارت جناب پیر حسام الدین راشدی کی سعی اور جد و جہد سے انجمن ترقی اردو کو ملی تھی، اس میں پیر الٰہی بخش کی مدد بھی شامل تھی !

پاکستان بننے کے بعد پیر صاحب مرحوم سے راقم الحروف کو بارہا دعوتوں اور جلسوں میں دیکھنے اور ملنے کے مواقع میسر آئے مگر میں اپنے بارے میں مبالغہ آرائی کا عادی نہیں ہوں، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ پیر الٰہی بخش مرحوم سے میرے گہرے روابط اور دوستی تھی اُن سے میری بس جان پہچان تھی ! ۱۹۴۹ء میں پیر صاحب مرحوم حکومت سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے، سید علی مقصود صاحب جو بدایوں کے مشہور ایڈووکیٹ اور بدایوں میونسپلٹی کے برسوں صدر رہے تھے، کراچی تشریف لائے ۔ پیر صاحب جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے تو سید علی مقصود صاحب اور وہ یکی بارک کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے ۔ پیر صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا، نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے مرحوم باپ سید قمر مقصود اور اُن کے بڑے بھائی علی مقصود صاحب اور راقم الحروف وزیر اعلیٰ صوبہ سندھ کے آفس میں پہنچے، چائے کے ساتھ پُر تکلف لوازمات سے تواضع کی گئی اور نصف گھنٹہ بات چیت رہی ۔

حکومت سندھ کی سیاسیات میں بڑے مد و جزر آتے رہے ہیں، پیر الٰہی بخش مرحوم کو بھی وزارت اعلیٰ سے دست کش ہونا پڑا اُس کے بعد وہ پھر اقتدار سے ہمیشہ کے لیے ریٹائر بلکہ یوں کہیے محروم ہو گئے ۔ انگریزی دور سے لے کر پاکستان بننے کے بعد تک تقریباً مسلسل چودہ برس تک پیر الٰہی بخش صاحب اقتدار میں رہے ہیں، وہ صاحب خیر اور مرنجان مرنج حاکم تھے جب وہ صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے تو بعض مفسدوں نے سندھ میں بھائی چارے اور اتفاق و اتحاد کی فضا کو مکدر کرنے کی کوشش کی ۔ اس عصبیت کا توڑ کرنے کے

لیے "مہاجر سندھی بھائی بھائی" کا نعرہ فضا میں گونجنے لگا۔ میں نے کراچی کے جلسہ میں خود پیر الٰہی بخش کی زبان سے یہی نعرہ سنا اور تمام مجمع نے پرجوش آواز میں پیر صاحب کی لے میں لے ملا دی۔

پیر الٰہی بخش نیک نام وزیر تھے، دیانت دار اور فرض شناس! سیاست کے چھل بٹے انہیں نہیں آتے تھے، اُن کی زمینداری اوسط درجہ کی تھی، رہن سہن شریفانہ تھا، پیر الٰہی بخش کالونی میں اُن کی کوٹھی تھی، اس میں "بزم سیماب" کے مشاعرے اور جلسے بھی ہوتے تھے۔ پیر صاحب نماز روزے کے پابند تھے اور اُن کے گھرانے کا ماحول دینی ماحول تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونے کی سکت نہیں رہی تھی، بس کبھی کبھار اخباروں میں اُن کا کوئی بیان چھپ جاتا۔ اُن کی موت نے سندھ کی سیاست و حکومت کے ایک باب کے آخر میں "تمت بالخیر" رقم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔
(آمین)

ماہنامہ فاران، دسمبر ۱۹۷۵ء

اقبال شوقی

گزشتہ چند ہفتے "ایام الحزن" تھے۔ کئی شاعر اللہ کو پیارے ہو گئے! شورش کاشمیری، شیوا بریلوی، شوقی اور شوق مراد آبادی۔ ان سب کے ناموں کا آغاز "ش" سے ہوتا ہے۔ آغا شورش اپنی ذات سے سیاست وصحافت، تقریر وتحریر اور شاعری کا دبستان تھے۔ شیوا بریلوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ شیوا بیان شاعر تھے۔ نعت رسولؐ سے خاص شغف تھا۔ پیرانہ سالی اور خرابی صحت کی وجہ سے آخری عمر میں ہوش وحواس میں اعتدال نہیں رہا تھا۔ منظہر جلیل شوق مراد آبادی کم وبیش ستر برس سے شعر کہہ رہے تھے۔ رہن سہن، نشست وبرخاست اور لباس میں بڑا سلیقہ اور نفاست پائی جاتی تھی۔ روش صدیقی مرحوم ان کے داماد تھے۔ پیرانہ سالی میں بیٹی کی بیوگی کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حکیم اشرف احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ مشہور استاد شاعر حضرت بیخود دہلوی کی نواسی اُن کو بیاہی تھیں، اُن کی غزلیں سوز وگداز سے لبریز ہوتی تھیں۔ گجرات کے رہنے والے مگر اردو زبان پر دلی اور لکھنؤ والوں کی طرح قدرت تھی۔ برسوں سے بیمار تھے۔

جناب اسمٰعیل احمد مینائی کی زبانی اطلاع ملی کہ ہسپتال میں حکیم اشرف صاحب کی حالت غیر ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اس تشویشناک اطلاع کے تیسرے دن منظہر جلیل شوق مراد آبادی کی تدفین کے بعد پاپوش نگر کے گورِ غریباں سے واپس ہو کر ناظم آباد کی مسجد میں اقبال شوقی کے جنازے کی نماز پڑھی۔

اقبال شوقی اقتصادیات کے ایم۔ اے تھے۔ میاں محمد امین میاں محمد بشیر کی کمپنی میں قلیل تنخواہ سے ترقی کر کے اس فرم کے جنرل منیجر ہو گئے۔ تنخواہ ومنصب کی اس ترقی میں اُن کی دیانت، فرض شناسی اور خیر پسندی شریک تھی۔ بڑے کنبہ پرور اور سیر چشم تھے۔ دینداری اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور ان تمام مکروہات سے متنفر جو مغربی فیشن کے لوازم سمجھے جاتے۔ حج کے بعد ڈاڑھی بھی رکھ

لی جس سے چہرہ نورانی ہو گیا!

شاعری میں رباعی کی صنعت سے شغف رکھتے تھے، سینکڑوں رباعیاں کہیں جو دو مجموعوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ "فاران" میں مرحوم کی رباعیات کے پہلے مجموعہ پر تبصرہ آیا تو راقم الحروف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ دوسروں کی زبانی معلوم ہوا کہ قدرے کبیدہ خاطر ہیں۔ اس کے بعد کی ملاقاتوں میں وہی پہلے کی طرح دوستی کی روش اور ہنسی خوشی کی باتیں! مرنے سے تین چار ماہ پہلے اپنے بہنوئی منجمی صاحب کے یہاں شعر و سخن کی محفل میں جو رباعیاں اقبال شوقی مرحوم نے سنائیں وہ خوب سے خوب تر تھیں۔ زمانے اور وقت کی گریز پائی اور سرعت رفتار پر ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ کہا ہے مگر اقبال شوقی نے جو رباعی سنائی وہ فکر و خیال کے اعتبار سے اچھوتی تھی۔ رباعی کا آخری مصرعہ یاد رہ گیا ہے:-

(.......وقت وہ چیز ہے.......)

آنے نہیں پاتا کہ گزر جاتا ہے

عمر پچپن کے لگ بھگ ہوگی، دراز قد، گداز بدن، صحت معتدل مگر جب وقت آ گیا تو ایک سانس کی مہلت مل نہ سکی۔ غفرلہٗ۔

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۵ء)

حضرت امجد حیدرآبادی

اب سے تقریباً ۳۳ سال پہلے حیدرآباد دکن میں حضرت امجد کو میں نے دیکھا تھا، یا یوں کہیے اُن سے سرسری ملاقات ہوئی تھی، پھر دکن کے پندرہ سالہ قیام میں مرحوم سے بارہا نیاز حاصل ہوا، مگر دوسرے معروف شعراء سے جو میرے روابط تھے، اُن کے یہاں آنا جانا اور بے تکلفی رہتی تھی اس کے مقابلہ میں امجد مرحوم سے ملنا بہت ہی کم رہا، اُن کے مکان پر جانے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا، اور میرا غریب خانہ بھی ان کے قدم سے محروم رہا! بات یہ تھی کہ حضرت امجد مشاعروں، پارٹیوں اور دعوتوں میں شاذ و نادر ہی جاتے تھے۔ اُن کے مزاج کو اس قسم کے تفریحی ہنگاموں سے مناسبت نہ تھی، دکن کے امراء میں شعراء کا سب سے زیادہ جمگھٹا سر مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم کے یہاں رہتا تھا، اور اس دربار میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید ایک بار میں نے حضرت امجد کو دیکھا تھا!

امجد مرحوم کے سب سے زیادہ قدر شناس سر اکبر حیدری مرحوم تھے۔ امجد کی ملازمت کا تعلق دفتر صدر محاسبی سے تھا، اور سر اکبر حیدری فنانس کے وزیر تھے انھوں نے حضرت امجد کو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کئی ترقیاں دیں۔ انھی دنوں یہ بھی سننے میں آیا کہ سر اکبر حیدری امجد مرحوم سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر جایا کرتے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں جے پور میں بڑی دھوم کا آل انڈیا مشاعرہ ہوا، ملک کے مشاہیر شعراء کا ایسا اجتماع پھر کم ہی دیکھنے میں آیا۔ سر تیج بہادر سپرو کے داماد رائے بہادر امرناتھ اٹل اس مشاعرے کے صدر تھے۔ دکن سے حضرت فانی بدایونی، حضرت امجد اور راقم الحروف اس مشاعرے میں شریک ہوئے، امجد مرحوم کے دوست جناب

آزاد حیدر آبادی بھی اُن کے ہمراہ تھے، جو اکبر الہٰ آبادی کے رنگ میں اصلاحی اور طنزیہ نظمیں کہتے تھے۔

حضرت فانی بدایونی کو آگرے میں اترنا تھا اس لیے وہ کئی دن پہلے روانہ ہو گئے، حضرت امجد آزاد اور میں نے ایک ہی ٹرین سے سفر کیا، اسی ٹرین سے سر اکبر حیدری دلی تشریف لے جا رہے تھے۔ حیدر آباد دکن سے آگرہ کینٹ تک حضرت امجد کا سفر سر اکبر حیدری کے سیلون میں رہا، آگرہ چھاؤنی پر ٹرین صبح سویرے پہنچی، جھٹ پٹے کا وقت تھا، سر اکبر اپنے سیلون سے اُتر کر بکنگ آفس پہنچے اور وہاں سے جے پور کا ٹکٹ حضرت امجد کے لیے خرید کر لائے۔

جے پور میں تین دن حضرت امجد مرحوم کا ساتھ رہا، اس مدت قیام میں تکدر و ناگواری کی کوئی ذرا سی بات بھی ہمارے درمیان پیش نہیں آئی، حضرت امجد کا برتاؤ بزرگانہ بلکہ مشفقانہ ہی رہا، مرحوم مشاعروں کے مرد میدان نہ تھے، اتنے بڑے مشاعرے میں شعر خوانی کا پہلا موقعہ تھا ان کا نام پکارا گیا، اور جب وہ ڈائس پر پہنچے ہیں تو پیشانی پسینہ میں ڈوبی ہوئی تھی، مشاعرے میں اُن کے کلام کی انفرادیت محسوس بلکہ پسند کی گئی، تمام شاعروں سے ان کا رنگ ہی جُدا تھا!

حضرت امجد مرحوم کے کردار کی نمایاں خصوصیت اُن کی شانِ استغنا تھی، ہر حال میں خوش اور فارغ! ۱۹۰۸ء میں بلدۂ حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں قیامت کی طغیانی آئی، ہزاروں آدمیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے، آدھی رات کے بعد جو پانی چڑھنا شروع ہوا ہے تو صبح ہوتے ہوتے سینکڑوں گھروں کا صفایا ہو گیا، امجد مرحوم بھی اپنے گھر والوں سمیت پانی کے ریلے میں بہہ گئے، مگر اس طوفانِ اجل اور آشوبِ قیامت سے بچنا قسمت میں لکھا تھا، ایک درخت پر چڑھ کر جان بچائی، لیکن ماں، بیوی، بیٹی اور چند دوسرے افرادِ خاندان اس طغیانی کی بھینٹ چڑھ گئے، اس صدمۂ جانکاہ نے امجد مرحوم میں ربودگی، وارفتگی اور جذب کی سی کیفیت پیدا کر دی، جو آخر وقت تک ان کے مزاج میں رہی! اس زیاں میں نفع کا پہلو بھی نکل آیا، اُن

کا دل اس قدر ٹوٹا کہ اس کا گداز شاعری میں جاکر سوز بن گیا۔

امجدؔ مرحوم صوفی منش شاعر تھے، شاعروں کی عام زندگی کے برخلاف پاکیزہ زندگی رکھتے تھے، مذہبیت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، غزلیں اور نظمیں بھی کہیں، اُن کی نعتیہ غزل، جس کا مطلع ہے ؎

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں　　دُنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں

خاصی مشہور ہے، مگر طبیعت کو سب سے زیادہ مناسبت "رباعی" سے تھی، فرماتے ہیں:

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی　　جو کچھ بھی ہوا ہوا خدا کی مرضی
امجدؔ ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں　　ہر "کیوں" کی ہے انتہا خدا کی مرضی

حضرت ابوسعید ابوالخیر، خیامؔ، جامیؔ اور سرمدؔ کی رباعیوں اور ابن یمینؔ کے قطعات سے امجدؔ کی رباعیوں میں کہیں کہیں استفادہ تو نظر آتا ہے، مگر اُن کا آہنگ اِن مشاہیر سے مختلف ہے! امجدؔ کی رباعیوں میں حکمت پائی جاتی ہے "حکیم الشعرا" کا خطاب اُن کے لیے سب سے پہلے مولانا سید سلیمانؔ ندوی مرحوم نے تجویز کیا تھا، مگر اس خطاب کو عوام و خواص کی تائید اور قبول حاصل ہوا۔ "حکیم الشعراء" کا لقب امجدؔ کو سچ مچ زیب دیتا تھا، انھوں نے اپنی شاعری میں حکمت و معرفت کو سمو دیا ہے، اُن کے کلام میں: — قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید — کی کیفیت نظر آتی ہے۔

حضرت امجدؔ نے طویل عمر پائی، زندگی کی تراسی (۸۳) بہاریں دیکھیں، ان کے زمانے میں شعر و سخن میں کیسے کیسے انقلابات آئے مگر وہ اپنی روش پر جمے رہے اور یہ دلیل ہے اُن کی خود اعتمادی اور حقیقت شناسی کی!

زندگی سادہ اور تکلّف سے پاک تھی، زبان میں قدرے لکنت تھی مگر لکنت کے وقت ان کی زبان سے لفظوں کی تکرار بھلی لگتی تھی، حیدرآباد دکن میں چند سال قبل "جشنِ امجدؔ" منایا گیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے کمال کے اعتراف اور فن کی قدر شناسی کی ایک جھلک بھی دیکھ لی — اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو شبنمِ رحمت سے تر و تازہ اور شاداب رکھے اور شفاعت و مغفرت کے سدا بہار پھول ان کو نصیب ہوں۔ (آمین)۔　　(ماہنامہ فاران، مئی ۱۹۹۱ء)

اے، ڈی، اظہر

سنہ ۱۹۵۱ء[1] میں جناب فضل کریم فضلی مشرقی پاکستان میں محکمہ تعلیمات کے سیکرٹری تھے، ان کے زیر اہتمام بڑے دھوم کے مشاعرے ڈھاکے میں ہوئے۔ ایک مشاعرے کی صدارت کرزن ہال میں سر فیروز خان نون گورنر مشرقی پاکستان نے کی۔ بنگال کے تمام مسلمان علماء اور لیڈر اُردو میں تقریریں کرتے تھے، بازاروں میں اردو رسم الخط میں بورڈ لگے ہوئے، کئی اردو روزنامے اور ماہنامے ڈھاکہ سے نکلتے تھے، اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو اپنوں اور غیروں کی سازش کے ذریعہ کاٹ دیا جائے گا، مہاجرین بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے جائیں گے اور دُنیا کی اس عظیم زبان (اردو) کو مشرقی پاکستان سے دیس نکالا ملے گا!

؎ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

اس پاک و ہند مشاعرے میں جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے (یا دوسرے سال) بھارت سے جگر مراد آبادی، روش صدیقی، فنا کان پوری، اور جگن ناتھ آزاد بھی شریک ہوئے۔ چاٹگام سے ٹیلی فون آیا کہ یہاں بھی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ ٹیلی فون مسٹر اے، ڈی، اظہر کا تھا جو ان دنوں محکمہ ریلوے میں فنانس ایڈوائزر تھے۔ پہلی بار ان کا نام سُنا! تیسرے یا چوتھے دن ملتان میں بھی مشاعرہ تھا۔ مشہور مزاحیہ نگار سید محمد جعفری مسٹر اے، ڈی اظہر سے کبیدہ خاطر تھے۔ انہوں نے ملتان کے مشاعرے کی شرکت پر زور دیا کہ اپنے دوست صابر دہلوی کا معاملہ ہے۔ میرا دل چاٹگام جانے کو چاہتا تھا مگر ادیب سہارنپوری، ظریف جبل پوری اور راقم الحروف، جعفری صاحب کا منشا پا کر چاٹگام نہیں گئے، دوسرے دن صبح کے ہوائی جہاز سے پرواز کر کے سہ پہر کے وقت لاہور پہنچے۔

---

[1] برسوں پہلے کے واقعات کے سنین لکھنے میں حافظہ سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ ہر جگہ "غالباً" لکھنا ٹھیک نہیں لگتا۔

اُن دنوں لاہور اور کراچی سے آتے جاتے، کلکتہ اور دلی پر ہوائی جہاز اترتا تھا، دلی کے ہوائی اڈے پر ہمارا جہاز گھنٹہ سوا گھنٹہ چکر لگاتا رہا، ہوا بہت تیز تھی۔ اترنے میں خاصہ خطرہ تھا مگر پھر خدا خدا کر کے پائیلٹ نے جہاز کو اتار ہی دیا۔ ملتان پہنچ کر پتہ چلا کہ وہاں کا مشاعرہ ایک ہفتہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا جو شعراء چاٹگام گئے تھے وہ وہاں مشاعرہ پڑھ کر ملتان کے مشاعرے میں بھی شریک ہوئے۔

کراچی کے مشاعروں میں ادبی نشستوں اور دعوتوں میں اسے، ڈی اظہر سے ملنے کے مواقع ملتے رہے۔ نخشب جارچوی مرحوم سے اُن کا خاصہ یارانہ تھا، نخشب کے یہاں دعوتوں میں خوب لطف اور دکن کی اصطلاح میں گمتؔ رہتی تین چار بار اظہر مرحوم نے شام کی چائے اور رات کے کھانے پر بلایا۔ اُن کے یہاں کتابوں کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی، فرنیچر لندن سے لائے تھے، دورِ وکٹوریہ کے ڈیزائن کی کرسیاں، الماریاں اور مسہریاں جو بہت سبک وحسین پائیدار اور دیدہ زیب تھیں۔

جس طرح تاثیر مرحوم کا نام محمد دین تھا مگر ایم۔ ڈی ان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا، اسی طرح اظہر مرحوم کا نام احمد دین تھا۔ انگریزی دور کے (A. D. AZHAR) پاکستان میں بھی اسی نام سے جانے پہچانے گئے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا، انگریزی کے انشاء پرداز، فارسی اور عربی میں بھی درک رکھتے تھے، نیم مزاحیہ شاعر، بعض اوقات مزاح کا رنگ تیز ہو جاتا۔ اردو کے فدائی اور شیدائی! فرمایا کرتے تھے کہ پنجاب میں جو کوئی اردو کی جگہ پنجابی زبان کے لانے کا داعیہ رکھتا ہے۔ اس کی خبر میں لوں گا، آپ حضرات اس محاذ کو میرے لیے چھوڑ دیں۔ مذہب سے بھی فکری لگاؤ تھا "فاران" بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور جب بھی ملتے میری تحریروں کا تحسین آمیز انداز میں ذکر کرتے۔ میں بھی خاصا باتونی (TALKATIVE) ہوں مگر اسے، ڈی اظہر کی چرب زبانی اور طول کلامی کے آگے میری زبان، بولنے کی حسرت میں تلملا کے رہ جاتی۔ ایک لطیفہ کے بعد دوسرا لطیفہ اور ایک واقعہ کے ختم ہوتے ہی فوراً کوئی قصہ چھیڑ دیا، آواز خاصی کڑاکے دار کہ نیا آدمی سنتا تو سہم کر رہ جاتا۔ ایک بار عجیب بات کہی کہ قرآن کریم میں جو "...... یلج الجمل فی سم الخیاط" آیا ہے تو مفسرین "جَمَل" سے اونٹ مراد لیتے ہیں مگر یہ دراصل "جُمَّل" ہے جس کے معنی موٹے رسے کے ہیں۔ اس پر

اُن کی اور میری بڑی گرماگرم بحث رہی۔ میں نے عرض کیا کہ اونٹ کے سوئی کے ناکے سے نکلنے میں جو ناممکن العمل[1] اعجوبگی ہے وہ "رسے کے نکلنے" میں نہیں ہے۔ کئی بار اردو الفاظ اور محاوروں پر بحث ہوئی تو نوبت تلخی تک آگئی۔ اپنی بات پر جمے رہنے ہوا اور اسے صحیح ثابت کرنے میں وہ سیر تو میں سوا سیر۔ بعض اوقات دو ڈھائی سیر! لیکن پھر دوسری ملاقات میں پہلے کی طرح بے تکلفی اور دوستانہ انداز میں ملتے۔

میں نے حیدرآباد دکن کے ایک صاحب کی سفارش کی تو امیدوار سے سعی سفارش کا وعدہ فرمالیا مگر کچھ ہوا ہوا یا نہیں۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد وہ صاحب میرے پاس پھر آئے اور اپنی بے روزگاری اور پریشانی کی داستان سنائی۔ میں نے زیادہ زوردار خط لکھا، اس میں ایک آدھ فقرہ شکوہ آمیز بھی تھا۔ مرحوم نے کوشش کر کے ان صاحب کو الیکٹرک کمپنی میں پانسو روپیہ ماہوار کی ملازمت دلوادی۔ یہ اُن کے صاحب خیر ہونے کی دلیل تھی۔

اے، ڈی اظہر شعبۂ مالیات کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ غیر ممالک میں ٹریڈ کمشنر اور شعبۂ مالیات کی خدمات انجام دینے کے بعد گے، ڈی، اے میں چیف اکاؤنٹنٹ کی خدمت بھی اُن سے متعلق رہی، پھر وہ اردو ترقیاتی بورڈ لاہور کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "لذتِ آوارگی" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔

کئی شادیاں کیں، اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی، تمام بیٹے بڑے بڑے عہدوں پر فائز و متمکن ہیں۔ کئی برس ہوئے انہیں فالج ہوگیا تھا، علاج معالجہ کے بعد چلنے پھرنے لگے مگر پوری طرح افاقہ نہیں ہوا۔ بعض اوقات بات کرنے میں زبان الجھ جاتی ——! عمر ستر سے کچھ اوپر ہی ہوگی اُن کی وفات[2] آدبی حلقوں میں ایک سانحہ کی طرح محسوس کی گئی۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۴ء)

---

[1] فارسی کا "نا" آنے کے سبب غلط ترتیب ہے مگر اردو میں اس طرح بولتے ہیں۔
[2] تقسیم ہند کے پانچ چھ سال بعد اُن کا انتقال پاکستان میں ہوا کسی بنک کی شاخ کے منیجر تھے۔

خان بہادر بدرالدین

شاید چودہ سال ہوئے ہوں گے، انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں ایک نہایت ہی دُبلے پتلے شخص نے ملنے میں خود ہی پہل کی اور اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام بدرالدین ہے! آپ کے "فاران" کو بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھتا ہوں، پھر انہوں نے کراچی سے دس میل دُور ملاری پور کے فوجی علاقے میں چائے پر بلایا لیکن مجھے کوئی ضروری کام نکل آیا، اُن کی دعوت میں نہ جاسکا، دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس انداز میں ملے کہ مجھے معذرت کا موقعہ ہی نہیں ملا، اُن کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شکوہ و شکایت کا دفتر کھول دیتا، اس کے بعد پھر دعوت کا دن مقرر ہوا، اُن کے صاحبزادے یا داماد پاکستان فضائیہ میں اُن دنوں فلائٹ لفٹنٹ تھے، اُن کے فلیٹ میں شام کو چائے نوشی ہوئی اور ڈیڑھ دو گھنٹہ خان بہادر صاحب مرحوم سے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا۔

وہ اکثر بیمار رہتے تھے، اپنی نوازش اور محبت سے "فاران" کے دفتر میں بھی دو تین بار تشریف لائے، اور سہ منزلہ عمارت پر چڑھنے کی زحمت برداشت کی، سات آٹھ برس سے وہ اپنے ذاتی مکان واقع ناظم آباد میں منتقل ہو گئے تھے، مکان کا نام "الصدف" رکھا تھا، وہاں میں کئی بار گیا، ایک بار بیماری کی خبر پاکر مزاج پرسی کے لیے پہنچا، تو اس حالت میں دیکھا کہ مسہری پر نیم بیہوشی کی حالت میں لیٹے تھے اور ڈاکٹر انجکشن لگانے کے لیے رگ تلاش کر رہا تھا! پھر وہ اچھے ہو گئے!

اُردو زبان کے شیدائی تھے، دینداری میں اپنی آپ مثال! توحید کے معاملہ میں بڑے حساس اور غیرت مند! فرماتے تھے کہ علماء دیوبند جو شرک و بدعت کے مٹانے والے ہیں، اُن کے یہاں بھی غلبہ تصوف کے سبب توحید بے غبار نہیں رہی—! "تصوف" کے بہت مخالف تھے! ناموں کے ساتھ چشتی، قادری اور سہروردی کی نسبتیں بھی انہیں پسند نہ تھیں! میں تصوف کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نرمی سے کام لیتا،

تو سخت احتساب کرتے اور کئی کئی صفحے کے خط لکھتے! اکثر فرمایا کرتے کہ مولانا مودودی کی تحریروں میں بے غبار توحید ملتی ہے، مگر ان کے نام پر اعتراض تھا، میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ جس طرح مولانا آزاد کا نام تو محی الدین تھا "ابوالکلام" اپنی کنیت انہوں نے خود رکھی ہے، یہ معاملہ "ابوالاعلیٰ" کا نہیں ہے یہ ان کے والد کا رکھا ہوا نام ہے، مولانا مودودی کے دو بھائیوں کے نام ابومحمد اور ابوالخیر ہیں۔

"فاران" کے بڑے قدر دان تھے، اپنے کسی عزیز کو جو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جج تھے "فاران" کا خریدار بنوایا، اور اپنے داماد حبیب احمد صدیقی صاحب کو جو یوپی میں کمشنر تھے، "فاران" کے پرچے بھجوائے!

خان بہادر بدرالدین صاحب انگریزی دور کے بنگال میں محکمہ تعلیم کے انسپکٹر تھے، پھر وہ ڈھاکہ ہائی کورٹ کے رجسٹرار ہو گئے، ان کی کارکردگی، قابلیت، ایمان داری اور فرض شناسی کے انگریز حکام تک معترف تھے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے اچھے انشا پرداز تھے، ۱۹۱۴ء میں ایک کتاب "فتح قسطنطنیہ" لکھی، جس پر مشاہیر نے بڑے اچھے تبصرے کیے، اور اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحق مولف تفسیر حقانی اور مولانا شبلی جیسی نامور شخصیتوں نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور تعریف و تحسین کی!

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم سے ٹیلی فون پر آخری بار بات چیت اب سے سال سوا سال پہلے ہوئی تھی، اس کے بعد ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی، قومی زبان کے "بابائے اردو نمبر" (۱۹۶۶ء) میں ان پر ایک مضمون پڑھ کر، ان کے انتقال کا علم ہوا، یہاں کے اخباروں میں ایک سطر بھی ان کے بارے میں میری نظر سے نہیں گزری، حالانکہ وہ اس کے مستحق تھے کہ ان پر چند سطری رسمی شذرے نہیں مضامین اور مقالے لکھے جاتے! ہماری صحافت بھی زیادہ تر "فلم زدہ" ہو کر رہ گئی ہے!

خان بہادر بدرالدین جیسے لوگوں کو دیکھنے کے لیے، آئندہ نسلوں کی آنکھیں ترسا کریں گی! اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور اور آخرت کو فوز و فلاح سے ہمکنار بنائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۶ء)

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

حضرت مولانا بدر عالم مرحوم کی مشہور کتاب "ترجمان السنہ" میں پڑھ چکا تھا، یہی کتاب ان کے تعارف کا سبب قرار پائی، اُن سے ملاقات کا شرف مدینہ منورہ میں حاصل ہوا، بڑی محبت سے ملے، تصوف اور اقامتِ دین کے موضوع پر اُن سے کئی صحبتوں میں طویل گفتگو رہی، اُن کا طرزِ کلام دل نشین اور مدلل ہوتا تھا، بعض الجھنیں اُن کے وعظ و تلقین اور افہام و تفہیم سے دور ہوئیں۔ اُن کے بعض علمی نکات سے مجھے اختلاف بھی تھا، مگر اُن کے خلوص و محبت اور بزرگانہ شفقت کے آگے میں سپر انداختہ ہو گیا اور اپنے اختلاف کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

مولانا مرحوم نے ایک دن چائے پر مدعو فرمایا، انتہائی خوش ذائقہ چائے اس کے لوازم بھی ذائقہ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے، مکان میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ نظر آتا تھا۔ تولیہ سے لے کر سیلابچی تک ہر چیز مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے سلیقہ، خوش ذوقی اور نفاست طبع کا مظہر تھی۔ مولانا پاکستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اقامہ (شہریت کا اجازت نامہ) جو سعودی حکومت میں بڑی دشواری اور سعی و سفارش سے ملتا ہے، وہ انہیں مل گیا تھا۔ افریقہ کے کروڑپتی تجار مولانا مرحوم کے عقیدت مند تھے، مدینہ منورہ میں مولانا بڑی آسودگی اور خوشحالی کے ساتھ رہتے تھے۔ بیوی بچے ان کے ہمراہ تھے، معاش کی طرف سے وہ بالکل بے فکر تھے۔

مولانا بدر عالم نور اللہ مرقدہٗ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد تھے۔ فتنۂ انکارِ سنت کی روک تھام کے لیے انہوں نے "ترجمان السنہ" لکھ کر بہت بڑا دینی کارنامہ انجام دیا، جس کے سبب دینی حلقوں میں وہ ہمیشہ متعارف رہیں گے۔ انگریزی بھی ایف۔اے تک پڑھی تھی، مطالعہ خاصا

وسیع تھا، تصوف سے خاص شغف تھا، یہاں تک کہ وہ خود صاحب نسبت اور شیخ طریقت تھے، مدینہ منورہ سے جس دن میں رخصت ہونے لگا ، اس دن مسجد نبوی کے دروازے کے قریب مل گئے۔ میں نے عرض کیا :

" مولانا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں مقامات پر غفلت ہی طاری رہی۔"

اس پر انہوں نے فرمایا :

" میاں! جو کچھ مل گیا، اُسے غنیمت سمجھو۔"

اُن کے ان لفظوں نے مجھ گنہگار کی بڑی ڈھارس بندھائی، دل و دماغ میں مسرت و اطمینان کی عجیب لہر دوڑ گئی! الفاظ نشتر بھی ہوتے ہیں اور مرہم بھی !

مولانا بدر عالم مرحوم کئی سال سے صاحب فراش تھے۔ پچھلے مہینہ (اکتوبر ۱۹۶۵ء) اخبار " جنگ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور دنیا کی قدر ناشناسی پر افسوس ہوا کہ اتنے بڑے آدمی کی موت پر اخباروں میں ایک سطر بھی کسی نے نہیں لکھی۔

(ماہنامہ " فاران" دسمبر ۱۹۶۵ء)

بسمل سعیدی

یہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے جب میں حیدرآباد دکن میں اقامت پذیر تھا، اُسی زمانے میں بسمل سعیدی سے خط و کتابت کا آغاز ہوا، مراسلت میں پہل انہی کی جانب سے ہوئی۔ اُن کے خاصے طویل خط آتے، رسالوں میں راقم الحروف کا کلام پڑھ کر بسمل سعیدی میرے شعروں کی تعریف فرماتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے میری "مسلسل غزل" کا یہ شعر :-

شراب ناب کی موجیں بھی شرمائی سی جاتی ہیں
تری رفتار ساقی! پھر تری رفتار ہے ساقی!

اپنے گرامی نامہ میں درج کیا اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا لیکن اُن کی تعریف و ستائش کے باوجود میرا اپنا یہ شعر میری نگاہ میں اوسط درجے سے قدرے کم ہی رہا۔ ۱۹۳۷ء میں جب راقم الحروف کا پہلی بار ریاست ٹونک میں جانا ہوا اور مشاعرے کے بعد ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم اپنے ہمراہ چند شاعروں کو شکار میں لے گئے تو وہاں سے واپسی پر بسمل سعیدی نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہز ہائی نس کی معیت میں شاعروں کے علاوہ اور کون تھا؟ میں نے ساتھیوں کی تعداد اور صاحبزادگان کا حلیہ بتایا تو اس پر بسمل صاحب نے تڑپ کر میرا یہ شعر پڑھا :-

شراب ناب کی موجیں بھی شرمائی سی جاتی ہیں
تری رفتار ساقی! پھر تری رفتار ہے ساقی!

اب میں سمجھا کہ اُن کو میرا یہ شعر اتنا پسند کیوں تھا؟ بعض اوقات شعر کی پسندیدگی کا تعلق پڑھنے اور سننے والے کے شخصی حالات اور ذاتی مشاہدات و محسوسات اور جذبات سے بھی ہوتا ہے۔

اُن دنوں جناب بسمل سعیدی ہز ہائی نس کے معتوب تھے وہ نواب صاحب کی

ڈیوڑھی کے مشاعروں اور دوسری تقریبات میں شریک نہیں ہوئے۔ ملک مجید (سابق پرنسپل انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ حکومت پاکستان) اس زمانے میں ٹونک کے مجسٹریٹ تھے۔ بسمل صاحب سے ملک مجید کے خاصے گہرے تعلقات تھے۔

۱۹۴۴ء تک بسمل سعیدی مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، ان کے ایک منظوم کتابچہ پر میں نے "مقدمہ" بھی لکھا تھا۔ مرحوم کا نام محمد علیمی تھا تخلص بسمل! وہ اپنے نام کے ساتھ "بسمل ہاشمی" لکھا کرتے تھے، پھر نہ جانے کس نسبت و تعلق سے وہ "بسمل جوشی" لکھنے لگے۔ جوش ملیح آبادی سے اپنی عقیدت و نیاز مندی کا اظہار انہوں نے مراسلت یا گفتگو میں مجھ سے نہیں کیا۔ مگر اس نسبت کا امکان بھی ہو سکتا ہے لیکن سال سوا سال کے بعد پھر انہوں نے "جوشی" کی جگہ "بسمل سعیدی" لکھنا شروع کر دیا اور اسی نام اور نسبت سے مشہور ہوئے۔

دوسری بار ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف کا ٹونک جانا ہوا، آگرے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا، اور اسی شب میں مشاعرہ! نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم کی تقریر شب میں گیارہ بجے کے قریب ختم ہوئی اس کے بعد مشاعرے کی نوبت آئی۔ شعر خوانی کا یہ اجتماع بہت تاخیر سے شروع ہوا مگر توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ مشاعرہ پڑھ کر صبح سویرے آگرہ سٹی اسٹیشن سے صابر دہلوی مرحوم اور میں ٹونک کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک دوست کی ملازمت کی سفارش کے لیے ٹونک کا یہ سفر اختیار کرنا پڑا، ٹونک کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہوا، ہز ہائی نس کے طبیب خاص حکیم ظہیر میاں کی دعوت کے بعد جناب بسمل سعیدی کے یہاں شعر خوانی اور کھانے کا پروگرام تھا۔ بسمل صاحب کے باورچی خانہ سے میرے سامنے ایک ڈھکی ہوئی پلیٹ آئی۔ جسے کھولا تو اس میں زندہ پرند نکلے۔ یہ بے ضرر قسم کا مزاح لطف انگیز رہا۔

چند مہینے بعد بسمل سعیدی نے ٹونک میں مشاعرے کا اہتمام کیا، جناب شعری بھوپالی کی مشہور غزل کا یہ مصرعہ ؎

ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

طرح قرار پایا۔ میں دلی سے چل کر ٹونک آیا، مجھے دیکھ کر فرطِ مسرت سے بسمل سعیدی نے اپنی سائیکل زمین پر پھینک دی اور "قلقاری" مار کر مجھ سے لپٹ گئے۔

صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں کی کوٹھی میں شعرا کو ٹھیرایا گیا تھا، وہاں سے مشاعرہ گاہ پون میل سے کیا کم ہوگی، جاڑے کی وہ شدت کہ میں سویٹر، اس پر گرم شیروانی، شیروانی پر جیسٹر پہنے ہوئے تھا اور اوپر سے کمبل اوڑھ رکھا تھا، مگر ہوا کے سرد جھونکے جو تھے تیر بنے جا رہے تھے۔ ہم سب شاعر پیدل چل کر مشاعرہ گاہ میں پہنچے، ریاست ٹونک کے کسی صاحبزادے یا رئیس[1] کی شاندار لمبی چوڑی حویلی سامعین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھے اور سامعین کی گرم سانسوں نے مشاعرہ گاہ کو "ایرکنڈیشنڈ" بنا دیا تھا، مشاعرہ اتنا کامیاب رہا کہ ایسے کامیاب مشاعرے شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ داد و تحسین کا وہ شور کہ جیسے ڈیوڑھی کی چھت اڑ جائے گی جناب بسملؔ اپنے شاگردوں کو غزل پڑھتے ہوئے اشاروں کے ذریعہ ہدایت دیتے رہے مثلاً ان کے کسی شاگرد کے پانچ چھ شعروں پر خاصی داد ملی۔ ابھی غزل پوری نہیں ہوئی تھی کہ حضرت بسملؔ کے اشارہ کرنے پر اُن کا شاگرد غزل تمام کیے بغیر تخت سے نیچے اتر آیا۔ بسمل صاحب کے یہ اشارے بڑے نفسیاتی، استادانہ اور رنگِ محفل کے مطابق تھے! رات بھر مشاعرہ جاری رہا، فجر کی نماز کے لیے آدھا گھنٹہ کا وقفہ ہوا اور پھر شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شعر و سخن کے ایسے شیدائی اور فدائی کسی شہر اور قصبہ میں مشکل ہی سے نکلیں گے! دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تو ہز ہائی نس نواب صاحب ٹونک مشاعرہ گاہ میں تشریف لائے، اُن کے آتے ہی مجمع سنجیدہ اور مؤدب ہو گیا۔

ٹونک میں راقم الحروف کا قیام چار پانچ دن رہا، حضرت بسملؔ نے راقم الحروف سے فرمایا کہ ریاست ٹونک کے قاضی صاحب تمہیں دعوت میں بلائیں گے، وہ مجھ پر کفر کا فتویٰ داغ چکے ہیں، تم اُن کی دعوت کو کسی حیلے سے ٹال جانا۔ چنانچہ یہی ہوا قاضی صاحب کے محکمہ کے ایک اہلکار ان کا دعوت نامہ لے کر آئے۔ میں نے دعوت میں شرکت کے لیے عذر کیا۔ وہ اصرار کرتے رہے جب اُن صاحب نے دیکھا کہ میں دعوت میں جانے کی کسی عنوان حامی نہیں بھر رہا ہوں تو قاضی صاحب کے وہ آزردے بولے:

"ماہر صاحب! مشاعرے کی طرحی غزل میں آپ کا مطلع[2] معمولی تھا مگر شاعر کے

---

[1] ہز ہائی نس کے خاندان والوں کا لقب!

[2] یہی ہے زندگی اپنی یہی ہے بندگی اپنی ۔۔۔ کہ تیرا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

لیے بم کا گولہ تھا۔۔۔۔۔۔"

اُن کی اس ہجوِ ملیح کا میں نے دل ہی دل میں خوب لطف لیا۔

وڈنک میں ایک دعوت۔ جناب بسمل کے بھائی حکیم یحییٰ میاں کے یہاں بھی ہوئی ان کے یہاں سواری کے لیے گھوڑا تھا، بیلوں کا تانگہ، مرغوں، بطخوں اور کبوتروں کے لیے کابکیں اور پختہ ڈربے! دوا سازی اور گھر کے کام کاج کے لیے نوکر بھی! عجیب ستم گری تھی کہ ایک بھائی طب کے طفیل اتنا خوشحال اور دوسرا بھائی شاعری کی بدولت مفلوک الحال!

نواب ممتاز الدولہ مکرم علی خاں پہاسو ضلع بلند شہر کے رئیس اور ریاست جے پور کے جاگیردار تھے۔ اُن کے پردادا نواب فیض علی خاں اور دادا نواب سر فیاض علی خاں ممتاز الدولہ ریاست جے پور میں کم از کم چالیس پچاس برس وزیر اعظم رہے ہیں۔

"ممتاز الدولہ" نواب مکرم علی خاں مرحوم کا موروثی خطاب تھا۔ نواب صاحب کو شاعری کا بہت شوق تھا، اُن کی سالگرہ پر ہر سال مشاعرہ ہوتا، سالگرہ کے علاوہ بھی نواب صاحب موصوف صابر دہلوی اور راقم الحروف کو اپنے یہاں بلاتے رہتے! ایسا بھی ہوتا کہ ہم دونوں اجمیر شریف یا وڈنک کے مشاعرے سے دلی جاتے ہوئے جے پور اترے اور نواب صاحب نے کئی دن اپنے یہاں مہمان رکھا!

جناب بسمل سعیدی کا میں نے نواب صاحب سے ذکر کیا کہ بلند پایہ نغز گفتار شاعر ہیں۔ پورے راجستھان میں اُن کی ٹکر کا کوئی شاعر نہیں ہے! نواب ممتاز الدولہ نے کئی بار بسمل صاحب کو اپنے یہاں بلایا، وہ تنہا نہیں آتے تھے عام طور پر درد سعیدی یا کوئی دوسرا شاگرد اُن کے ہمراہ ضرور ہوتا، صابر دہلوی نے مجھ سے شکایت کے لہجہ میں کہا:

"ماہر! یہ تو نے کیا کیا، ہماری فتوحات میں بسمل صاحب کو حصہ دار بنا لیا۔۔۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا، کچھ کہتا تو بات بڑھ جاتی، اس لیے کہ میں اس انداز پر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک بار نواب ممتاز الدولہ بہادر کی شہر کی ڈیوڑھی میں سالگرہ کا جشن برپا تھا ساز و موسیقی کا بھی اہتمام تھا، بسمل صاحب نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھا اُن کی آنکھوں میں ڈورے آ گئے تھے، وہ میرے قریب آ کر بولے:

"ماہر! ان (نواب صاحب) کے پاس دو دو! اور ہمارے پاس ایک بھی نہیں۔"

میں بسمل صاحب کے قریب سے ہٹ کر ذرا دور چلا گیا کہ نواب صاحب نے بسمل صاحب کی یہ طنز سُن لی تو رنگ میں بھنگ پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ان دنوں دلی میں مجسٹریٹ تھے۔ شاعروں اور فنکاروں کے سچے قدردان! اُن سے بھی بسمل سعیدی کا ذکر آیا، میں نے کنور صاحب کو بسمل صاحب کے چند اشعار سنائے۔ کنور صاحب شعر سُن کر بڑے متاثر ہوئے بے ساختہ داد دی اور جھومنے لگے ـــــ بسمل صاحب کا پھر دلی آنا جانا شروع ہوگیا اور تقسیم ہند کے بعد تو وہ ٹونک سے دلی میں آکر بس گئے۔

پاکستان آنے کے بعد ماہ اپریل ۱۹۴۹ء میں "فاران" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ بسمل صاحب کی خدمت میں یہ شمارہ بھیجا گیا، اُن سے کچھ دنوں خط وکتابت بھی رہی۔ کبھی کبھار اپنی تازہ غزل بھی "فاران" کے لیے عنایت فرما دیتے۔ مگر پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُن کی صاحبزادی اسما ان دنوں مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھیں، وہ مجھے ایک دو مہینہ کے وقفہ سے خط لکھتی رہتیں۔ ان کے خطوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اسلام کے حجاب و حیا کے تقاضوں سے واقف ہیں، میں اسماء سعیدی کو مناسب انداز میں اسلامی اخلاق کی طرف توجہ دلاتا رہتا۔ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے غالباً ایم اے اور شاید پھر دلی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کیا! مگر اب پردہ نشینی کی حدیں ٹوٹ چکی تھیں بسمل صاحب بہت جذباتی اور رومان پسند شاعر تھے وہ اولاد کی تربیت کے معاملے میں متساہل ہی رہے۔ مسلمانوں کے شریف گھرانوں کا آج یہی رنگ ہے کہ اولاد کی تربیت کی زحمت نہیں اٹھاتے اور اُن کی دنیا بنانے کے لیے تو ہر طرح کے جتن کرتے ہیں مگر آخرت کو فراموش کر دیا جاتا ہے! یہ داستان بڑی غم انگیز ہے۔

بسمل سعیدی کے والد حکیم سعید احمد (سعید میاں) اونچے درجہ کے طبیب تھے اور ٹونک میں اُن کی بڑی عزت اور شہرت تھی، والد کے نام کی نسبت سے بسمل نے سعیدی اپنے نام کا جز بنا لیا! ان کا تعلق ہاشمی سادات کے معزز اور علمی گھرانے سے تھا، عربی زبان و لغت کے مشہور و معروف عالم سید محمد سورتی، بسمل صاحب کے بہنوئی تھے۔

بسمل سعیدی اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے ریاست ٹونک میں اہلکار تھے، سستے کا زمانہ تھا اور ریاست ٹونک میں تو ارزانی ہی ارزانی تھی۔ بیس روپیہ ماہوار

میں ایک گھرانے کی بال بچوں کے ساتھ آرام سے بسر ہوتی تھی! بسملؔ صاحب اپنی آزادانہ روش اور شاعرانہ بے نیازی کے سبب نواب صاحب لوٹنک کے کئی بار معتوب رہے! جس نے اُن کو مالی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد دلی میں کئی ماہناموں سے اُن کی وابستگی رہی۔ مشاعروں کی بھی تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے اُن کے لیے بہت کچھ کیا۔ مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیر اعظم جناب بخشی بھی بسملؔ سعیدی سے متاثر تھے۔ انہوں نے بھی خاصی مالی امداد کی، دلی میں ایک بڑا مکان جسے حویلی کہنا چاہیے بسملؔ صاحب کو الاٹ کیا گیا! مگر بسملؔ صاحب کی زندگی پر شیخ سعدی کا یہ شعر ؎

قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال　　　　نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

صادق آتا تھا کہ اس عادت اور زندگی کی روش کے ہاتھوں وہ ہمیشہ پریشان حال اور ضرورت مند ہی رہے۔

۱۹۶۵ء میں راقم الحروف جب دلی کلاتھ ملز کے سالانہ پاک و ہند مشاعرے میں شریک ہوا اور جناب بسملؔ سے ملاقات ہوئی تو اُن کا عجیب عالم پایا۔ لباس بہت ہی معمولی بلکہ غریبانہ تھا۔ چہرے پر بشاشت نام کو بھی مجھے دکھائی نہیں دی، لب پہ مہرِ خموشی لگی ہوئی۔ وہ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے رہتے! لوٹنک میں جب وہ تھے تو احباب کی دعوتیں کرتے مگر دلی میں اپنے گھر یا ہوٹل میں چائے پلانے کی بھی شاید مقدرت اُن کو نہیں تھی۔ حکومت ہند سے اُنہیں ڈیڑھ سو یا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا۔ مگر اُن کے مشاغل کے لیے چند سو روپے ایسے تھے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ! بسملؔ صاحب کو اس کا بھی شدید احساس تھا کہ اُن کی شاعرانہ بلند مقامی کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی گئی۔ اُن کا یہ احساس غلط نہیں تھا۔ اس معاملہ میں انہوں نے مرزا غالبؔ سے ملتی جلتی طبیعت اور مزاج پایا تھا۔

اس بات کو دس گیارہ برس ہو گئے ہوں گے، مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں مشاعرہ تھا، استاد قمر جلالوی حیات تھے، ہم دونوں ایک ہی جہاز سے راولپنڈی پہنچے اور وہاں سے سرکاری موٹر کار کے ذریعہ مظفر آباد! میری غزل کے اس مطلع پر:

ساقی بھی، دورِ جام بھی بادل گھرے ہوئے　　　　اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

جناب فیض جھنجھانوی نے اعتراض کیا کہ اس میں "ایطاء" کا عیب ہے، میں نے جواب دیا

اس میں " ایطار" نہیں ہے اور کراچی واپس آکر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کا اعتراض بے جا اور نادرست ہے اور میری غزل کا مطلع " ایطار" کے عیب سے پاک ہے، جناب شمس زبیری عروض میں خاصہ درک رکھتے ہیں، انہوں نے عروض کی کئی کتابوں کے حوالے مجھے دکھائے، خاص طور سے یگانہ چنگیزی کی " چراغ سخن" سے استناد و استشہاد کیا کہ میرے مطلع میں " ایطار" نہیں ہے۔ فیض جھنجھانوی صاحب کو ان ماہرین عروض کی کتابوں کے اقتباسات لکھ کر بھیجے گئے مگر وہ اپنے اعتراض پر جمے رہے!

پھر میں نے ہندوستان اور پاکستان کے عروض جاننے والے شعراء کو لکھا، جن میں پنڈت لبھورام جوش ملسیانی بھی شامل تھے، جوش ملسیانی نے نکودر کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا! اسی پتہ پر اُن سے خط و کتابت ہوتی تھی! ہر جگہ سے میری موافقت میں جواب آیا جناب بسمل سعیدی کو بھی میں نے اس سلسلہ میں خط لکھا کہ آپ خود بھی اپنی رائے دیں اور دلی میں جو سب سے بڑا عروض داں ہو، اس سے دریافت کریں، بسمل سعیدی نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ کے مطلع میں " ایطا" نہیں ہے، مگر انہوں نے میرا مطلع تقطیع کے ساتھ اس طرح لکھ کر بھیجا :-

ساقی ہے، دورِ جام ہے، بادل گھرے ہوئے اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

اس طرح میرے مطلع میں " بھی" کی تکرار جو ناگوار تھی، دور ہو گئی اور اس کی جگہ " ہے" آنے سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا، یہ اُن کی عالی ظرفی تھی کہ میرے شعر کی کوتاہی کی طرف اپنے خط میں کوئی اشارہ نہیں کیا، بس شعر لکھ کر بھیج دیا۔ اپنے شعر پر بسمل سعیدی کی اس اصلاح کا اپنے احباب میں بارہا ذکر کر چکا ہوں۔

بسمل سعیدی کوئی شک نہیں اپنے طرز کے منفرد شاعر تھے، اُن کی غزلوں میں صحت زبان کے ساتھ تغزل کا رچاؤ پایا جاتا ہے۔ افکار و خیالات کا تنوع اور اچھوتا پن سونے پر سہاگا! ان کے کلام میں سطحی اور بھرتی کے اشعار بہت ہی کم ملیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو تخیل بلند اور فکرِ عمیق عطا فرمائی تھی ؎

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل

تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

بسمل سعیدی کے اس شعر کا بھلا کوئی جواب ہے! اردو شاعری اس شعر پر فخر کر

سکتی ہے۔
ہندوستان اور پاکستان میں اُن کے شاگردوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے ، ورد سعیدی ، صاحب دیوان شاعر تھے ۔ جو ٹنڈو آدم سندھ میں پیوند خاک ہو گئے۔ جناب جوہر سعیدی کراچی میں تشریف رکھتے ہیں اور شاعر گر استاد ہیں ! جناب محمود سعیدی کی شاعری کی سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی ہے ! جناب سعیدی کی وفات نے اردو شاعری میں جو خلا پیدا کیا ہے وہ مستقبل میں اگر پُر ہو جائے تو یہ اردو شاعری کی کرامت ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ بسمل سعیدی کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اپنی رحمت و مغفرت سے اُن کو نوازے ۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۷۷ء)

حکیم بشیرالدین

حکیم بشیرالدین سے نواب ممتازالدولہ مکرم علی خاں مرحوم والی پہاسو کے یہاں جے پور میں ملاقات ہوئی، حکیم صاحب طبیب کی حیثیت سے نواب صاحب کے ہاں ملازم تھے۔ نواب صاحب ان کو "بچھن میاں" کہا کرتے تھے۔ لباس، چہرے مہرے وضع قطع اور عادات و اطوار سے وہ مولوی اور زاہد و دیندار لگتے تھے، مگر نواب صاحب کی راگ رنگ کی محفلوں میں بھی انہیں بادل ناخواستہ شریک ہونا پڑتا۔

پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور صدر دواخانہ سے متعلق ہو گئے، کئی سال خوب جم کر کام کیا، پھر انہوں نے جہانگیر روڈ پر اپنا ذاتی مطب اور دواخانہ قائم کر لیا۔ خاصے اچھے نباض تھے اور خاص بات یہ کہ ہاتھ میں شفا تھی، ان کا مطب خوب چلا!

شعروسخن سے خاص ذوق تھا، اگر فن شاعری پر پوری توجہ دیتے تو شاعری میں نام پاتے، ان کا مطب شاعروں کا "ڈرائنگ روم" تھا، روزانہ دو چار شاعروں کے ساتھ نشست رہتی، اتوار کی شب میں یہ نشست "بزم" بن جاتی، شعر خوانی ہوتی، چائے اور بسکٹوں سے سامعین کی تواضع کی جاتی۔

حکیم صاحب پرانی مشرقی وضع کی یادگار تھے، کم سخن اور باوقار، جیسے پیر درویشوں اور پیروں کی طرح گھنی سفید ڈاڑھی، مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی، میں نے ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی! میں جب بھی ان کے یہاں جاتا بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے! چند سال پہلے بس کے ایکسیڈنٹ میں ان کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی، مگر اللہ نے بچا دیا، ٹانگ میں البتہ لنگ رہ گئی۔

عمر اسی سال سے دو چار برس اوپر ہی ہو گی مگر بڑھاپا معمولات میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکا، میں ایک اتوار کو سر مغرب ان کے مطب (محبوب دواخانہ) پہنچا تو دواخانہ بند پایا، یہ بالکل غیر معمولی بات تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، اللہ خیر کرے۔ مگر دوسرے دن پتہ چلا کہ حکیم صاحب تو انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

محبوب دواخانہ اپنی جگہ قائم ہے، حکیم صاحب کے داماد مطب بھی چلا رہے ہیں، مریض بھی آتے جاتے رہتے ہیں مگر جن کے دم سے یہ مطب "بزم شعروسخن" اور "محفل یاراں" بن گیا تھا وہ تو آغوش لحد میں سو رہے ہیں۔ (غفر اللہ تعالیٰ)۔ (ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۱ء)

بشیر دُرّانی

اس نام کو پڑھ کر لوگ چونکیں گے کہ یہ نام ہم نے نہیں سُنا، یہ کس غیر معروف شاعر کا ذکر کیا جا رہا ہے، یہ بات سچ بھی ہے کہ بشیر دُرّانی شعر و ادب کی دنیا میں شہرت نہیں رکھتے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر، رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ مشہور ہوتا ہے اور بشیر دُرّانی نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی، رسالوں میں اُن کا کلام اتنا کم چھپا ہے کہ اس کا چھپنا نہ چھپنا برابر ہے۔ بشیر دُرّانی کی شاعری جنگل کے مور کے رقص کی طرح عوام اور خواص کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی، مشاعروں میں وہ خاصے کامیاب رہتے تھے۔ بس اسی سے اُن کی تھوڑی بہت شہرت تھی۔

میرے وطن (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) میں بشیر دُرّانی کی بہن بیاہی تھیں، وہاں انھیں ایک آدھ بار دیکھا تھا، اُن دنوں وہ دوسروں کا کلام دلکش ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، سینکڑوں غزلیں یاد تھیں سُنانے پر آتے تو کئی کئی گھنٹے مسلسل غزلیں سناتے یہ اب سے تقریباً چالیس بیالیس سال پہلے (۲۴-۱۹۲۳ء) کی بات ہے پھر بیس سال بعد اُن سے جے پور کے مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔

یو، پی میں حسن پور کے ایک رئیس خانوادے میں اُن کا آنا جانا رہتا۔ وہاں اُن کی خاصی آؤ بھگت ہوتی، پھر اس زمینداری اور ریاست کے حالات بھی پہلے سے نہیں رہے، تقسیم ہند کے وقت وہ مستقل طور پر رام پور میں مقیم تھے، اس کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور نواب شاہ (سندھ) کو اپنی اقامت گاہ بنایا۔ کراچی میں آتے جاتے رہتے۔ مشہور شاعر و ادیب جناب رئیس امروہوی سے بڑا یارانہ تھا، اُن کے دفتر (روزنامہ شیراز ——— جو کئی سال سے بند ہے) میں مہینوں قیام کیا، دمہ کے برسوں سے مریض تھے، میرے یہاں جب آتے تو سیڑھیوں پر چڑھنے سے بُرا حال ہو جاتا، کئی کئی منٹ تو سانس ہی نہ جڑتا، بڑی دشواری سے بات کرنے کے قابل ہوتے، کھانسی اور کالی کھانسی

اُس پر شدید تنفس بلکہ ضیق النفس نہ جانے مہینہ میں کتنے دن نزع کے عالم میں گزارتے! ان کی بیماری اور صورت کو دیکھ کر ترس آتا تھا۔

سات سال ہوئے جب نواب شاہ میں اُن کا مجموعہ کلام چھپنے کے لیے ٹکٹ سے ایک مشاعرہ ہوا، شاعروں نے کرایہ کے علاوہ کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ حضرت جگر مرادآبادی مرحوم اُن دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے وہ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ اس مشاعرے کی آمدنی سے بشیر مرحوم کا دیوان طبع ہوا، مجھ سے "پیش لفظ" لکھنے کی فرمائش کی اور میں نے اُن کی فرمائش پوری کردی، ان کی غزلوں کا مجموعہ چھپا اور خود ان کی کوشش سے نکل بھی گیا، اس سے اُن کے مالی حالات کچھ درست ہوئے، پھر کلیم (CZ ۸ ہ ۸) میں زمین مل گئی جس سے اُن کی معاشی حالت کسی حد تک سنبھل گئی۔

بشیر درانی کے دادا مولانا فرخی کے علم و فضل اور ذاتی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ نواب حامد علی خاں والی رام پور کے استاد تھے، پھر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کے والد جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) میں یکہ چلاتے تھے، بشیر کی تعلیم مکتب سے آگے نہ بڑھ سکی مگر طبیعت اخاذ اور مزاج شاعرانہ پایا تھا۔ شعر گوئی خاصی عمر میں شروع کی اور اس میں برابر ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ بہت سے شاگرد اُن سے استفادہ کرنے لگے، اُن کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ شوخی پائی جاتی ہے، ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

مجھے بزم سے اٹھا دو، یہ نہیں مگر گوارا
کبھی اس طرف اشارہ کبھی اُس طرف اشارا

جگر مرادآبادی کی صحبتوں میں وہ ضرور شریک رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک دو غزلیں بھی اصلاح و مشورہ کی غرض سے انہیں سنائی اور دکھائی ہوں مگر اُن کو جگر کا شاگرد اور جانشین ہرگز نہیں کہا جاسکتا ——

مرحوم اوسط درجہ کے غزل گو شاعر تھے، مگر شعر و ادب پر جو بُرا وقت آرہا ہے اور جس پستی کی طرف نئی نسل جا رہی ہے، اس کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں بشیر درانی جیسے شاعر بھی کمیاب بلکہ شاید نایاب ہوں گے۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۶۴ء)

بہار کوٹی

دسیوں سال پہلے کے واقعات کے ہجری یا عیسوی سنین مشکل ہی سے یاد رہتے ہیں۔ بے چارہ حافظہ بھی کیا کرے :

کسے یاد رکھے کسے بھول جائے !

بعض اوقات پچھلی باتیں لکھتے ہوئے واقعات کی ترتیب بھی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ بہرحال حافظہ پر زور ڈالنے کے بعد اتنا یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں بہار کوٹی کا کلام ماہنامہ شاعر آگرہ میں اوّل اوّل نگاہ سے گزرا، اور پھر اُن کی غزلیں دوسرے سالوں میں بھی آنے لگیں! "شاعر"[1] (آگرہ) میں طرحی مصرعہ پر شعرا کی غزلیں چھپتی تھیں۔ ان غزلوں میں بہار صاحب کی غزل میں اُس وقت بھی انفرادیت جھلکتی تھی !

کئی بار مشاعروں میں اجمیر شریف جانا ہوا، بہار کوٹی وہاں (غالباً) چیف کمشنر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اُن سے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ضرور ملاقات ہوئی ہوگی، مگر جس ملاقات کا نقش دل پر قائم ہوگیا وہ کراچی کی ملاقات ہے! یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے شعر و سخن کی کوئی مخصوص نشست تھی اس میں بہار کوٹی کی غزل سن کر طبیعت خوش ہوگئی اس غزل کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔

ے بہار بھی نہ رہے گی اگر خزاں نہ رہی

اس کے بعد شعر و سخن کی محفلوں میں اُن کی نئی غزلیں سننے کا انتظار رہتا! "جشنِ غالب" کی جن دنوں پاک و ہند کیا روس اور انگلستان میں بھی دھوم تھی، بہار مرحوم نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا آخری شعر یہ تھا۔

پوچ ! مجھ کو پرستارِ غالب   دیدہ دیدہ شنیدہ شنیدہ

---

[1] تقسیم ہند کے بعد "شاعر" کا دفتر بمبئی منتقل ہوگیا، اب یہ رسالہ اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

باوجود ضبط مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے برسرِ بزم مصرعہ اولیٰ کو اس طرح دہرایا۔

دیکھ! مجھ کو پرستارِ غالب

بہار صاحب نے اس پر مجھے غور سے دیکھا اور اپنے شعر کو دوسری تیسری بار بھی اسی طرح پڑھا مگر رسالہ میں جب اُن کی یہ نظم شائع ہوئی تو اس مصرع میں "پوچ" کی بجائے "دیکھ" ہی چھپا! یوں:۔

دیکھ! مجھ کو پرستارِ غالب — دیدہ دیدہ شنیدہ شنیدہ

یہ اُن کی حق پسندی اور منصف مزاجی کی دلیل تھی۔

ایک دو مشاعروں میں ایسا بھی ہوا کہ اُن سے پہلے میرا نام پکارا گیا اس پر وہ تیزی کے ساتھ اسٹیج پر آ گئے اور بولے نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا پہلے میں پڑھوں گا! اس عجز و انکسار کے ساتھ اُن کی "شاعرانہ خودی" کی یہ روایت بھی مجھ تک پہنچی —— کسی نے اُن سے کہا کہ آپ نے فلاں شعر میں محاورہ یوں باندھا ہے مگر "لغت" میں کچھ اور لکھا ہے، اس پر بہار صاحب نے فرمایا تو پھر لغت میں تبدیلی کرنی ہوگی۔

بہار کوٹی مرحوم کی شاعرانہ عظمت کراچی کے تمام ادبی حلقوں کے نزدیک مسلّم تھی! کوئی شک نہیں وہ صاحب طرز شاعر تھے، زبان کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں پر بھی اُن کی نظر تھی، نہ جانے کتنے نوجوانوں کو ان کے فیضِ تربیت نے شاعر بنا دیا، عجیب بے نیازانہ انداز میں تحت لفظ پڑھتے جیسے وہ اپنے کلام پر داد و ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔

قدیم اساتذہ کے اردگرد شاگردوں کا جو حلقہ رہتا تھا اس روایت کو بہار کوٹی نے قائم رکھا۔ "بہارِ ادب" اُن کے تلامذہ اور قدر شناسوں نے قائم کی تھی! اس کے ماہانہ اور سالانہ مشاعرے ہوتے رہتے! مرحوم کی زندگی میں مشرقی شرافت جھلکتی تھی۔ مولانا مودودی سے وہ متاثر تھے اور جماعت اسلامی کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔

عیش فیروزپوری جن کے نام کے ساتھ نہ جانے کس رعایت سے "علامہ" لکھا جاتا ہے، بہار کوٹی کے استاد تھے مگر شاگرد استاد سے منزلوں آگے تھا۔

نیو کراچی میں انجمن "بہارِ ادب" کا سالانہ مشاعرہ تھا اس میں بہار مرحوم نے بڑے معرکہ کی غزل جس کی ردیف "گم ہے" سنائی، انہوں نے جناب تابش دہلوی

اور مجھے اپنے یہاں تیسرے روز کھانے کی دعوت دی، مگر ہم نہ جا سکے! پھر چوتھے دن اخباروں میں اُن کے انتقالِ پُر ملال کی خبر پڑھی!

میں پاپوش نگر قبرستان پہنچا تو بہار کوٹی کا آخری دیدار ہو رہا تھا۔ اُن کے بعض دوستوں اور شاگردوں کو روتے ہوئے دیکھا۔ شفیق کوٹی صاحب کا بُرا حال تھا دو آدمی انہیں سنبھالے ہوئے تھے۔ بہار مرحوم کے چہرے کو دیکھ کر مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پان کھا کر ابھی سوئے ہیں!

اس کے بعد میت قبر میں اتاری گئی، گورکنوں نے پتھر کی سلیں جمائیں اور پھر سوگواروں نے قبر پر مٹی ڈالی!

اللہ تعالیٰ اُن کی قبر اور آخرت کو پُر بہار بنائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۱ء)

بہزاد لکھنوی

۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے میں ان دنوں نظامتِ دیوانی بلدیہ حیدرآباد دکن میں محافظِ دفتر تھا، مرزا عثمان بیگ جو اس عدالت کے سررشتہ دار تھے، رخصت پر دلی اور لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں سے واپسی پر راقم الحروف سے ملاقات ہوئی تو چھوٹتے ہی بولے کہ بھئی! ایک ایسے شاعر کو سُنا کہ لطفِ کلام بھی حاصل ہوا اور لطفِ ترنم بھی! بہزاد تخلص فرماتے ہیں، بعض مشاعروں میں جگر مرادآبادی جیسے مانے ہوئے نامور شاعر کا رنگ بھی بہزاد کی شاعری کے آگے پھیکا رہا۔ میں نے کہا اچھا بہزاد صاحب کے کچھ اشعار آپ کو یاد ہوں تو سنائیے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے تین چار شعر سنائے۔ راقم الحروف نے عرض کیا بہزاد لکھنوی کے شعر خاصے اچھے ہیں ان میں تغزل اور زبان دونوں کا چٹخارہ ہے مگر جہاں تک حضرت جگر مرادآبادی کی شاعری کا تعلق ہے وہ تغزل کی معراج ہے مشاعروں میں اوّل اوّل ہر نئے خوش گو شاعر کی ایسی ہی پذیرائی ہوتی ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ بہزاد صاحب کے مشاعرے لوٹنے کی ہوا جہاں جگر کی شاعری سامعین کی داد و ستائش کے لحاظ سے دبتی نظر آتی تھی، بس دو ڈھائی برس رہی، جگر حسبِ سابق مشاعروں کے شہنشاہ ہی کہلائے!

غالباً ۱۹۴۰ء میں افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی کی پہلی برسی تھی، میں ان دنوں اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے حیدرآباد دکن سے دہلی آیا ہوا تھا، آغا شاعر کی برسی پر آل انڈیا ریڈیو نے مشاعرے کا اہتمام کیا اور ہارڈنگ لائبریری سے مشاعرہ نشر ہوا، مجھے بھی اس کل ہند مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی! جناب تابش دہلوی آن دنوں آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر تھے، مشاعرے کے بعد وہ مجھ سے بولے کہ بھئی ماہر! تمہارا نام جب حضرت بہزاد کے بعد پکارا گیا تو میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے تھے کہ اتنی مشہور و مقبول شخصیت کے بعد تمہیں بلایا گیا ہے — مگر میرے شیر! تو نے

رنگ جما دیا اور داد و تحسین کے ٹیمپو کو کم نہیں ہونے دیا، میں نے کہا میرے ذہن میں تو آج تک کسی بڑے سے بڑے مشاعرے میں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں گزرا کہ مجھے کس سے پہلے یا کس کے بعد پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔

اس واقعہ کے دوسرے سال ریاست مالیر کوٹلہ کے آل انڈیا مشاعرے میں جناب بہزاد لکھنوی سے ملاقات ہوئی، شب میں مشاعرے کے بعد اختر شیرانی میرے کمرے میں آ گئے اور ان کے ساتھ گوپال متل، دونوں نشہ میں دھت، میں سونا چاہتا تھا یہ دونوں حضرات جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے! سنجیدہ اور رومانی شاعری اور مزاح سے بات چل کر رفیع احمد خاں کی فحش شاعری تک آن پہنچی، بہزاد صاحب دوبار کمرے میں آئے مگر اس چنڈال چوکڑی کا رنگ دیکھ کر الٹے پاؤں واپس چلے گئے، یہ اُن کی شرافتِ نفس کی دلیل تھی۔

نواب احسان خاں ریاست مالیر کوٹلہ کے سب سے بڑے جاگیردار تھے ان کی شاندار حویلی میں جو چھوٹی موٹی محل سرائے تھی دوپہر کی پر تکلف دعوت کے بعد شاعری کا دور چلا — اور ہاں! یہ بات تو بھولا ہی جاتا ہوں کہ پینے والے شاعروں کے لیے اس سے قبل جام و بادہ کا بھی اہتمام کیا گیا، سہ پہر کو کل ہند مشاعرے کی دوسری سٹنگ ہوئی، مجھے لدھیانہ ہوتے ہوئے لاہور جانا تھا اس لیے میں نے دو تین شاعروں کے بعد کلام سنایا، رام پور، لوہارو، ٹونک، بھوپال اور مالیر کوٹلہ انگریزی دور کی ان مسلمان ریاستوں کے مشاعروں میں شاعروں کی خوب پذیرائی ہوتی اور داد و تحسین کی کوئی حد و نہایت نہ رہتی! مشاعرہ گاہ سے آ کر میں اپنا بستر باندھ رہا تھا کہ اتنے میں جناب بہزاد تشریف لائے، بولے۔ آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں، ماشاء اللہ، جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا —! بہزاد دلی سے کار میں آئے تھے اور مالیر کوٹلہ سے کار ہی میں ڈیرہ دون کے مشاعرے میں جانے کا پروگرام تھا، صابر دہلوی ان کے ساتھ تھے، صابر نے مجھے بتایا کہ مالیر کوٹلہ سے ڈیرہ دون جاتے ہوئے بہزاد صاحب نے تمہارے بارے میں کہا:

"ماہر القادری MOB ہر کا شاعر ہے۔"

اس کے بعد بہزاد مرحوم سے دلی اور بمبئی میں بارہا ملاقاتیں رہیں اور پاکستان بننے کے بعد کراچی میں تو ملنے جلنے کے مواقع ملتے ہی رہتے، عام طور پر سلام میں اپنی

طرف سے مسابقت کرتے، اُن کے یہاں عزیز آباد کا مکان بننے کے بعد سال کے سال ربیع الاوّل میں ایک نعتیہ محفل ہوتی تھی، اس میں مجھے اصرار کے ساتھ دعوت اور آمد و رفت کے لیے سواری کا انتظام فرماتے! مجھے دیکھتے ہی معانقہ کے لیے بڑھتے اور محبت کے لہجے میں فرماتے ——— "تم آ گئے، سب آ گئے"

بہزاد صاحب کی شہرت کا آغاز اُن کی اس غزل :-

ے دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

سے ہوا، جسے برصغیر ہند کی مشہور مغنیہ اختری بائی فیض آبادی نے اس قدر شیریں اور دلکش لہجہ میں گایا کہ اس غزل کے ہزارہا ریکارڈ فروخت ہوئے اور پورے ہندوستان میں اس کونے سے اس کونے تک یہ غزل مشہور ہو گئی، اب سے کم و بیش چالیس برس پہلے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام آرگن "آواز" میں بہزاد لکھنوی کا نام جگہ جگہ نظر آتا، نعت، غزل، گیت اور فیچر سب ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے! اُن کے کلام کے کئی مجموعے شاہد احمد دہلوی مرحوم نے ساقی بکڈپو سے شائع کیے تھے، طوائفیں اپنے کوٹھوں اور بالاخانوں پر رات کو گانے کا ٹھیکہ[۱] لگاتیں تو بہزاد صاحب کی غزلوں کی کتابیں اُن کے سامنے رہتیں! اُن کی دو تین غزلیں فلم میں بھی مقبول ہوئیں، خاص طور سے یہ غزل:-

ے اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے

جسے اب بھی قوال گاتے ہیں تو محفل پر ایک سماں طاری ہو جاتا ہے۔

زود گوئی میں بس دو چار شاعر ہی حضرت بہزاد کی ٹکر کے تھے، نثر نگاری میں بھی اُن کا طنزیہ انداز بڑا دلچسپ ہے ——— زبان پر بڑی قدرت تھی، اور کردار نگاری میں نفسیاتی نزاکتیں، بس پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں! مگر اُن کی نثر نگاری اُن کی شاعرانہ شہرت کے آگے نمایاں نہ ہو سکی۔

وہ نہ مفکر تھے اور نہ مبلغ تھے اور نہ انہیں علم و فن کا دعویٰ تھا۔ ان کی شاعری ہلکی پھلکی شاعری ہے، جس میں بلندیٔ فکر کی کمی کے باوجود لطف اور چٹخارہ ملتا ہے! نعت تو وہ شاید آغازِ شاعری سے کہتے رہے مگر حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ نبوی کے بعد جس کی سعادت انہیں کئی بار حاصل ہوئی یہ نشہ تیز تر ہو گیا! یہاں تک کہ اب کئی سال سے وہ صرف نعتِ رسولؐ ہی کہتے تھے: ے

---

[۱] ٹھیکہ لگانا طوائفوں کے ریہرسل کو کہا جاتا ہوگا۔ (مرتب)

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

بہزاد لکھنوی کا ترنم اپنی جگہ منفرد تھا، نہ تو منہ بگڑتا نہ گلے کی رگیں پھولتیں اور نہ شعر پڑھنے میں زور لگانا پڑتا۔ اُن کے گلے میں نور تھا اور ایسا لگتا کہ جیسے وہ شعر کیا پڑھ رہے ہیں مصری کی ڈلیاں مزے لے لے کر چبا رہے ہیں، اُن کی شکل صورت میں خاصی جاذبیت تھی، سرخ و سپید رنگت، چھریرا بدن، بڑھاپے میں دوش پر بکھرے ہوئے کاکل بس دیکھنے کی چیز تھے۔

جناب بہزاد لکھنوی کی ملازمت کا آغاز محکمۂ ریلوے سے ہوا، پھر آل انڈیا ریڈیو سے ان کا تعلق ہو گیا، کراچی میں بھی پاکستان ریڈیو سے کئی برس وابستہ رہے! ان کی شاعرانہ شہرت نے اُنہیں پریشان روزگار نہیں رہنے دیا۔ الطاف گوہر صاحب جب کراچی میں ایڈمنسٹریٹر تھے تو بہزاد مرحوم کی مالی امداد کے لیے پاک و ہند مشاعرہ ہوا اور بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا اُن کے فرزند اکبر انور بہزاد نے بھارت کے شاعروں کو دعوت دینے کے لیے ہندوستان کا سفر کیا، بھارت سے کئی شعرا نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔ کراچی کے مقامی شاعروں کو بھی نذرانہ دیا گیا۔ ہزاروں روپوں کے ٹکٹ بکے لیکن سننے میں یہ آیا کہ آمدنی کی رقم بہزاد صاحب کے گھر ہی میں رہی مگر خود ان کے ہاتھ میں اخراجات کے بعد بچی ہوئی کثیر رقم کا تھوڑا ہی حصہ آیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

پاکستان بننے کے بعد کراچی کے سوا باہر کے شاعروں میں بہزاد لکھنوی کو بہت ہی کم دیکھا گیا، کراچی کے سیرت کے جلسوں میں انہیں نعت خوانی کا نذرانہ دیا جاتا، یہ بھی اُن کی گزر اوقات کا ایک ذریعہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا تھا، عزیز آباد میں انہوں نے مکان بھی بنا لیا تھا مگر مرنے سے پہلے اُسے فروخت کر دیا۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں اُنہیں دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا اور موجودہ دورِ حکومت میں اُن کا وظیفہ پانچ سو کر دیا گیا۔ ایک مشہور و معروف بوڑھے اور بیمار شاعر کی اس قدر افزائی کو ادبی حلقوں میں تحسین و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، مسٹر بھٹو اور صدرِ پاکستان بہزاد صاحب کو کہاں جانتے ہوں گے، جناب کوثر نیازی کی وزیر امورِ مذہبی کی شخصی دلچسپی کی بدولت یہ سب کچھ ہوا۔ وزیر موصوف نے کئی بار سینی ٹوریم میں جا کر اُن کی عیادت بھی کی!

بہزاد لکھنوی نے برسوں سے ریل میں سفر کرنا چھوڑ دیا تھا، فرماتے تھے ریل کی چھک چھک اور رفتار سے میرے دل کی دھڑکن تیز اور طبیعت متوحش ہو جاتی ہے، اس لیے مشاعروں میں شرکت کے لیے بس اور موٹر کاریں سفر کرتے جس زمانے (۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء) میں اُن کی اس غزل:

؎ دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی اگر وہ حیدرآباد دکن پہنچ جاتے تو بڑی قدر ہوتی، ریل کے سفر سے وہ ڈرے ہوئے تھے، بلکہ انہیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ اور دلی سے حیدرآباد تک ایک ہزار میل کا سفر بسوں اور لاریوں سے سخت دشوار مرحلہ تھا! مرحوم دل کے مریض تھے نہ جانے کس ڈاکٹر اور حکیم نے انہیں یہ ترکیب بتا دی تھی وہ گلے میں لٹکی ہوئی دھجیوں میں انگلیوں سے گرہ لگاتے رہتے، اس شغل نے اُن کی شخصیت میں ایک انفرادی اعجوبیت پیدا کر دی تھی، کسی نئے شہر میں جانا ہوتا تو مشاعرہ گاہ میں سامعین ایک دوسرے سے اشاروں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے پوچھتے کہ یہ آخر کیا ہو رہا ہے؟ آٹھ دس برس سے وہ ریل میں بھی سفر کرنے لگے تھے۔

بانس بریلی کے سلسلہ نیازیہ چشتیہ سے بیعت تھے، پاکستان بننے کے بعد کئی برس یہ معمول رہا کہ ہر سال بریلی کا سفر کرتے! یہ سلسلۂ ارشاد و تصوف عقائد میں بڑی حد تک تفضیلیہ ہے اور بدعات سے خاص شغف رکھتا ہے، خانقاہ نیازیہ کے سجادہ نشین شاہ عزیز میاں مرحوم سے بہزاد لکھنوی کو بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی ان کو بہت چاہتے تھے!

مرحوم نے تین یا چار شادیاں کیں کئی بیٹے چھوڑے اور پوتے اور پوتیاں بھی! اولاد صاحبِ روزگار مگر بہزاد لکھنوی کو زندگی کی گاڑی خود ہی کھینچنی پڑی! کئی برس سے اوجھا ٹی بی سینی ٹوریم میں مقیم تھے جہاں انہیں رہائش، دوا دارو اور پرہیزی کھانے کی تمام سہولتیں میسر تھیں، یوں سمجھئے کہ سینی ٹوریم ہی اب اُن کا گھر تھا! سننے میں یہی آیا کہ اب وہ اچھے ہیں مگر ریڈیو[1] کے ذریعہ اُن کے انتقال کی خبر ملی جس کے سننے کے لیے سامعہ ہر گز تیار نہ تھا، رمضان کا مبارک مہینہ پایا اور جمعہ کے روز دفن ہوئے۔ غفر اللہ تعالیٰ

(ماہنامہ فاران، دسمبر ۱۹۷۴ء)

---

[1] میں عام طور پر نہ ریڈیو سنتا ہوں اور نہ ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں کسی صاحب نے ٹیلی فون پر اس سانحۂ ارتحال کی خبر دی۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

تقسیم ہند سے پہلے پنجاب مسلم ایسوسی ایشن بمبئی کے زیرِ اہتمام سال کے سال یومِ اقبال بڑے شاندار پیمانہ پر منایا جاتا تھا، تین دن تک خوب جشن رہتا تھا، ایک دن تقریریں، دوسرے دن قوالی اور تیسرے دن مشاعرہ ہوتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم سے میری ملاقات بمبئی ہی میں ہوئی، ان کو لاہور سے یومِ اقبال میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر تاثیر کے علاوہ میں نے بھی تقریر کی، اس کے بعد سرگودھا کے مشاعرے میں ملنا ہوا اور آخری بار ملاقات گورنر جنرل ہاؤس (کراچی) کی ایک ادبی صحبت میں ہوئی۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، طبیعت بہت ذہین اور اخاذ پائی تھی، نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے، جس محفل میں بیٹھتے چٹکلوں اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر بزم کو باغ و بہار بنا دیتے، وہ ایک اچھے مقرر، شگفتہ نگار انشا پرداز اور خوش بیان شاعر تھے، لاہور میں اُن کے دم سے شعر و ادب کی چہل پہل تھی، چند دن تک وہ نام نہاد "ترقی پسندی" سے بھی متاثر رہے، مگر پھر غالبؔ و اقبالؔ کی راہ پر آ گئے لیکن کبھی کبھار اس بجھی ہوئی آگ کی ایک آدھ چنگاری اُبھر آتی ــــــ غزل میں ایسے ایسے جاندار اور معرکے کے شعر کہے ہیں:

داورِ حشر! مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

مولانا تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کی نگرانی میں جب ماہنامہ "شاہکار" نکلتا تھا اُسی زمانہ میں اُن سے میری خط و کتابت تھی، میں اُن دنوں حیدر آباد دکن میں مقیم تھا، اُن کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مجھے خط میں لکھا :-

" اپنی شاعری کی زکوٰۃ بھیج دیجیے۔"

اور مجھے یہ الفاظ پڑھ کر پسینہ سا آگیا، فوراً تازہ غزل اُن کی خدمت میں بھیجدی۔

مولانا تاجور سے ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی، لائل پور کاٹن ملز میں مشاعرہ تھا، مولانا مرحوم نے بھی اس میں شرکت فرمائی اور غزل بھی پڑھی، میں نے اندازہ لگایا کہ اُن کی طبیعت میں "کم آمیزی" کا رنگ غالب ہے، ایک آدھ ملاقات میں نئے آدمیوں سے بے تکلف نہیں ہو جاتے۔

انگریز کے آخری دَور میں مولانا تاجور کو "شمس العلماء" کا خطاب عطا ہوا تھا، اُن کے دوستوں اور جاننے والوں نے مبارکباد کے تار روانہ کیے اور خط لکھے مگر میرا خط سب سے مختلف تھا، میں نے سرکاری خطاب پر اُن کو مبارکباد نہیں دی غالباً اسی لیے میرا خط شائع نہ ہو سکا۔

مولانا تاجور مرحوم کو نظم اور نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی، لیکن ان کی یہ ادبی خدمات آخر میں "پروفیسر" اور "ممتحن" کی شخصیت میں ضم ہو کر رہ گئیں، وہ نجیب آباد (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے مگر لاہور ہی کو اپنا وطن بنا لیا اور اس خاک سے اتنی محبت تھی کہ اسی کا پیوند ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی رہنمائی کی، اُن کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اردو کی خدمت کا جذبہ اپنا کام کرتا رہا ——— (ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

پاکستان بننے سے پہلے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے کوئی تعارف نہیں تھا یہ سالوں میں اُن کا کوئی مضمون، غزل یا نظم بھی نظر سے نہیں گزری! لائل پور کاٹن مل کے سالانہ مشاعرے میں پنجاب کے مشاہیر شعراء شرکت فرماتے تھے مگر صوفی تبسم مرحوم کو نہیں دیکھا گیا۔

پاکستان بننے کے تین برس بعد سرگودھا میں بڑی دھوم کا کل پاکستان مشاعرہ ہوا، محمد نیاز مرحوم ان دنوں سرگودہا میں ڈپٹی کمشنر تھے، انہی کے شوق و دلچسپی کی بدولت یہ عظیم الشان مشاعرہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے زندگی میں پہلی بار اسی مشاعرے میں ملاقات ہوئی، وہ ان دنوں لاہور کے کسی کالج میں پرنسپل تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ لاہور تو جا ہی رہے ہیں، ہمارے کالج میں بھی مشاعرے کی ایک نشست رہے گی، اس میں آپ کو بھی شرکت کرنی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ بہ سر وچشم حاضر ہوں گا۔

اس مشاعرے میں مشہور شعراء کی خاصی بڑی تعداد نے شرکت کی، کالج کا ہال طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ طلبہ نے شاعروں کی خوب پذیرائی کی۔ سب سے بڑی پذیرائی یہ کہ شعراء کو دل کھول کے داد دی اور نظم وضبط قائم رکھا! میرا نام پکارا گیا۔ تو میں نے سب سے پہلی غزل جو سُنائی اس کا ایک شعر یہ بھی تھا۔

دیکھی ہے مری آنکھ نے کلیوں کی تباہی
اٹھا ہے تبسم کا جنازا مرے آگے

اس پر داد وستائش کا شور بلند ہوا۔ تالیاں بھی بجیں اور میں نے دیکھا کہ سب کی نظریں صوفی تبسم پر جمی ہوئی ہیں! اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ شعر مجھے پڑھنا نہیں چاہیے تھا، میں نے بالقصد ایسا نہیں کیا تھا۔ اور اس طرف خیال

ہی نہیں گیا کہ صوفی تبسم بھی اس مشاعرے میں موجود ہیں اور اس کالج کے پرنسپل ہیں۔

پروفیسر صوفی تبسم سے پھر مشاعروں میں ملاقات ہوتی رہتی۔ اُن کو میں نے ہمیشہ ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج پایا۔ خاصی دلچسپ شخصیت تھی۔ مشاعروں کے اسٹیج پر کبھی کبھی مست و سرشار بھی نظر آتے۔

پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اُن کے روزگار کے بہت سے ذریعے پیدا ہو گئے، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور بعض نیم سرکاری اداروں سے ان کا تعلق تھا ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی تھی! پاکستان ریڈیو سے روزانہ علامہ اقبال کے ایک شعر کی شرح فرمائے۔ تین چار مہینہ ہوئے لاہور سے ایک ماہنامہ مجھے ملا جس کا موضوع خاندانی منصوبہ بندی تھا، اس میں بھی مدیر کی حیثیت سے ان کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُن کا رجحان تجدد و ترقی پسندی کی جانب تھا اگرچہ وہ کمیونسٹ نہیں تھے۔

اردو کے خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ پنجابی میں بھی انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اُن کی زندگی کتاب، مطالعہ اور قرطاس و قلم کی زندگی تھی۔ زبان و ادب اور سیاست و مذہب کے مسائل میں بحث کرنے سے گریز کرتے۔ میانہ قد، سرخ و سپید رنگت دیکھنے میں خاصے صحت مند مگر سر کے سامنے کے حصہ کے بال اڑ چکے تھے۔ اس پر لطف یہ کہ ننگے سر رہتے تھے۔

اُن کی موت کی اطلاع ایکا ایکی اخباروں میں نظر سے گزری، اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے ایک اچھے شاعر اور صاحبِ علم شخصیت کا اٹھ جانا ادبی حلقوں میں ایک المیہ کی طرح محسوس کیا گیا۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۸ء)

تسکینؔ قریشی

راقم الحروف کے وطن (کسیر کلاں، ضلع بلند شہر) میں ایک صاحب کے یہاں سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) آتا تھا۔ اس میں تسکینؔ قریشی کی کئی غزلیں نگاہ سے گزریں؛ ان کے نام کے ساتھ "سوردل" بھی قوسین میں لکھا جاتا تھا، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء یعنی اب سے چوالیس سال پہلے کی بات ہے۔ میرے ذہن و فکر نے ان کے کلام کا کیا اثر قبول کیا یہ تو یاد نہیں رہا، مگر ہاں! یہ ضرور ہے کہ اُن کا نام یاد رہ گیا۔ پھر بائیس تیئیس سال کی مدت تک نہ تو اُن کا کلام کسی اخبار اور رسالہ میں پڑھنے کو ملا اور نہ اُن سے کہیں ملاقات ہوئی۔

پاکستان بننے کے دو ڈھائی سال بعد جب حضرت جگرؔ مراد آبادی کراچی تشریف لائے تو اُن کی زبان سے بار بار تسکینؔ صاحب کا نام سُنا، اُن کے کلام کی بھی جگرؔ صاحب نے تعریف کی اور یہ بھی فرمایا، ملنے کے قابل انسان ہیں! پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تسکینؔ کئی بار پاکستان تشریف لائے اور ان سے نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ یارانہ ہو گیا اور یہ دوستی مرورِ زمانہ کے ساتھ اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔

۱۹۵۲ء میں تسکینؔ مرحوم لائل پور کاٹن ملز کے "پاک ہند مشاعرے" میں حضرت جگرؔ کے ساتھ شریک ہوئے، پھر انہیں "یادگارِ جگرؔ" کے عظیم الشان مشاعرے میں بلایا گیا، جناب مدنیؔ صاحب ان دنوں کراچی کے کمشنر تھے، انہوں نے مشاعرے کے اہتمام میں خاص دلچسپی لی، فضل احمد کریم صاحب فضلیؔ اس مشاعرے کی روحِ رواں تھے اس وقت کے وزیر خزانہ جناب محمد شعیب صاحب نے مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا، تسکینؔ صاحب اپنے قدیم دوست غلام محی الدین صاحب اشرفی (سپرنٹنڈنٹ پولیس) کے یہاں ٹھہرے! اُن کے اعزاز میں دعوتیں اور شعر و سخن کی صحبتیں بھی رہیں۔

۱۹۶۴ء میں راقم الحروف دلی کلاتھ مل کے "انڈو پاک" مشاعرے میں شریک ہوا تو میرٹھ تسکین مرحوم سے ملنے کے لیے گیا۔ دو رات اور ایک دن ان کا مہمان رہا، اُن کے مکان کے سامنے حکیم سیف الدین صاحب کا مطب ہے۔ مجھے اسی عمارت میں ٹھیرایا گیا، شب میں شعر و سخن کی ایک مخصوص نشست بھی رہی! اُن کے ساتھ یہ وقت اخلاص محبت اور شرافت و سنجیدگی کے ماحول میں گزرا، جس کی یاد ابھی تک تازہ ہے! خلوص و محبت کے نقش انمٹ ہوتے ہیں۔

حضرت تسکین اور راقم الحروف کے درمیان برسوں خط و کتابت رہی، دونوں طرف سے سینکڑوں خط جواباً اور طلب خیریت کے لیے لکھے گئے! "فاران" کے مطالعے سے انہیں بڑی دلچسپی تھی، میرے مضامین اور کلام کی تعریف کر کے میرا دل بڑھاتے اُن کے ایسے خطوط میں سنبھال کر رکھتا تو میرے مناقب میں ایک چھوٹی سی کتاب مرتب ہو سکتی تھی۔

تسکین قریشی اگرچہ محکمہ پولیس میں کورٹ انسپکٹر تھے مگر اس دلدل میں وہ کنول کی طرح رہے، اپنی تنخواہ ہی میں انہوں نے گزر بسر کی، اُن کی نیک نامی اور دیانت پولیس والوں میں "ضرب المثل" بن گئی تھی! سرکاری ملازمت سے پنشن لینے کے بعد میرٹھ کے محلہ ہتی سرائے میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، اُن کے کوئی اولاد نہ تھی، بڑی محتاط اور خود دارانہ زندگی، کسی کا ممنونِ احسان ہونا گوارا نہ کرتے! طبیعت کے حسّاس اور قدرے زود رنج تھے اُن کے مزاج کے خلاف ذرا سی بھی کوئی بات ہو جاتی تو اس کا اثر لیتے! میں نے ایک بار انہیں خط لکھا کہ حضرت! آپ پہلے شخص ہیں جن کی طنز و تعریض کا میں جواب نہیں دیتا ورنہ طبیعت و مزاج کی تیزی اور رکھ رکھاؤ میں آپ سے کم نہیں کچھ بڑھ کر ہی ہوں۔

ضلع ایٹہ کی تحصیل کاسگنج ہے، یہ قصبہ (کاسگنج) ضلع کے صدر مقام (ایٹہ) سے آبادی میں زیادہ ہے۔ یہاں ندری کا پل دیکھنے کے قابل ہے، کاسگنج کے قریب ہی ایک بستی سوروں ہے، جو گنگا کی وجہ سے ہندوؤں کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے، یہی سوروں تسکین صاحب کا وطن اور مولد و منشا ہے۔ وہ فصل ربیع کے موقع پر سال کے سال سوروں جاتے اور اپنے آبائی مکان میں ڈیڑھ دو مہینے قیام فرماتے۔

تسکین قریشی ترنّم سے شعر پڑھتے تھے۔ مگر وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے۔ اُن کا کلام معیاری، غزلیں تغزل کا حسین و دلکش نمونہ، زبان پر پوری طرح قدرت اور اظہار و بیان میں مشاق۔

رندی و میکشی کارِ آساں نہ تھا ہائے وہ رند جو پارسا ہو گیا
مجھے تو غمِ پائمالی نہ تھا انہیں کے قدم ڈگمگانے لگے

اس قسم کے سینکڑوں نشتر ان کے کلام میں ملتے ہیں!

خط پاکیزہ اور دیدہ زیب، مطالعہ وسیع، صحیح العقیدہ، صوم و صلوٰۃ کے پابند دینی فکر کے ساتھ دینی زندگی بھی! اُن کی صورت متأثر کرنے والی نہ تھی مگر ان کی سیرت نہایت حسین تھی! اور زندگی میں اصل اعتبار سیرت و کرداری کا ہے۔

ڈیڑھ دو سال سے بیمار رہنے لگے تھے، مجھے کئی بار لکھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے! اب سے تقریباً دو ماہ پہلے میں نے خط میں اُن سے تازہ کلام بھیجنے کی فرمائش کی، اُس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اب آخری وقت ہے شعر و شاعری کا موقع اب کہاں ہے...... (خط اُنہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ مگر تحریر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لکھنے والے نے شدید اضطراب و اضمحلال کے عالم میں یہ چند سطریں بڑی مشکل سے لکھی ہیں۔ اس کے بعد اُن کا کوئی خط نہیں آیا یہ اُن کی آخری تحریر تھی۔

تسکین قریشی مرحوم کے بھتیجے محمد یامین قریشی کا لکھا ہوا کارڈ امیر گلاؤ ٹھوی اور راقم الحروف کے نام آیا جس میں تحریر تھا۔

" محترم جناب قبلہ تایا صاحب (تسکین قریشی صاحب) کا ۲۴ جون بوقت ۶ بجے صبح قلیل علالت کے بعد انتقال ہو گیا" [۱]

کتنی غمناک اطلاع! کیسی دلدوز خبر، مگر صبر کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے! ہم جو اُن کے ماتم گسار دوست رہ گئے ہیں، وہ اب کے دن کے مہمان ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ فرمائے (آمین) (ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۷۱ء)

---

[۱] اس کارڈ میں پتہ کی جانب میرا نام تسکین مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ان کی انتہائی محبت تھی کہ بسترِ مرگ پر بھی اس نیاز مند کو یاد رکھا۔ (م۔ق)

علامہ تمنّا عمادی پھلواروی

رسائل و جرائد کے ذریعہ علامہ تمنّا عمادی سے غائبانہ تعارف تو تھا مگر اُن سے پہلی بار ملاقات حیدرآباد دکن میں ہوئی، حافظہ میں سن و سال ٹھیک طرح کہاں محفوظ رہتے ہیں۔ غالباً ۱۹۴۱ء سنہ تھا، علامہ مرحوم سید عبدالعزیز[1] وزیر قانون و عدالت کی کوٹھی میں قیام فرما تھے، سید صاحب نے دعوت میں مجھے بلایا، وہاں علامہ تمنّا سے ملاقات ہوئی ا بقیہ حیدرآباد

---

[1] سید عبدالعزیز مرحوم پٹنہ کے مشہور ایڈووکیٹ تھے، مسلم لیگ کے چوٹی کے لیڈروں میں اُن کا شمار ہوتا تھا، ان کی مہمان نوازی کی بڑی شہرت تھی۔ مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ میں ہوتا تو اُن کی کوٹھی "مہمان خانہ" بن جاتی، حکومتِ حیدرآباد دکن میں کئی سال محکمہ قانون و عدالت کے وزیر رہے، اسلام و ملت کی خیر خواہی کا شدید جذبہ رکھتے تھے، دوسروں کو کھلانے پلانے اور خود بھی ذائقہ دار کھانوں کا شوق تھا راقم الحروف کو اپنے یہاں دعوتوں میں یاد فرمایا کرتے تھے، ساری عمر تجرد میں گزار دی، بال بچوں اور شادی بیاہ کے بکھیڑوں سے اپنے کو دور ہی رکھا۔ کشادہ دست اور فیاض تھے، نادار طلبہ اور ضرورت مندوں کی خاموشی کے ساتھ امداد کرتے، غسلخانے میں نہلاتے میں پاؤں پھسل گیا اور ایسی چوٹ لگی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ برسوں صاحبِ فراش رہے غالباً ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے، میں بنگلور کے مشاعرے میں گیا ہوا تھا۔ سید عبدالعزیز مرحوم علاج اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے بنگلور میں قیام فرما تھے۔ میرے وہاں پہنچنے کی خبر سُن کر دوپہر کے کھانے پر مدعو فرمایا، مشہور آرکٹیک مسٹر مرچنٹ جنھوں نے قائدِ اعظم کے مزار کا نقشہ مرتب کیا تھا۔ اُن کی بیگم "روضہ" سید صاحب مرحوم کی تیمار دار تھیں؛ کھانے میں سب سے پہلے سیخ کباب آئے جن سے شعلے نکل رہے تھے، میں نے سید عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حال ہی میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی اس میں روس شہنشاہ اور اُن کے اُمرا اسی قسم کا "شعلہ خیز گوشت" کھا رہے تھے، آپ کے باورچی نے غالباً وہ فلم دیکھی ہو گی۔ سید صاحب اس پر مسکرانے لگے۔

کی ادبی نشستوں میں اُن سے ملنا ہوتا رہا، اُن کا کلام بھی سنا۔

پاکستان بننے کے بعد کراچی اور چاٹگام میں علامہ تمنا مرحوم سے ملاقات کے مواقع میسر آتے رہے، دو تین بار میں نے انہیں چائے نوشی کی زحمت دی چند احباب کو بھی بلایا۔ مشاعرے کے سلسلہ میں چاٹگام میرا جانا ہوتا رہتا، تین چار بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے صاحبزادے کا مشرقی پاکستان میں تجارتی کاروبار تھا۔ بنگلہ، موٹر، نوکر چاکر غرض ہر طرح کا آرام، آسودگی اور راحت وسہولت انہیں میسر تھی۔ میں پہلے سے اطلاع کیے بغیر بھی اُن کے یہاں پہنچ جاتا تو بھی چائے اور اس کے ساتھ لوازمات سے تواضع فرماتے، شیرینی کے بڑے شوقین تھے۔ ایک پیالی چائے میں چار پانچ چمچے شکر ڈالنے کے بعد بھی اُن کی سیری نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اُن سے ایک بار عرض کیا کہ ہر ذہین آدمی میٹھے کو پسند کرتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی بھی بڑے "شکر خورے" تھے! میرے اِن جملوں کا انہوں نے لطف لیا۔

مشرقی پاکستان میں برسوں اُن کا قیام رہا، وہاں سے مجھے خط لکھتے رہتے راقم الحروف کی بعض تحریروں کی تعریف کر کے میری حوصلہ افزائی بھی فرماتے! چٹاگانگ سے کراچی منتقل ہونے کے بعد علامہ تمنا مرحوم نے اتنے بہت سے خطوط لکھے کہ اُن کو میں محفوظ رکھتا تو ایک کتاب تیار ہو جاتی۔ فل سکیپ سائز کے چار چار صفحے کے خط، جن کو خط نہیں "مقالے" کہنا چاہیے!

ایک بار مولوی حفیظ اللہ پھلواروی صاحب مجھے ان کے یہاں لے گئے، اسے ڈیڑھ دو سال ہوئے ہوں گے، اُن دنوں علامہ کا قیام النور سوسائٹی میں کسی عزیز کے یہاں تھا۔ مجھے چھ سات مقالے "فاران" میں چھپنے کے لیے عنایت فرمائے اور ابھی ایک مضمون کی پہلی قسط ہی شائع ہوئی تھی کہ دو مقالے ڈاک کے ذریعہ اور بھیج دیئے! میرے لیے بڑی مشکل تھی! اپنے مضامین کے نہ چھپنے کے سلسلہ میں اُن کی یاد دہانی کے کرم نامے آتے تو میں عجیب قسم کی ندامت آمیز گھٹن محسوس کرتا۔ ایک بار میں نے ہمت کر کے اُن کے کئی مضامین ڈاک کے ذریعہ واپس کر دیئے! علامہ نے میری اس حرکت پر خفگی کا اظہار نہیں فرمایا، مضامین کی رسید کے طور پر جو خط لکھا اُس میں ہلکی سی چٹکی پر اکتفا کیا۔

علامہ کا خط پختہ اور منشیانہ تھا۔ بڑھاپے سے قبل خوشخط رہے ہوں گے، مگر شیخوخت کے آخر دور (ارذل العمر) میں اُن کی تحریر کا پڑھنا مرحلۂ سخت و دشوار تھا

پھر اُن کے بعض دینی افکار و خیالات خاصے اضطراب انگیز تھے۔ اس لیے "فاران" میں اُن کے چند مضامین ہی چھپ سکے جن کو پسند کیا گیا۔ بعض حضرات نے ان مضامین کی تعریف میں مجھے خطوط لکھے اور علامہ کا پتہ بھی دریافت کیا۔

علامہ تمنّا عمادی علم و فضل کا سمندر تھے۔ اُن کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ دورِ حاضر میں اس قدر کثیر المطالعہ علماء خال خال ہی ہونگے۔ وسیع الاطراف جامع شخصیت! تجوید کے فن سے عام طور پر بڑے بڑے علماء دین واقف نہیں ہوتے مگر علامہ تمنّا اس فن میں بھی درک رکھتے تھے۔ شعر و سخن اور فن عروض میں انہیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ آخر عمر میں ہزاروں صفحے قدیم مطالعہ، یادداشت اور حافظہ کی مدد سے لکھ ڈالے! لکھنا اور مسلسل لکھنا اُن کی زندگی تھی، تحریر و انشاء ہی رات دن کا مشغلہ تھا بلکہ یوں کہیے کہ اسی شغف، جذبے اور شوق و مشغولیت کے سہارے جی رہے تھے!

امام مالکؒ ہوں، امام ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ ہوں ان تمام اکابر کے مداح بھی تھے اور کسی نہ کسی مسئلہ میں ناقد بھی! اپنے مطالعہ اور تفکر و تدبر پر انہیں بڑا اعتماد تھا! ایک بار مجھ سے فرمایا، کہ بھئی! اہل حدیث ہوں یا دوسرے فقہی مذاہب کہیں نہ کہیں اُن سے میرا اختلاف ضرور ہے! اپنا تو مسلک ہی سب سے جدا ہے۔

علامہ تمنّا کے مضامین بہت دنوں تک "طلوعِ اسلام" میں چھپتے رہے ہیں اور مسٹر پرویز کے "انکارِ سُنّت" کے مسلکِ ضلال کو تمنّا مرحوم کے مقالات سے غذا ملی ہے۔ مشہور محدث ابن شہاب زُہری کو انہوں نے خاص طور سے مجروح کرنے میں بڑی تیزی دکھائی ہے مگر اب چند سال سے جو مضامین لکھے اُن میں سُنّتِ رسولؐ کو دین میں حجت مان کر اپنی سابقہ لغزشوں کا کفارہ ادا کیا، لیکن احادیث کے بارے میں اُن کے ذہن میں جو اشتباہ اور وہم پیدا ہوگیا تھا۔ اُس کا اثر باقی رہ گیا تھا۔ احادیث اور سُنّتِ نبوی کا دفاع اور تائید و حمایت کرتے کرتے بعض قابلِ ذکر راویانِ حدیث کے لیے کذاب اور جعل ساز کے الفاظ بھی اُن کے قلم سے نکل جاتے۔

مسٹر پرویز کی "لغات القرآن" پر علامہ تمنّا عمادی نے بڑی کس کر تنقید کی ہے۔ ان کے کئی مضامین "فاران" میں بھی چھپ چکے ہیں! اور اس موضوع پر نہ جانے کتنے بہت سے مضامین غیر مطبوعہ ہی رہے! علامہ تمنّا عمادی نے اپنے مضامین میں علمی استدلال

کے ساتھ ثابت کیا کہ "لغات القرآن" کا لکھنے والا نہ قرآنی علوم سے واقف ہے اور نہ عربی زبان و ادب سے باخبر ہے! قرآن کی یہ عجیب غریب لغت ہے جس میں قرآن ہی کی مخالفت کی گئی ہے اور ڈارون اور مارکس جیسے یہودی اور بے دین مفکرین کے افکار و خیالات کی تائید میں زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ علامہ تمنا مسٹر پرویز کو قرآن کریم کا معنوی محرّف سمجھتے تھے!

ایک سال پہلے کی بات ہے شام کی چائے پر مرحوم غریب خانے پر تشریف لائے۔ احادیث اور روایات کی بات چھڑی، تو میں نے عرض کیا قرآنِ پاک میں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کا ذکر آیا ہے کہ کوہ طور سے واپس آنے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آکر حضرت ہارونؑ کے بال پکڑ کر گھسیٹے ـــــ تو یہ واقعہ اگر "حدیث" میں ہوتا تو احادیث کے جلد باز ناقدین جھٹ سے کہہ دیتے کہ نبی کی سیرت اور مزاج و کردار ایسے فعل کے صدور سے مطابقت نہیں کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ "اُمّی" نہیں خواندہ (لکھا پڑھا) سمجھتے تھے اور اس پر انہیں بڑا اصرار تھا، ایک خاصی ضخیم کتاب بھی انہوں نے اس موضوع پر تصنیف کر ڈالی! میں نے خط میں بھی لکھا اور زبانی بھی عرض کیا کہ آپ کا یہ خیال غلط اور نادرست ہے اور جمہور امت کے مسلمہ عقیدہ کے خلاف ہے۔ میں نے کہا اگر حضورؐ لکھنا پڑھنا جانتے تو کوئی صحابی تو بیان کرتا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھتے اور پڑھتے دیکھا تھا، کیا صحابہؓ (معاذ اللہ) ان واقعات کو دانستہ چھپا گئے! جبکہ صحابہ کرام نے حضورؐ کی ایک ایک ادا، لب و لہجہ اور نطق وحی ترجمان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھا اور اس مقدس خزانے کو دوسروں تک پہنچایا ـــــ اس مسئلہ کو خالص درایت کی روشنی میں سوچنا چاہیے! مگر انہوں نے پھر مجھے ایک طویل خط لکھا اور اپنے خیال و فکر کے درست ہونے پر اصرار کیا۔

محمود عباسی صاحب جو "ناصبیت" میں خاصے مشہور ہیں۔ وہ دراصل مذہبی آدمی نہیں ہیں، ان کے بعض قریبی عزیزوں نے مجھ سے کہا کہ محمود عباسی صاحب تو لادینی خیالات رکھتے ہیں اور اپنی پرائیویٹ محفلوں میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پر کھلی ہوئی طنز بلکہ تنقیص کرتے ہیں! مگر علامہ تمنا عمادی سے

پیر تک دینی آدمی تھے اور حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد امجاد کے لیے دل میں جذبۂ احترام رکھتے تھے لیکن شیعیت کی ضد اور مخالفت نے اُن کو اس سطح تک پہنچا دیا کہ سات ہزار اشعار[1] جمل، صفین اور حرہ و کربلا کے تاریخی واقعات پر کہے اور اُن کو "القصیدہ الزہرا" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا! اپنی اس کتاب پر انہوں نے طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ جو روایتیں امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ رضی اللہ عنہم اور مروان و یزید کے بارے میں مشہور ہیں وہ شیعی مؤرخین کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ واقدی اور کلبی تو الگ رہے وہ ہشام اور سدی کو بھی کاذب کہتے ہیں۔

اس کتاب[2] میں علامہ تمنا عمادی، محمود عباسی کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ کربلا میں حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا جو حق پرستانہ موقف تھا اُسے وہ "خطائے اجتہادی" سمجھتے تھے۔ یزید کی ولی عہدی جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شدید لغزش ہے اس کو بھی علامہ نے جائز ثابت کیا ہے ـــ ان معاملات میں اُن کا تشدد اتنا مکروہ ہو گیا ہے کہ مروان اور یزید جیسے رسوائے زمانہ حاکموں کے ناموں کے ساتھ "حضرت" اور "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ امیر معاویہؓ اور ان کے مشیروں پر کوئی الزام نہ آنے پائے چاہے ایسا کرنے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا موقف غبار آلود ہو جائے! یہ لغزشیں کفر و شرک تو نہیں ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس

---

[1] تمنا عمادی بڑے پر گو اور مشاق شاعر تھے۔ زود گوئی کا یہ عالم کہ نثر کی طرح شعر لکھتے، شعر و سخن کی نزاکتوں پر بھی اُن کی نگاہ تھی۔ نیاز فتحپوری نے جگر مراد آبادی کی شاعری پر جو کمزور اور سطحی اعتراضات کیے تھے، اُن کا راقم الحروف نے جواب دیا، ماہنامہ "نیم روز" میں علامہ عمادی نے اس پر محاکمہ فرمایا اور میری رائے سے اکثر و بیشتر مقامات پر اتفاق کیا۔

[2] کوئی شک نہیں "القصیدہ الزہرا" کے مقدمہ کا انداز محققانہ ہے بعض باتیں دل کو لگتی ہیں مگر علیؓ و معاویہؓ کی نزاع میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور جو تحقیق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو "خطاکار" ٹھہرائے وہ تحقیق کوئی وزن نہیں رکھتی! حضرت حسینؓ اُمت کے محبوب و مخدوم ہیں اور یزید و مروان مبغوض اور ناپسندیدہ شخصیتیں ہیں۔

قسم کے خیالات پر قیامت میں بازپرس ہوئی تو اس کا وہ کیا جواب دیں گے ۔

علامہ تمنا عمادی مرحوم اسلام اور ملت کی خیر خواہی کا بڑا شدید جذبہ رکھتے تھے، دین اُن کی گھٹی میں پڑا تھا! نماز میں " اللہ اکبر " بڑے ہی سوز و درد کے لہجہ میں اُن کے منہ سے نکلتا! اپنی اہلیہ کے انتقال پر مجھے خط لکھا کہ کینسر کا مریض ہوں اور میرا بھی اب چل چلاؤ کا وقت ہے! اُن کا گمان ٹھیک نکلا، اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا، عمر نوّے کے قریب پائی ۔ اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں سے درگزر فرمائے ۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۳ء)

مولوی تمیز الدین خاں

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم کو میں نے سب سے پہلے کراچی کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں دیکھا، ایک ہی اسٹیج پر وہ بہ حیثیت صدر کے فرد کش ہیں، اور میں مقررین اور شعراء کی صف میں بیٹھا ہوں، دور ہی سے علیک سلیک ہو جاتی، ایک آدھ بار مصافحہ بھی ہوا، سرکاری عہدیداروں اور بڑے آدمیوں سے قریب ہونے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی، یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میری کوشش کے بغیر میسّر آ گئے! ہاں! یہ ضرور ہے کہ اسلامی وضع قطع کو دیکھ کر طبیعت اُن کی طرف کھنچتی تھی، مسٹر غلام محمد (سابق گورنر جنرل) نے جب اسمبلی کو توڑا ہے، اُس کے بعد مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں مولوی تمیز الدین خاں مرحوم کا آنا جانا رہا اور وہاں اُن سے ملنے کے موقعے بارہا ملے! جب بھی مرحوم سے ملاقات ہوتی وہ بڑی شفقت اور محبّت سے ملتے!

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم جمعیتہ الفلاح کے سرپرست، صدر اور بانی تھے، جمعیتہ کی پارٹیوں اور جلسوں میں مولوی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوتی رہتی۔ میں نے کئی بار اُن کی موجودگی میں نظمیں سنائیں، اُن کی مادری زبان بنگالی تھی مگر اردو شاعری سے وہ دلچسپی رکھتے تھے، ایک دفعہ جمعیتہ الفلاح میں نعتیہ مشاعرہ بھی ہوا، اور مولوی صاحب مرحوم آخری وقت تک مشاعرے میں بیٹھے رہے۔

جمعیتہ الفلاح کی طرف سے ایک بار شب میں دعوت کا اہتمام ہوا، کھانے کے بعد مولوی تمیز الدین خاں نے اردو میں تقریر فرمائی۔ بولے جمعیتہ الفلاح کے کسی جلسہ میں اتنا مجمع نہیں ہوا، جتنا آج کی دعوت میں ہوا ہے، بھائیو! لوگوں کی طبیعت کا یہی رنگ ہے تو اب جمعیتہ کے جلسہ کے ساتھ کھانا بھی رہے گا، کیا کیا جائے......! اُن کی تقریر بڑی دلچسپ تھی، سب لوگ مسکرانے لگے اور کوئی کوئی ہنس بھی دیا —— مرحوم سے

آخری ملاقات چند ماہ قبل جمعیتہ الفلاح کے ایک اجتماع میں ہوئی۔ امریکہ کے سفیر کے علاوہ بعض دوسرے سفراء بھی اس جلسہ میں خصوصی مہمانوں کی حیثیت سے شریک تھے!

پاکستان کے مفلوج بدنام گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو توڑا ہے، وہ وقت مولوی تمیز الدین خاں کے لیے بہت نازک تھا۔ اُن کی کوٹھی کا ٹیلی فون کاٹ دیا گیا، سکندر مرزا جو اُن دنوں محکمہ فوج کے سکریٹری تھے مسٹر ابوطالب نقوی کے ساتھ مولوی صاحب مرحوم کے یہاں پہنچے، اور بڑی بدتمیزی سے گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب! آپ اب اسمبلی کے اسپیکر نہیں رہے آپ گورنر جنرل کے حکم کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی نہ کریں، ورنہ آپ کو شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ مولوی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ "میں اپنا یہ معاملہ قانونی مشیروں کے سپرد کر چکا ہوں ....." یہ تک سننے میں آیا کہ مولوی صاحب مرحوم ان دنوں گرفتار ہوتے ہوتے رہ گئے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے آرڈی ننس کے خلاف اس وقت عدالت میں دعویٰ دائر کیا جب استبداد کی تلوار لٹک رہی تھی! مولوی صاحب مرحوم کی اس جرأت نے پاکستان میں جمہوریت کی لاج رکھ لی، پاکستان کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی مولوی تمیز الدین خاں کی عزیمت و استقامت کو ہر مؤرخ خراجِ عقیدت و منقبت پیش کریگا۔

مولوی صاحب مرحوم اپنے خاندان کے ضرورت مند لوگوں کی مالی امداد بڑی فراخ دلی کے ساتھ کیا کرتے تھے جس کے سبب وہ اسمبلی کی صدارت کے زمانے میں بھی زیادہ خوشحال نہیں رہے، تنخواہ پوری کی پوری ٹھکانے لگ جاتی، اس حادثہ کے بعد وہ مالی مشکلات میں گھر گئے۔ اپنی زمین اور موٹر کار تک انہیں بیچ دینی پڑی، یہ زمانہ انھوں نے بڑے شکر و صبر کے ساتھ گزارا، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بنیادی جمہوریتوں کے واسطہ سے جو انتخابات ہوئے تو اس میں وہ مرکزی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے اور قصر نشینوں کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم ارکانِ دستوریہ نے اسمبلی کی صدارت کے لیے انہی کا انتخاب کیا ——— حق بہ حق دار رسید ——— کس عزت، شان اور وقار کے ساتھ وہ اپنی چھینی ہوئی کرسی پر واپس آئے ہیں، اُن کے لیے فضا کس قدر سازگار ہو گئی تھی، پاکستان کے دونوں حصوں کا انہیں کس درجہ اعتماد حاصل تھا۔ کس عزت و محبت کے ساتھ عوام میں اُن کا ذکر ہوتا تھا۔

مولوی تمیزالدین خاں مرحوم حال ہی میں کئی ملکوں کا دورہ کرکے واپس آئے تھے، مریض تو وہ پہلے ہی سے تھے اور سب سے بڑا مرض تو ان کا بڑھاپا تھا، اس دورے نے شاید اُن کے اعصاب کو متاثر کیا، بیمار پڑے، ہسپتال میں داخل ہوئے۔ مرنے سے ایک دن پہلے طبیعت بحال ہونے کی خبر اخباروں میں آئی اور دوسرے دن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے! اُن کے سوگ میں پاکستان کے جھنڈے جھکا دیے گئے۔ ریڈیو میں گانے بجانے کا پروگرام بند کرکے قرآن کی تلاوت شروع کردی گئی، بڑے بڑے لوگوں نے اُن کی موت کو پاکستان کے لیے ناقابلِ تلافی حادثہ کہا، ہرطرف مرحوم کا ذکر، یہی چرچا! اخباروں نے ماتم کیا اور لیڈروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مرنے سے پہلے وصیت کی کہ "میرے جنازے کا فوٹو نہ لیا جائے۔" اُن کی وصیت پوری کی گئی۔ اللہ اللہ! نزع کے عالم میں شریعت کا اس قدر پاس اور احترام!

مولوی تمیزالدین خاں مرحوم نے اس بے یقینی کے دَور میں ثابت کر دکھایا بلکہ مثال قائم کردی کہ ایمان کی قوت آج بھی کتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہے، ایمانی طاقت کے آگے حکومتوں کو جھکنا اور تاریخ کو اپنا رُخ بدلنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور آخرت میں انھیں صالحین کا قرب اور ہم نشینی نصیب ہو۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۶۳ء)

پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی

اس واقعہ کو پچاس برس سے بھی زیادہ زمانہ ہوا، جب لاہور سے "تعلیم و تربیت" نام کا ایک رسالہ شائع ہوتا تھا، اُس میں جوشؔ ملسیانی کا کلام نظر سے گزرا۔ پھر کبھی کبھار دوسرے رسالوں میں بھی اُن کا کلام پڑھا! ملاقات دلی میں ہوئی، میونسپل کمیٹی ہال میں ایک مشاعرہ تھا، دلی کے انگریز ڈپٹی کمشنر بھی تشریف فرما تھے۔ جوشؔ ملسیانی کا نام پکارا گیا۔ وہ اسٹیج پر آئے، میانہ قد، سانولی رنگت، کرتے پہ موٹے کپڑے کا کوٹ پہنے ہوئے، جس کی جیبوں میں کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ غزل شروع کرنے سے پہلے "عرض کرتا ہوں" خاص انداز اور لب لہجہ میں کہا جسے سُن کر سامعین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آگئی۔ غزل بھی اپنے طرز کی نرالی تھی جس کی ردیف دو بٹے تین (۲/۳) تھی۔

......بشر میں بھی ہے شر ۲/۳

ہر مصرعہ میں غزل کی ردیف ۲/۳ کا نباہنا کتنا مشکل کام تھا مگر جوشؔ ملسیانی کی قدرتِ بیان نے اس ردیف کو نباہ کر دکھایا۔ داد ملی! لیکن اس میں قدرے مزاح بھی شامل تھا! ۱۹۴۵ء کے اس مشاعرے کے بعد دو تین مشاعروں میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ شروع شروع میں غالباً کسی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے۔ انہیں زیادہ مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ماحول جوانی میں میسر نہ آسکا! مگر بچپن سے شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے اُن کے اس انتخاب کی داد دینی چاہیئے کہ جہاں استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ کو استادی کے لیے منتخب کیا۔ یہ ان کا دورِ شباب تھا۔ استاد (داغ) کی وہ بے حد عزت کرتے تھے۔ ہندو مذہب میں گرو کا جو درجہ ہے۔ داغ سے وہ اسی قسم کی عقیدت رکھتے تھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد بھارت میں جن سنگھیوں کے شدید تعصب نے اردو دشمنی کی فضا پیدا کردی مگر اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ہندوستان میں بکثرت مشاعرے ہونے لگے اور جن شاعروں کو تقسیم ہند سے قبل کسی بڑے مشاعرے میں نہیں بلایا جاتا تھا، اب ان کو ہر مشاعرے میں

بڑے اصرار کے ساتھ بلایا جاتا۔ جناب لبھورام جوشؔ ملسیانی معمر استاد تھے، اب ان کی بھی مشاعروں میں خاصی پذیرائی ہونے لگی، اس طرح اُن کی آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا۔ حکومت ہند نے اُن کا ڈیڑھ سو یا دو سو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ضلع جالندھر کے قصبہ نکودر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پنجاب ان کا مولد و منشا تھا مگر صحت زبان میں سند مانے جاتے تھے، فن عروض میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ راقم الحروف ان کی خدمت میں عروض کے بارے میں استفسار کرتا رہتا اور وہ بروقت جواب دیتے، خط بہت مختصر لکھتے مگر کوئی بات گنجلک اور مبہم نہ رہنے پاتی! وہ اس دور سے گزر رہے تھے جیسے قرآن میں "ارذل العمر" فرمایا گیا ہے اس لیے ان کے کسی کسی جواب میں پیرانہ سالی کی جھلک بھی آجاتی! ان کے فرزند پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی کی عمر ۷۵ برس سے کیا کم ہو گی، وہ خوش گو شاعر اور اچھے نقاد ہیں اور جوشؔ صاحب کے صحیح جانشین ہیں۔

جناب فاضل زیدی (ایم۔اے) نے راقم الحروف کو لکھا:۔ (اور قطعہ تاریخ بھی بھیجا ہے)

"ابوالفصاحت پنڈت لبھورام جوشؔ ملسیانی نکودر ضلع جالندھر میں ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو انتقال کر گئے اُن کی عمر ۹۴ سال کی تھی، جوشؔ صاحب سے آپ کے مراسم تھے فاران میں ان کے متعلق کچھ لکھیئے۔

قطعہ تاریخ وفات جوشؔ ملسیانی

ولادت یکم فروری ۱۸۸۲ء — وفات ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

چل بسے جوشؔ ملسیانی بھی — آج رخصت ہوئی بہارِ داغؔ
ہائے! افسوس صد ہزار افسوس — خاک ہو جسم یادگارِ داغؔ
۱۹۷۶ء

پنڈت لبھورام جوشؔ ملسیانی کی ہر غزل میں دو چار اشعار ایسے ضرور ہوتے کہ اُن کو پڑھ کر دل اثر قبول کرتا۔ اندازِ بیان اور فکر دونوں جاذبِ توجہ! داغؔ کے صف اوّل کے ممتاز شاگردوں کی فہرست میں اُن کا نام آنا چاہیئے۔ بزم داغؔ کے وہ آخری چراغ تھے، جسے بادِ مرگ نے ہمیشہ کے لیئے بجھا دیا مگر اپنے کلام میں وہ زندہ رہیں گے۔ موت تو وہ "این جہانی" سے "آں جہانی" ہو گئے۔ بھارت کے رسالوں میں انہیں سرگباشی اور بیکنٹھ بگری لکھا گیا۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۶ء)

مسٹر حاتم علوی

۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، جب یہاں کراچی میں بہت بڑے پیمانے پر کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ روش صدیقی مرحوم، اور راقم الحروف نعمان تاثیر کے یہاں ٹھہرے! اُن کا فلیٹ پلازا سینما کے قریب صفرا منزل میں تھا، فلیٹ کے اوپر تیسری منزل پر جو کمرہ تھا وہ (SUMMER HOUSE) کہلاتا تھا، اُسی میں ہم دونوں شاعروں کو ٹھہرایا گیا۔

کراچی میں قادری مشائخ کے گھرانے کے ایک فرد صاحبزادہ بشیر مخفی القادری تھے، علامہ اقبالؒ پر اُن کے مضامین رسالوں میں چھپتے رہتے تھے، ایک دو کتابوں کے مصنف بھی۔ اُن سے میری خط و کتابت تھی، میں اُن دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ نعمان تاثیر صاحب سے میں نے اُن کا ذکر کیا تو وہ بولے روش صدیقی صاحب حاتم علوی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، ہم اُن کے یہاں پہلے چلیں گے اور وہاں سے سولجر بازار! اسی محلہ میں قادری مسجد کے متصل صاحبزادہ مخفی القادری کی رہائش گاہ ہے، روش صدیقی، نعمان تاثیر اور راقم الحروف حاتم علوی صاحب کے یہاں پہنچے، بڑے تپاک سے ملے اور تازہ چھاچھ سے ہماری تواضع کی، ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی! پھر صاحبزادہ صاحب سے اُن کے یہاں جاکر ملاقات کی! برسوں ہو گئے صاحبزادہ بشیر مخفی القادری کی کوئی خیر خبر نہیں ملی! خدا کرے زندہ ہوں اور خیریت سے ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی طرح مجھے بھی وطن چھوڑنا پڑا، مجھے یاد پڑتا ہے کسی دعوت میں حاتم علوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیکھتے ہی بڑھ کر معانقہ کیا اور مزاج پرسی فرمائی۔ پھر ان سے ملنے جلنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، یہاں تک کہ ان ملاقاتوں نے دوستی کی شکل اختیار کرلی۔ جب بھی ملنا ہوتا اکثر و بیشتر پاکستان کے حالات پر گفتگو رہتی! یہ موضوع جتنا دلچسپ تھا اتنا ہی خلش انگیز

بھی تھا، ملک کے حالات ہر دَور میں تشویشناک رہے ہیں اس کے ذکر سے ایسا محسوس ہوتا جیسے ہم اپنے ہی زخموں کو چھیڑ رہے ہیں۔

حاتم علوی مرحوم نے نوجوانی کے زمانہ ہی سے قومی اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، اُن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، ترکِ موالات اور بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک زوروں پر تھی علوی صاحب نے اپنے اور اپنی اہلیہ کے ہزارہا روپیہ کی قیمت کے کپڑے نذرِ آتش کر دیئے! وہ اپنی پچھلی زندگی کے واقعات مجھے سنایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے لیڈروں سے ان کے روابط کا یہ عالم تھا کہ احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں گاندھی جی کے مہمان رہتے۔ ایک بار وہ شب میں احمد آباد پہنچے اور سفر کی تکان کے سبب جلد سو گئے۔ شب میں محسوس کیا کہ کوئی شخص اُن کے جسم کو چھو رہا ہے وہ نیند سے چونکے تو دیکھا کہ گاندھی جی آہستہ آہستہ انہیں کمبل اُڑھا رہے ہیں۔ یہ اٹھنے لگے تو گاندھی جی شفقت آمیز انداز میں بولے" حاتم! تم سفر سے تھکے ہوئے ہو، لیٹے رہو، تمہارا جسم کھلا ہوا دیکھ کر میں نے کمبل ڈالنے کی ضرورت محسوس کی، جاڑے میں ٹھنڈی ہوا لگ جانے سے آدمی بیمار پڑ سکتا ہے۔

جن دنوں رئیس الاحرار مولانا محمد علی کا مشہور انگریزی اخبار " کامریڈ" اور اُس کے بعد اردو روزنامہ ہمدرد دہلی سے نکلتا تھا، اس زمانے میں حاتم علوی جب کبھی دلی جاتے تو مولانا محمد علی کے یہاں کامریڈ آفس میں ٹھہرتے، مولانا محمد علی کا یہ معمول تھا کہ تانگہ کا کرایہ وہ خود ادا کرتے، ایک بار ایسا ہوا کہ تانگہ کھڑا ہوا ہے مگر اندر سے ملازم تانگہ کا کرایہ لے کر نہیں آیا۔ حاتم علوی سمجھ گئے کہ قوم کے اس عظیم رہنما کے یہاں ان دنوں تنگدستی کا دور دَورہ ہے چنانچہ تانگہ کا کرایہ انہوں نے تانگہ والے کو اپنے پاس سے دے دیا۔

فرماتے تھے کہ تقسیم ہند سے برسوں پہلے مولانا شوکت علی کراچی تشریف لائے میں نے شب میں اُن کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا۔ مولانا شوکت علی کھانا کھا کر لوگوں سے باتیں کرتے کرتے سو گئے، جانے لگے تو بولے حاتم! تمہارے یہاں کوفتے بہت لذیذ تھے۔ بے حد لذیذ تھے، میں نے بچے ہوئے کوفتوں کی دیگچی کار میں رکھوادی۔

شہیدِ ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں کے زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کراچی آئے تو میں نے حاتم علوی صاحب سے پوچھا کہ پنڈت جی سے آپ کی ملاقات ہوئی؟

آپ کے اور ان کے تو خاصے مراسم ہیں؟ بولے پنڈت جواہر لال نہرو جب بھی کراچی آتے تو مجھ سے ضرور ملتے ــــ مگر اب جبکہ وہ ہندوستان کے وزیراعظم ہیں نہ تو حسب معمول مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اور نہ مجھے فون کیا، اس لیے میں نے بھی اُن سے ربط قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ہندوستان اور پاکستان کی نامی گرامی شخصیتوں سے حاتم علوی مرحوم کے روابط و تعلقات تھے، اب سے کوئی چھ برس پہلے کی بات ہے ایک دن میں اُن کے یہاں ملنے کے لیے گیا۔ ان کی کوٹھی کے لان میں ہم دونوں باتیں کر رہے تھے اتنے میں ملازم نے آکر کہا کہ آپ کا فون آیا ہے، وہ وہاں سے اٹھ کر اندر گئے، واپس آکر بولے ذوالفقار علی بھٹو کا فون تھا میں نے اُن سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنے ایک دوست سے گفتگو میں مصروف ہوں۔

ہر حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے اُن کے روابط رہتے، اس لیے اندرونی حالات کی ٹوہ اور خیر خبر اُنہیں ملتی رہتی۔ مثلاً مسٹر چندریگر پاکستان کی سب سے پہلی کابینہ کے وزیر تجارت تھے، وہ کس لیے اس عہدے سے سبکدوش کیے گئے؟ اُس کی تفصیل مجھے بتائی۔ میں نے عرض کیا مگر افغانستان میں حکومت پاکستان کی سفارت پر اُن کا تقرر، یہ بھی تو بہت بڑا عہدہ تھا؟ اس کی توجیہہ اُن کا سکوت تھا۔

دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں بعض جانی پہچانی شخصیتوں کا بھی ذکر کسی نہ کسی عنوان سے آہی جاتا ہے اسے "غیبت" بھی کہا جاسکتا ہے اور نہیں بھی کہا جاسکتا اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہو تو شخصیتوں کی سیرت و کردار پر حجابات پڑے رہیں اور تصویر کا دوسرا رُخ نمایاں نہ ہونے پائے! زبانی روایتوں کے لوازمہ (میٹریل) ہی سے تذکرے، تاریخیں اور سوانح عمریاں مرتب ہوئی ہیں، جن کے مطالعہ سے اہم اور نامور شخصیتوں کے بارے میں جان سکتے ہیں کہ وہ کیا تھیں؟

صوبہ سندھ بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ ہوکر مستقل صوبہ بن چکا تو بڑے بڑے عہدوں کا تغیر و تبدل ہوتا رہا، اس سلسلہ میں کراچی کی ایک بڑی شخصیت کے بارے میں مسٹر حاتم علوی نے بتایا، اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ پچاس ہزار سے کم کی رشوت قبول نہیں کریں گے، اس عہد و پیمان کا مقصد یہ تھا کہ اُس زمانہ میں جب روپیہ

کی قیمت اب سے دسیوں گنا زاید تھی۔ اتنی بھاری رشوت لینے کے بہت ہی کم مواقع ملیں گے، اس طرح چھوٹی چھوٹی رشوتیں لینے سے وہ ذاتِ شریف باز رہیں گے اور بہت سے بندگانِ خدا کو رشوت کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔

مسٹر حاتم علوی کو پاکستان سے انتہائی محبت اور قلبی لگاؤ تھا۔ پاکستان کی ترقی اور استحکام و بقا کے لیے وہ اپنی استطاعت کی حد تک کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے، انہوں نے ہر دورِ حکومت میں اس جرأت کا اظہار کیا کہ حکومت کی کسی غلط پالیسی یا قابلِ احتساب روش پر اپنے تاثرات اربابِ حکومت کو لکھ کر بھیج دیا کرتے۔ راقم الحروف سے انہوں نے کہا کہ دو برس قبل (غالباً) کسی وزیر نے جو یہ اعلان فرمایا تھا کہ ہم دو کروڑ کوارٹر بنا کر بے گھروں کو آباد کر دیں گے، اس پر میں نے انہیں خط لکھا کہ حکومت پاکستان کے پچاس برس کے بجٹ کی مجموعی رقم میں دو کروڑ کوارٹر بن سکیں گے؟ اس قسم کے ناقابلِ عمل منصوبوں کے اعلانات کا عوام و خواص پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔

جب ایوب خاں برسرِ اقتدار آئے تو مسٹر حاتم علوی نے مجھ سے بیان کیا کہ وزارتِ خزانہ کے لیے اوپر سے اشارہ ہوا ہے مگر میں نے یہ شرط لگائی ہے کہ فوج کے اخراجات میں تخفیف کا وعدہ کیا جائے تو میں اس خدمت کو قبول کروں گا۔ میں نے مولانا ظفر احمد انصاری سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس پر فرمایا کہ یہ واقعہ صحیح ہے تو حاتم علوی صاحب کی یہ شرط تدبیر کے نقطۂ نظر سے صحیح نہ تھی، ایک فوجی ڈکٹیٹر جو فوج کے بل بوتے پر اقتدار میں آیا ہے اُسی فوج کے بجٹ میں تخفیف کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔

فلسطین کا مسئلہ جب مجلسِ اقوام میں پیش تھا تو حاتم علوی مرحوم بھی حکومت پاکستان کی طرف سے بہ کارِ خاص متعین تھے۔ وہ بڑے افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ بعض عرب حکومتوں کے بعض ترجمان کلب گھروں میں راتیں یہودی لڑکیوں کی معیت میں گزارتے تھے اور دوسرے دن مجلسِ اقوام میں فلسطین کے مسئلہ کی وکالت فرماتے تھے۔

دنیا کے تمام براعظموں کی انہوں نے سیاحت کی تھی۔ تقریباً ہر سال بیرونِ ملک جاتے رہتے، راقم الحروف کو ماسکو سے، امریکہ اور انگلستان سے خط بھیجے۔ ایک بار عید الفطر کے موقع پر لندن سے مجھے لکھا کہ یہ پہلا موقع ہے جب عید پر ہم ایک دوسرے کی ملاقات سے محروم رہیں گے! جب وہ پہلی بار روس گئے تو وہاں سے

آکر اس سفر کے واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ سنائیے! جو خاتون روسی حکومت کی طرف سے اُن کی ترجمان اور گائڈ تھی وہ اردو جانتی تھی۔ حاتم علوی صاحب نے اس خاتون سے کہا کہ میں لینن کے مقبرے کی زیارت کو جانا چاہتا ہوں، مگر میں موٹر میں نہیں جاؤں گا۔ ہم مشرقی مسلمان ہیں بڑے آدمیوں کے مقبروں اور یادگاروں کی زیارت کے لیے پاپیادہ جاتے ہیں! روس کی وہ خاتون گائڈ علوی صاحب کو قریب کے راستوں سے لے گئی جہاں غریبوں اور ناداروں کے انتہائی تنگ و تاریک مکان اور شکستہ در و دیوار دیکھنے میں آئے، مسٹر حاتم علوی یہی منظر دیکھنا چاہتے تھے کہ کیمونزم کی نام نہاد جنت میں بھی غریب غربا دوزخ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

معاہدۂ تاشقند کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو بڑے تاسف کا اظہار فرمایا، یہ بھی کہا کہ سفیر روس نے اس معاہدے کے بارے میں میرے تاثرات دریافت کیے تھے، میں نے وہی کہا جو میرے ضمیر کی آواز تھی! پھر دو تین دن کے بعد مسٹر حاتم علوی سے ملنا ہوا اور میں نے غم انگیز لہجہ میں پوچھا کہ اس معاہدے کا پس منظر آخر کیا ہے؟ آپ کو تو کچھ سن گن ملی ہوگی، اس پر انہوں نے مجھے محکمہ تجارت کے ایک مراسلہ کی ایک نقل دکھائی جس میں امریکہ سے لاکھوں ڈالر کے موٹر کے (SPARE PARTS) درآمد کرنے کی منظوری درج تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ رقم امریکن ایڈ سے ادا کی جائے گی۔ ..... بولے اس تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے! پھر مجھ سے فرمایا کہ یہ اشد ترین راز ہے اس کا آپ کسی سے ذکر نہ کریں، میں نے عرض کیا جماعت اسلامی کراچی کے امیر چوہدری غلام محمد سے آپ کے بھی تعلقات ہیں۔ بس اُن سے اس واقعہ کا ذکر کروں گا! بولے ہاں! وہ سنجیدہ اور قابل اعتماد شخص ہیں، میری زبان سے یہ تفصیل سُن کر چوہدری صاحب مسٹر علوی سے ملے اور ان سے بھی اُنہوں نے وہی کہا جو مجھ سے کہا تھا!

بلند پایہ سیاست داں ہو یا حکومت کے اعلیٰ عہدیدار مسٹر حاتم علوی کے سب سے تعلقات تھے، بیرونی ممالک سے وفود آتے تو ان کے ارکان بعض اوقات مرحوم سے آکر ملتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اب سے تقریباً ۲۲ برس قبل حکومت پاکستان نے جرمن کے کسی ماہر اقتصادیات کو پاکستان آنے کی دعوت دی اور اُس نے

یہاں کے معاش و اقتصاد اور حکومت کے جمع خرچ کے شعبوں کی سرد سے کی مسٹر حاتم علوی نے فرمایا کہ وہ صاحب مجھ سے بطور خاص ملنے کے لیے آئے تھے، بہت دیر تک تبادلہ خیالات رہا، میں نے اُن سے کہا کہ جس ملک کی ساٹھ فی صد آمدنی فوج پر خرچ ہوتی ہو اس ملک کے بجٹ کو آپ کس طرح متوازن بنائیں گے؟[1]

مسٹر علوی کی صاحبزادی کی شادی پاکستان بننے کے چند برس بعد ہوئی۔ گاندھی گارڈن میں بڑے سلیقے سے برات اور مہمانوں کے خیر مقدم اور تواضع کا انتظام کیا گیا۔ مرحوم کے تعلقات کی وسعت و گیرائی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روس اور امریکہ کے سفیر اس تقریب میں موجود تھے۔ اس سے پہلے کسی پرائیویٹ تقریب میں "آگ اور پانی" کی یہ یکجائی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ملیر کے قدیم گرانڈ ہوٹل میں مسٹر حاتم علوی نے اپنی پنجاہ سالہ کامیاب و خوشحال ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں ایک جشن کا اہتمام کیا، بڑے بڑے عہدیدار، صنعت کار، وکلاء اور دوسرے طبقوں کے مشاہیر اس دعوت میں شریک تھے۔ حوض کے چاروں طرف رنگ برنگی چھتریاں لگائی گئیں۔ اس ظہرانہ (لنچ) کے کھانے خاصے متنوع اور بڑے خوش ذائقہ تھے — فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں بیسک ڈیموکریسی کے تحت مرکزی اسمبلی کا جو الیکشن ہوا، اُس میں انہوں نے ایک اُمیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر ناکامی ہوئی! وہ کسی عہدے اور منصب کے طلب گار نہ تھے۔ ہاں! پاکستان کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے، کوئی بڑی سے بڑی مالی پیش کش اور کسی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اور منصب کا لالچ اُن کے ضمیر کو نہیں خرید سکتا تھا۔

انگریز کے دور میں جب سندھ کی تجارت پر ہندو مسلط تھے مسٹر حاتم علوی کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے اور بڑی دیانت اور حسنِ تدبیر کے ساتھ میئر بلدیہ کے فرائض انجام دیئے، کراچی کے بڑے بڑے تاجر پارسیوں سے بھی اُن کے مخلصانہ تعلقات تھے! پاکستان بننے کے بعد شروع سے ہی اسٹیٹ بنک کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور مرتے

---

[1] پاکستان اور ہندوستان کے مابین دونوں جنگوں کے بعد اُن کے خیالات بدل گئے تھے۔ اب وہ دفاع کے اخراجات میں کمی کو ملک کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

دم تک اس اعزازی منصب پر فائز رہے! زاہد حسین مرحوم گورنر اسٹیٹ بنک سے اُن کے گہرے روابط تھے، نہ جانے کتنی انجمنوں، کمیٹیوں اور رفاہی اداروں کے سرپرست اور رکن تھے یہاں تک کہ نابیناؤں کی پرورش اور فلاح و بہبود کے لیے جو ادارہ قائم تھا اس کے سرپرستوں میں اُن کا نام بھی شامل تھا! مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، انگریزی کے بہترین مقرر اور مفکر بھی! اہلِ علم کے قدرشناس، اردو سے بے پناہ شغف اور محبت تھی۔

میں ملازمت کے لیے کسی کی سفارش ان سے کرتا تو سفارشی خط لکھ دیا کرتے مگر اُن کا ہر سفارشی خط بے سود ثابت ہوا کسی اُمیدوار کی کاربرآری نہ ہو سکی۔ میں ۱۹۶۹ء میں افریقہ جانے لگا تو سوچا کہ حاتم علوی صاحب سے اسٹیٹ بنک کے جو رسمی ضوابط ہیں اس سلسلہ میں ان کی مدد لوں۔ پھر خیال آیا کہ انہوں نے خط لکھ دیا تو کیا ہوگا؟ وہ کام اللہ کے فضل سے ضابطہ کے تحت ہاتھ کے ہاتھ ہو گیا اور ان سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

شیعہ بوہروں کی جماعت سے اُن کا تعلق تھا مگر مُلّا طاہر سیف الدین کے بعض عقائد سے اُن کو اختلاف تھا۔ خلفاءِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے وہ مداح تھے اور ان نفوسِ قدسیہ پر نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتے تھے، مُلّا صاحب کو سجدہ کرنے کے بھی سخت خلاف تھے، اس لیے اُن کا شمار اس جماعت کے باغیوں[1] میں ہوتا تھا۔ اُن کی والدہ کا انتقال ہوا تو بوہرہ جماعت کے قبرستان میں اُن کی تدفین کے لیے سخت کشمکش ہوئی! اس اختلاف کے باوجود مُلّا طاہر سیف الدین صاحب کی پارسائی، تقویٰ اور علم و فضل کے معترف تھے مگر اُن کی نوابوں اور راجاؤں جیسی امیرانہ زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ایک شخص تو مُلّا صاحب کے جوتے سیدھے کرنے کی

---

[1] ۱۹۳۲ء میں جب راقم الحروف نے عراق کا سفر کیا تھا ان دنوں بمبئی میں حضرت امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین مُلّا طاہر سیف الدین صاحب کے مہمان تھے اور خان بہادر اللہ بخش ان کے کارمختار اور وکیل مطلق تھے مگر بعد میں خان بہادر اللہ بخش بھی بہتر سولی لنس مُلّا صاحب کے عقیدت مندوں میں نہیں رہے اور ان سے فرنٹ ہو گئے!

خدمت انجام دیتا ہے اور صرف اس کام کی تنخواہ پاتا ہے۔
حاتم علوی مرحوم نے گجراتی زبان میں سیرت مقدسہ پر تقسیم ہند سے قبل کوئی کتاب لکھی تھی جس پر جب وہ کتاب چھپ گئی تو چہ میگوئیاں ہوئیں اور پاکستان بننے کے بعد بوہرہ جماعت سے بھی تعلق رکھنے والے اشخاص نے احتجاج کی صورت پیدا کردی، .... رضی اللہ عنہا کے نکاح کی نسبت سے "بوڑھی گھوڑی لال لگام" کی کہاوت بھی استعمال کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مجھ سے گفتگو ہوئی تو وہ اپنی بعض عبارتوں کی توجیہہ کرنے لگے کہ میرا یہ مقصد اور مافی الضمیر نہ تھا اور فلاں جملے کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا یہ توجیہات آپ کا دفاع نہیں کرسکتیں۔ آپ اخباروں میں اپنا ایک بیان شائع کیجیے اور اپنے عقائد کا اعلان فرمایئے، اس اعلان کا مسودہ راقم الحروف ہی نے مرتب کیا، جو اردو اخباروں میں شائع ہوا۔ اس کی عبارت میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی، خلاصہ یہ تھا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات گرامی کی ادنیٰ تنقیص کو میں کفر سمجھتا ہوں، غالباً ازواج مطہرات کی تقدیس کا بھی اعتراف تھا، اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس قسم کے الفاظ بھی تھے کہ نادانستہ طور پر میرے قلم سے غیر محتاط الفاظ نکل گئے ہوں تو میں ان سے توبہ کرتا ہوں۔
حاتم علوی مرحوم کو مذہب سے بڑا شغف تھا، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند، ایک بار میں ان سے ملنے کے لیے ان کے دفتر گیا، میں نے اطلاع کرائی مگر آدھا گھنٹہ ہوگیا اور مجھے نہیں بلایا گیا، یہ بالکل نئی بات تھی، میں نے دفتر کے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور حال یہ تھا کہ بدن کانپ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے کئی عمرے اور حج بھی کیے تھے صلوٰۃ فجر کے بعد قرآن پاک کی تلاوت ترجمہ کے ساتھ ان کا معمول تھا۔
"فاران" ہر مہینہ ان کی خدمت میں بھیجا جاتا اور وہ بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کرتے اور مجھ سے فرماتے کہ فلاں مضمون مجھے پسند آیا۔
راقم الحروف کی ذات سے مسٹر حاتم علوی کو خاصہ لگاؤ تھا۔ سیاسی مسائل پر بہت دیر تک گفتگو رہتی، میں ان کی بات ختم کرنے سے پہلے تیزی سے بول اٹھتا تو اس پر تنبیہہ فرماتے۔ ان کے یہاں بارہا دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا، ان

کے گھر پر ایک بار دعوت تھی کھانا کھاتے میں مجھے بار بار پانی پیتا دیکھ کر بولے کہ کھانے کے درمیان پانی پینا صحت کے لیے فائدہ مند نہیں ہے، کھانا کھانے کے کم از کم آدھ گھنٹہ بعد پانی پینا چاہیئے! میں نے کہا کہ میں تو پہلے لقمہ کے بعد پانی پینے کا عادی ہوں! اس پر انہوں نے فرمایا کہ جب آپ اپنی اس عادت کو نہیں چھوڑ سکتے تو شرابیوں سے شراب چھوڑنے کی توقع کیوں رکھتے ہیں۔

Sand Pits پر اُن کا Hut تھا وہاں کئی بار جانے اور کھانا کھانے کا اتفاق ہوا، وہاں جا کر وہ چھ چھ میل سمندر کی ریت پر ٹہلتے۔ ایک دفعہ میں نے بھی اُن کا ساتھ دینا چاہا مگر وہ ڈھائی میل چلنے کے بعد میں ہمت ہار بیٹھا۔ مجھے ہانپتا دیکھ کر مسکرانے لگے۔ چھ سات میل ٹہل کر بھی وہ تازہ دم نظر آتے! زندگی محتاط گزاری تھی اس لیے بڑھاپے میں بھی خاصے صحت مند تھے۔ جوانی کے زمانے میں انہیں بواسیر کا مرض لاحق ہوا تھا، اس زمانے میں بواسیر کا آپریشن نہیں کیا جاتا تھا۔ مسّے جلائے جاتے تھے۔ فرماتے تھے ماتھراں (صوبہ بمبئی کا تفریحی مقام) میں میرا علاج ہوا۔ مسّوں کے جلانے میں بڑی تکلیف سے دو چار ہونا پڑا مگر پھر ہمیشہ کے لیے اس موذی مرض سے نجات مل گئی۔

جماعتِ اسلامی کی دینی جدوجہد اور رفاہی کاموں کو پسند کرتے تھے، اب سے تقریباً چوبیس برس پہلے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو کراچی کے شہریوں کی طرف سے فریر ہال کے لان میں بڑے پیمانہ پر استقبالیہ دیا گیا اور کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف اُن سے ملا تو پانسو روپیہ عطیہ دیا، چوہدری غلام محمد مرحوم سے اُن کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ لاہور میں کئی بار مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کی!

اس بات کو چار برس ہو رہے ہیں، ایک دن راقم الحروف سے ملنے کے لیے غریب خانہ پر تشریف لائے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اسی گفتگو کے دوران میں معاہدۂ تاشقند کا بھی ذکر آ گیا، میں نے (Parts Charge) والے واقعہ کا ذکر کیا۔ اس پر وہ بولے کہ میں نے آپ سے اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کہی تھی! اُن کے اس واقعہ کے انکار پر میں تو دنگ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی

اس گفتگو میں شریک ہوتا تو وہ مجھے جھوٹا ٹھہراتا، میں نے اُسے کبرسنی اور سوءِ حافظہ پر محمول کیا اگرچہ ان کے قوا بہت مضبوط تھے اور وہ جوانوں کی طرح چاق چوبند تھے!
اس کے کچھ دن بعد انہوں نے نوابزادہ لیاقت علی مرحوم سے مولانا مودودی کی کسی ملاقات کا ذکر نکالا حالانکہ جہاں تک میرے علم میں ہے اور میں نے جماعت اسلامی کے بعض ارکان سے دریافت کیا ہے نوابزادہ مرحوم سے مولانا مودودی کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر جماعتِ اسلامی نے یحییٰ خاں کے دَورِ حکومت میں انتخابات میں جو حصہ لیا تھا اس کا ذکر اچھے عنوان سے نہیں کیا۔ مولانا ظفر احمد انصاری کا انتخاب بھی اس لپیٹ میں آگیا جیسے جماعتِ اسلامی نے ووٹروں کے لیے تجوریاں کھول رکھی تھیں! میں نے اُن کی ایک ایک بات کی بڑے درشت لہجہ میں تردید کی، اور کہا آپ کے گھر کے لوگوں نے آپ تک بالکل غلط اور بے سر و پا اطلاعیں پہنچائی ہیں! اس کے بعد حسبِ معمول عید پر میں اُن سے ملنے کے لیے نہیں گیا دوسرے دن وہ خود ملنے کے لیے تشریف لائے اور خالص شہد کی ایک بوتل عنایت فرمائی۔
میں نے اپنے بعض قریبی احباب سے کہا کہ حاتم علوی صاحب کی ان باتوں سے میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے دل و دماغ میں پہلے سے بارود بچھی ہوئی تھی جو بھک سے اڑ گئی، میرا ذہن اس کی توجیہہ کرنے سے اب تک قاصر ہے۔ شخصیتوں کے بارے میں عجیب سے عجیب تر تجربہ! حیرت کی کوئی انتہا ہی نہیں رہی! کسی شریف و معتبر دوست سے توقع کے خلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے تو حیرت کے ساتھ صدمہ بھی ہوتا ہے۔
اب اُن سے گاہے گاہے کسی دعوت یا پارٹی میں ملاقات ہو جاتی! وہ میرے اس گریز اور اجنبیت کو محسوس کر رہے تھے ہاں! ایسا ہوتا کہ اجتماعات، دعوتوں اور پارٹیوں کے بعد اپنی کار میں بٹھا کر مجھے گھر پہنچا دیتے۔ ڈیڑھ برس ہوا فرہنگ خانۂ ایران میں کوئی ادبی تقریب تھی اس کے بعد وہ مجھ سے بڑی محبت کے لہجہ میں بولے۔ ماسٹر بوٹ کلب میں چل کر رات کا کھانا کھائیں گے۔ کھانے کے بعد بہت دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔
گزشتہ ربیع الاول میں سینڈپٹس (Sand Pits) پر جو اُن کا ہٹ

(مشرقی افریقہ) ہے۔ اس میں دوپہر کے کھانے کے بعد جلسۂ سیرت کا اہتمام کیا، مجھ سے فون پر گفتگو ہوئی میں نے کہا اسی دن دوپہر کو میرا ایک اور جگہ پروگرام ہے، کھانے میں شریک نہ ہو سکوں گا، ٹھیک تین بجے آپ گاڑی بھیج دیں میں چار بجے تک پہنچ جاؤں گا، مسٹر بروہی نے انگریزی میں سیرت النبی پر تقریر کی۔ راقم الحروف نے نعتیہ کلام سنایا، تیس چالیس سننے والوں کا مجمع تھا جن میں اسٹیٹ بنک کے گورنر غلام اسحٰق بھی شامل تھے!

میں وہاں سے اُن کی کار میں روانہ ہوا تو بریانی سے مچا مچ بھرا ہوا متوسط سائز کا بھگونا موٹر میں رکھوا دیا، رات کے کھانے میں بریانی نے بڑا مزہ دیا۔

حج کے لیے روانہ ہونے سے دو دن پہلے مجھ سے ملنے کے لیے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میں نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں زیارت حرمین کی سعادت آپ کو حاصل ہوتی رہتی ہے۔ میں نے عرض کیا میرے لیے حرم کعبہ اور حرم نبوی میں دعا کریں کہ مجھ گنہگار کو بھی پھر یاد فرمایا جائے! میں نے دریافت کیا واپسی کب تک ہوگی! بولے دو ڈھائی مہینہ کے بعد، کیونکہ حج و زیارت سے فارغ ہو کر میں اپنی لڑکی سے ملنے ایسٹ افریقہ جاؤں گا، اُن دنوں وہاں قیامت کی گرمی ہوگی! میں نے چلتے وقت تازہ ترین "فاران" اُن کو دیا کہ مولانا ظفر احمد انصاری سے مکہ یا مدینہ میں ملاقات ہو جائے تو انہیں دے دیجئے گا۔

حج و زیارت کی برکتیں اور سعادتیں حاصل کر کے وہ ممباسہ پہنچے اور ان کی آمد آمد کا انتظار ہی ہو رہا تھا کہ اخبار "جنگ" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا، میں اسی وقت اُن کے مکان پر پہنچا ان کے فرزند مہر و آفتاب کا بُرا حال تھا، مجھ سے لپٹ کر رونے لگے، میں بھی اشکبار ہو گیا۔

مارشس سے ہوائی جہاز کے ذریعہ اُن کی لاش لائی گئی، ساڑھے نو بجے علوی منزل سے جنازہ اٹھا، کار ڈن کے عقب میں موٹروں کی دُور تک قطاریں لگی ہوئی تھیں، تاجر، وکیل، سیاست داں، سرکاری عہدیدار، ہر طبقہ کے سربرآوردہ اصحاب جنازے میں شریک تھے، مسٹر جی ایم سید اپنی زمینداری

کے مستقر اور اپنی نظر بندی کے مقام سے اجازت لے کر مرحوم کی تدفین میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے سلام کیا، میں نے کہا آپ نے کیسی کیسی کتابیں لکھ دی ہیں آپ پر ہمیں WORK کرنا ہوگا۔ بولے کوئی فائدہ نہیں، نہ میں آپ کو مطمئن کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری اس گفتگو کو سن رہے تھے۔

مسٹر حاتم علوی کے سوگواروں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے جس کے دم سے محفلیں پُر رونق اور انجمنیں آباد تھیں وہ اب منوں مٹی کے تلے قبر میں اکیلا سو رہا تھا! غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۶ء)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

دو چار سال کا نہیں آج سے پچیس سال قبل کا واقعہ ہے کہ اتنی مدت میں ایک بچہ جوان ہو کر صاحب اولاد بن جاتا ہے۔ انیس سو ستائیس (۱۹۲۷ء) سالِ عیسوی تھا اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے گلابی جاڑوں کا موسم تھا، حکومتِ حیدر آباد دکن کی طرف سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم (صدر الصدور امورِ مذہبی) اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر مولوی عبدالواسع مرحوم (مصنف "البدر") کو مدرسہ قادریہ بدایوں کے معائنہ کے لیے بھیجا گیا۔

بدایوں ریلوے اسٹیشن پر ان دونوں بزرگوں کا پُرجوش استقبال کیا گیا اور شہر میں جلوس نکالا گیا، اس بارات کے دولہا مولانا شیروانی مرحوم ہی تھے، وہ اُن کا زنگین عمامہ، جامہ وار کی اچکن اُس پر حجازی عبا، شرعی پاجامہ کے پائنچوں پر بیل ٹکی ہوئی، پھول دار جوتا، سُرخ و سفید رنگت، خوبصورت ناک نقشہ اور بچپن کے ساتھ ساتھ وجاہت بھی، اور سب سے بڑھ کر خاندانی شرافت اور علمی وقار جو سر سے پیر تک چھایا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ جس کا چہرہ اس قدر روشن اور تابناک ہے اُس کا دل نہ جانے کیا ہو گا؟

مدرسہ قادریہ کی عمارت کے صحن میں جلسہ ہوا، شاندار جلسہ، شامیانہ، رنگ برنگی جھنڈیاں، پھریرے، کتبے، خوبصورت ڈائس اور علما، عمائد، عہدیدار، طلبا اور عوام غرض سبھی کا جمگھٹا تھا، میں نے بھی اس جلسہ میں نظم پڑھی، وہ نظم کیا تھی نومشقی کی "شعر سازی" تھی، آج ان شعروں کا خیال آتا ہے تو ہنس دیتا ہوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم جب تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے محسوس کیا کہ علم کی پاکیزگی سر و قد مجسّم ہو گئی، خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا کہ "شہر کی گلیوں سے جب جلوس نکل رہا تھا تو میں توبہ و استغفار کرتا رہا کہ کہیں غرورِ نفس میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔" پھر بدایوں کی علمی اور تاریخی عظمت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالمقتدر قدس سرہٗ کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا۔

مولانا شیروانی مرحوم کی تقریر اُس جلسہ کا ماحصل تھی، علمی نکات کے ساتھ بیان میں شیرینی اور لہجہ میں دل نشینی بھی تھی، انداز تقریر بہت سادہ تھا۔ مجھے ان کا یہ تلفظ اب تک یاد ہے کہ "کو" کو اُن کی زبان سے "کوُ" (K o o) ادا ہوتا تھا، دوآبہ کے قصبات میں عام طور پر بڑے بوڑھے اس لفظ کو اسی طرح بولا کرتے تھے۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں خود حیدرآباد دکن پہنچ گیا، مولانا مرحوم کو بارہا دیکھا، جلسوں میں دعوتوں میں، شہر میں آتے جاتے کہ میں راستہ سے گزر رہا ہوں اور شیروانی صاحب اپنی شاندار موٹر میں جا رہے ہیں، مرحوم سے تعارف بھی ہوا مگر اُس وقت کا تعارف ہی کیا، میں اس قابل ہی نہ تھا کہ کسی سے میرا تعارف ہو، اور وہ مجھے یاد رکھے بہر حال نواب صدر یار جنگ مولانا شیروانی مرحوم مجھے صورت سے ضرور پہچانتے تھے۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم کو بڑے بڑے لوگ "سرکار" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، سر وزیر حسن مرحوم حیدرآباد ریاست کے ملازم یا وثیقہ دار نہ تھے مگر میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ مہاراجہ بہادر کو وہ "سرکار" کہہ کر خطاب کر رہے ہیں لیکن مولانا شیروانی مرحوم مہاراجہ کشن پرشاد (آنجہانی) کو "مہاراجہ بہادر" اور "آپ" یا "جناب" سے مخاطب کرتے تھے۔

دفتری طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا عہدہ (صدر صدور ی) وزیر (رکن باب حکومت) کی برابر نہ تھا مگر مرحوم اپنی ذاتی شرافت، خاندانی امارت اور علمی وقار کے سبب عوام و خواص میں وزیروں سے زیادہ مقبول اور معزز سمجھے جاتے تھے، اُس زمانہ میں حیدرآباد دکن میں جو علمی ترقیاں ہوئیں، مولانا شیروانی مرحوم کا بھی اُن میں ہاتھ تھا۔

حیدرآباد دکن میں میلاد شریف کے جلسوں کا قدیم سے عجیب رواج چلا آتا تھا، کرایہ پر میلاد خوانوں کی ٹولیاں آتیں اور رات بھر چلاتی رہتیں، ان کی وہ کرخت آوازیں، وہ بازاری قسم کی غزلیں اور نظمیں بھر سُننے والوں کا پتہ نہیں، گھر کے دو چار نوکر اور ماماؤں کے چھوکرے بیچارے جاگ کر عودبتیاں سلگاتے رہتے، مولانا شیروانی مرحوم کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ ان کی کوشش سے حیدرآباد دکن میں سیرت النبی کے جلسے شروع ہوئے، سکندرآباد (دکن) میں سیرت النبی کا جلسہ سال کے سال جس شاندار پیمانہ پر ہوا کرتا تھا اُس کے لیے آنکھیں ترستی ہیں، اُن جلسوں کی خاص بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان میں "قیام" نہ ہوتا تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم سے آخری بار ۱۹۴۴ء میں شرفِ نیاز حاصل ہوا، اس کی تقریب بھی سن لیجیے، قصبہ چھرّہ (ضلع علی گڑھ) میں مشاعرہ تھا اس سلسلے میں میرا وہاں جانا ہو گیا، مشاعرہ کے دوسرے دن صبح کے وقت رئیس بھیکم پور کے صاحبزادے تشریف لائے کہ دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں کھائیے بات پکی ہو گئی، وقتِ مقررہ پر موٹر آئی اور ہم چند شاعر بھیکم پور پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حبیب گنج یہاں سے بہت قریب ہے اور نواب صدر یار جنگ بہادر ان دنوں یہیں تشریف رکھتے ہیں، اس خبر کو سن کر میری خوشی کی تو کوئی انتہا ہی نہ رہی، میری تحریک بلکہ اصرار پر حبیب گنج اطلاع بھجوائی گئی کہ ظہر کے قریب چند شعرا کتب خانہ دیکھنے اور شیروانی صاحب سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔ قلعہ بھیکم پور میں دوپہر کا کھانا کھایا، پھر شعر خوانی ہوئی ـــــ شعر خوانی کیوں نہ ہوتی، اسی لیے تو شاعروں کو بلایا گیا تھا۔ اس زمانہ میں ایسا سخی کون ہے جو شاعروں کو دعوت میں بلائے اور شعر سنے بغیر اُن کو جانے دے۔

دوپہر میں تین بجے کے قریب ہم حبیب گنج پہنچے، نواب صدر یار جنگ مولانا شیروانی مرحوم کتب خانہ میں بیٹھے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے، بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، خود ساتھ ساتھ چل کر کتب خانہ کی سیر کرائی، مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ خوشی کتابوں کو دیکھ کر ہوتی ہے، دیوانوں کی طرح کتب خانہ میں پھر رہا تھا، فرصت بہت ہی کم تھی۔ "گلہائے حسن[1]" کی فراوانی تھی، نظارے کو پیچ و خمِ "جُنبیدنِ مژگاں" سے گلہ تھا۔

ہندوستان اور پاکستان میں ریاستوں اور علمی اداروں کے کتب خانے تو بہت ہیں مگر شخصی طور پر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے بعد غالباً مولانا شیروانی مرحوم کا کتب خانہ نوادر اور کتابوں کی کثرت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا، ایک بہت بڑے عریض و طویل ہال میں سلیقہ کے ساتھ الماریاں رکھی تھیں جو کتابوں سے بھری ہوئی تھیں، وقت اجازت دیتا تو میں دو چار مہینے یہیں حبیب گنج میں رہ کر اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتا اور سب سے زیادہ خود صاحبِ کتب خانہ کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوتا کہ اُن کی ذات اپنی جگہ خود ایک "انجمن" تھی، مگر اس دُنیا میں ہر آدمی کی تمنا پوری کہاں ہوتی ہے، غالب نے ساری عمر کے تجربہ کے بعد ہی تو کہا تھا:

ع بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

---

[1] "علم" اپنی جگہ خود "حسن" ہے۔

میں نے انہی دنوں علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف "حیاتِ شبلی" تازہ تازہ پڑھی تھی، جس کا مجھ پر بہت اثر تھا اور اب تک ہے، اس کتاب کا میں نے ذکر کیا اور والہانہ انداز میں کیا تو مولانا شیروانی مرحوم نے خوش ہو کر میری رائے کی تائید کی اور اس سلسلہ میں بہت سی باتیں چھڑ گئیں، مولانا حالی پانی پتی کی "حیاتِ جاوید" کا بھی ذکر آگیا۔

تقریباً سولہ سترہ سال کے بعد مولانا شیروانی مرحوم کو میں نے دیکھا تھا، بہت کمزور اور بوڑھے نظر آتے تھے، کبر سنی نے گراں گوش بھی بنادیا تھا کان پر ہاتھ رکھ کر بات سُنتے تھے، رنگ کی وہ سُرخی تو جاتی رہی تھی مگر چہرہ پہلے سے زیادہ نورانی ہوگیا تھا۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم و مغفور کی ذات گوناگوں صفات اور متنوع کمالات کا مجموعہ تھی، امارت، خاندانی شرافت، حسن و وجاہت، شہرت، علم و فضل، اولاد اور سپوت اولاد، غرض اللہ پاک نے سب کچھ دے رکھا تھا، اُن کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امارت اور جاہ و دولت کے باوجود نیک سیرت اور پاکیزہ کردار تھے۔ ادیب، شاعر، مقرر، مصنف، عابد، زاہد غرض سبھی کچھ تھے، اہلِ علم اور ضرورت مندوں کی امداد بھی کرتے مگر اس طرح کہ اس ہاتھ کی اُس ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔ انگریز کے دَور میں زمیندار، اُمراء اور اہلِ دولت خطابات حاصل کرنے کے لیے کیا کیا ترکیبیں لڑاتے تھے اور کیسی کیسی ذلیل کوششیں کیا کرتے تھے مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کی حریتِ فکر، وسعتِ ظرف اور بلندیٔ نگاہ کا یہ عالم تھا کہ جب اُن کو پتہ لگا کہ حکومت کی طرف سے اُن کو "شمس العلما" کا خطاب ملنے کی تجویز ہو رہی ہے تو اُنہوں نے خود کوشش کر کے اس خطاب کو رکوا دیا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اپنے دَور میں اپنی آپ مثال تھے اور اس شخصیت اور جامعیت کے لوگ جلد جلد پیدا نہیں ہوا کرتے۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

ہندوستان کے جن بڑے آدمیوں کا نام بچپن ہی سے سن رکھا تھا، اُن میں ایک نام مولانا حسرت موہانی مرحوم کا بھی تھا، حسرت صاحب کی قومی سرگرمیوں کا آغاز علی گڑھ سے ہوا تھا، اور علی گڑھ میرے وطن سے بہت قریب ہے اس لیے اُن کے بارے میں بہت سی باتیں سننے میں آتی رہتی تھیں، مسٹر لوٹل علی گڑھ کالج کے پرنسپل اور ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم ریاضی کے پروفیسر تھے، علی گڑھ کالج کے انتظامی معاملات میں مولانا حسرت موہانی کو ان صاحبوں اور اُن کے ساتھیوں کی روش سے سخت اختلاف تھا، چنانچہ حسرت مرحوم نے ——— "مسٹر لوٹل کی شرارت اور ڈاکٹر ضیاءالدین کی حماقت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس پر مخالفین کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی، یہ تنقید محمڈن کالج علی گڑھ سے متعلق تھی مگر ارباب حکومت نے محسوس کیا کہ اس کی زد ہماری سیاسیات پر آکر پڑ رہی ہے اُس دورِ استبداد میں یہ بہت بڑی جرأت تھی اور حسرت موہانی کی اس جرأت، بے باکی اور صاف گوئی میں کمی نہیں آئی، یہ نشتر تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا ——— اُن دنوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا حسرت سیاسیات میں اپنے کو لوکمانیہ تلک (بال گنگا دھر) کا شاگرد بتاتے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی کی شہرت شیر خواری کے عالم میں تھی۔

مولانا حسرت کے دیکھنے کی بڑی آرزو تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے، وقت سے پہلے کسی کی کوئی آرزو پوری کیسے ہو سکتی ہے، قدرت کا نظام لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا پابند نہیں ہے ——— ہاں ماشاءاللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں خود مولانا حسرت موہانی کے اہتمام سے کانپور میں ایک سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی، ڈاکٹر کنور محمد اشرف (جو اب کمیونسٹوں کے لیڈر ہیں اور

سُنا ہے کہ ان دنوں انگلستان میں براجمان ہیں۔) اس کے صدر تھے، سید حسن ریاض صاحب (سابق مدیر روزنامہ "ہمت" "منشور" اور "اردو ڈان") سے مولانا حسرت موہانی کو خاص ربط تھا اس لیے وہ اس کانفرنس میں بہت پیش پیش تھے، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، سید صلاح الدین صاحب بہاری اور میں بجنور سے چل کر کانپور آئے اور کانفرنس میں شرکت کی، زندگی میں پہلی بار کانپور آنا ہوا، مچھلی بازار کی مسجد دیکھنے کا بڑا شوق تھا، یہی وہ مسجد تھی جس کا تھوڑا سا بیرونی حصہ شہید ہو جانے پر غیرت مند مسلمانوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، مولانا شبلی نعمانی کی یہ نظم ؎

ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

اسی خونیں واقعہ کی یادگار ہے، یہ انگریزوں کا دور تھا، اور اب ہندوؤں کے دور میں مسلمانوں کی نہ جانے کتنی مسجدیں ڈھا دی گئیں اور کتنی غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں مگر "صدائے برنخاست" اور "گوشِ فلک فغانے نہ شنید" ـــــ "ظالم مارے اور رونے نہ دے" اس ضرب المثل کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھ لیا اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے!

ذکر تھا مولانا حسرت موہانی کا اور بات نکل آئی مچھلی بازار کی مسجد کی! مگر میں غزل اور قصیدہ نہیں "مرثیہ" لکھ رہا ہوں اور "فریاد" کی کوئی "لے" نہیں ہوا کرتی، اب دل کی جو خلش بھی بیان ہو جائے! اس بے ربطی پر مجھے معذور سمجھا جائے۔

کانفرنس کے بعد سیرۃ النبی کے جلسوں کے لیے رکنا پڑا، سات آٹھ دن کان پور میں قیام رہا اور مولانا حسرت موہانی کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، گھنٹوں گفتگو رہتی، شعر و ادب پر، سیاست پر اور مذہب و تصوف پر! مولانا کے مکان کی بیٹھک کا نقشہ اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ ایک پلنگ بچھا تھا جس کی ملگجی چادر اور میلے تکیے صاحبِ خانہ کی عسرت کی کہانی زبانِ حال سے سُنا رہے تھے، چھوٹی سی میز پر چند کتابیں دھری تھیں، تین چار کرسیاں اور غالباً سرکنڈے کے مونڈھے بھی تھے، پلنگ کے سرہانے دیوار میں جو طاق تھا اس میں کرشن جی کی ایک مورتی بھی رکھی تھی ـــــ مٹی کی بنی ہوئی مورتی جو اُس زمانہ میں دو تین پیسہ میں آتی تھی ـــــ بہت ممکن ہے کہ گھر کے بچوں نے اس کھلونے کو وہاں رکھ دیا ہو

——— مگر یہ بھی حقیقت ہے جو میں نے خود حسرتؔ کی زبان سے سنی ہے کہ کرشن جی سے مرحوم کو عقیدت تھی وہ بندرابن (متھرا) جایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "وہاں مجھے روحانی کیف حاصل ہوتا ہے ......"!

آموں کی رت تھی، سستے کا زمانہ تھا، دسہری آم کی ایک ڈھیری[1] بہت سے بہت سات آٹھ آنہ میں آتی تھی، بالٹی میں برف ڈال کر آم بھگو دیئے جاتے اور پھر بالٹی کے آس پاس یارانِ طریقت بیٹھ کر آم کھاتے، مولانا حسرت موہانی کے ہاتھ میں چاقو ہوتا اور بڑے شوق سے آم تراشتے اور تعریفیں کرتے جاتے...."خوب... ہے ... بہت اچھا... ہے"! پاکستان میں آموں کی یاد آتی ہے تو قوتِ ذائقہ ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے کہ "خدا کے لیے وہیں لوٹ چلو" ——— ہائے بالذت کا مارا انساں!

کان پور کی جس کانفرنس کا اوپر ذکر کیا ہے، اس کے اجلاسوں کا اعلان شہر میں والنٹیروں کے سپرد تھا، ان میں ایک والنٹیر ہندو نوجوان تھا، متھرا کے قریب کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، آدمی بے باک اور من چلا تھا، خود کانگرس کو بے نقط گالیاں سناتا کہ کانگریس کو برلا اور ڈالمیا نے اپنے روپے سے خرید لیا ہے ——— اسی شخص نے کانفرنس کے جلسوں کا اعلان کرتے کرتے "ویاکھیان" دینا بھی شروع کر دیا، انگریزی حکومت کو خوب برا بھلا کہا، پولیس نے اسے دھر لیا، کانفرنس کے دوسرے کارکن صاف کنی کاٹ گئے، مولانا حسرتؔ موہانی اسے ضمانت پر چھڑا کر لائے، کچہریوں میں اس کے ساتھ پیدل پھرتے تھے، اور وہ جانگلو والنٹیر بھی بڑا ستم ظریف تھا، ہوٹلوں میں مولانا حسرتؔ کو لے کر گھس جاتا اور طرح طرح کی چیزیں کھاتا، اس کے چٹورپن کا بار اس "مردِ قلندر" کی جیب پر پڑتا، ہم تو چند دن کے بعد کان پور سے چلے آئے نہ جانے حسرتؔ مرحوم کو اس بلا سے کب نجات ملی۔

مولانا حسرتؔ موہانی مرحوم سے پھر نیاز حاصل ہوتا ہی رہا، سیاسی جلسوں میں، مشاعروں میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں! ایک بار ان کے ساتھ ہم سفری کا موقعہ بھی میسر آگیا، میں دلی سے حیدرآباد دکن جا رہا تھا، مولانا مرحوم کانپور سے آرہے تھے،

---

[1] ڈھیری میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے (۲۲) آم نکلتے تھے۔

جھانسی کے ریلوے جنکشن پر وہ اسی ڈبہ میں اتفاق سے سوار ہو گئے جس میں راقم الحروف بھی بیٹھا تھا، سید حسن ریاض صاحب اُن کے ساتھ —— اُن کے اسباب سفر کا حال بھی لگے ہاتھوں سن لیجیے "ٹین کا چھوٹا سا بکس تھا جس میں کپڑوں کے دو جوڑے رکھے تھے، معمولی لٹھے کے دو پاجامے، گھٹیا قسم کی ململ کے دو کرتے جن پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں!" میرے خیال میں یہ کپڑے گھر ہی میں ہاتھ کے دُھلے ہوئے تھے، پانچ چھ پیسہ والا لکڑی کا کنگھا، سرمہ دانی، چند کتابیں —— اور بستر؟ شکستہ دری! ایک تکیہ اور بہت ہی فرسودہ کمبل، یہ تھی "شہنشاہ متغزلین" کے سفر کی کل کائنات!

سنہ ۱۹۳۹ء (غالباً) کا ذکر ہے، جبل پور میں بہت بڑے پیمانہ پر سٹی مسلم لیگ کی طرف سے کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جبل پور میں ایک پُرجوش قومی کارکن تاج الدین (اللہ اُن کی مغفرت فرمائے) تھے، انھی کی کوششیں اس کانفرنس کی روح رواں تھیں، پٹنہ کے سید عبدالعزیز مرحوم (سابق وزیر عدالت حکومت دکن) کو سب سے پہلے اسی جلسہ میں دیکھا اور نہ صرف دیکھا بلکہ اُن کی تقریر بھی سُنی۔ مسٹر فضل حق سابق وزیر اعظم بنگال بھی تشریف لائے تھے، اُن دنوں اُن کی شہرت اپنے شباب پر تھی اور وہ "شیر بنگال" بنے ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنی شخصیت کی موت اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی ...... (اللہم احفظنا من الحور بعد الکور ......)!

اس مضمون کے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات کھٹک رہی ہوگی کہ ایک شاعر اور لیڈروں کا کیا جوڑ؟ تو آپ کی یہ کھٹک بھی دور ہوئی جاتی ہے، سُنیے! اسی کانفرنس کی طرف سے ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، مجھے اسی کے لیے حیدرآباد دکن سے بُلایا گیا تھا۔ حیدرآباد دکن سے جبل پور کا قریب کا راستہ ناگپور اور گوندیا ہو کر تھا، مگر میں نے اپنی بے خبری کے سبب (اور اس "بے خبری" کو آپ حماقت بھی کہہ سکتے ہیں) اٹارسی کا راستہ اختیار کیا، اُن دنوں اٹارسی خاکسار تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا، اٹارسی جنکشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جبل پور کے لیے ٹرین جانے میں ابھی کئی گھنٹے کی دیر ہے، سیر و سیاحت اور نئے مقامات دیکھنے کا مجھے سودا ہے، چھوٹے سے گاؤں میں بھی جانا ہوتا ہے تو اُس کی گلیوں کو گھوم پھر کر دیکھ لیتا ہوں، ویٹنگ روم میں پڑے پڑے جی بھی گھبرانے لگا۔ میں اٹارسی کی بستی دیکھنے چلا گیا، وہاں چند خاکساروں نے مجھے

پہچان لیا، اور پھر وہ میرے ساتھ ہو لیے، ہم نے اسٹیشن پر ساتھ ہی کھانا کھایا۔ خاکسار تحریک کے بارے میں وہ مجھ سے پوچھنے لگے، میں نے کہا :

"اگر آپ لوگوں نے اپنے لیڈر کی زبان و قلم پر قابو نہ رکھا تو یہ تحریک تباہ ہو جائے گی ....."

چنانچہ یہی ہوا کہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی زبان و قلم کی بے اعتدالی اور غیر ذمہ داری کے سبب خاکسار تحریک کو ناکامی بلکہ زوال و غارت گری کا منہ دیکھنا پڑا۔

کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ جبل پور کے جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس کی صدارت سید علی متقی صاحب نے فرمائی جو اُس وقت جبل پور میں سب جج تھے، پھر وہ ترقی کر کے سشن جج ہو گئے اور آجکل کراچی میں ڈپٹی کسٹوڈین ہیں، مشاعرے کے علاوہ کانفرنس کے ہر اجلاس میں مجھ سے "سلام[1]" بھی سنا گیا —— مولانا حسرت موہانی مرحوم نے کانفرنس میں ایک طویل تقریر کی، وہ اچھے مقرر نہ تھے، آواز قدرتی طور پر پست تھی اور لہجہ اور تلفظ میں ژولیدگی پیدا ہو جاتی تھی، مگر بات صاف، کھری اور دوٹوک کہتے تھے، خلوص اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا، قول و عمل میں یکسانی تھی، اس لیے اُن کی تقریر کا سننے والوں پر اثر ہوتا تھا۔

حسرت مرحوم ان دنوں لندن کے سفر سے واپس آئے تھے، میں نے وہاں کے حالات پوچھے تو فرمایا کہ وزیر ہند سے ملنے کے لیے میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے ذکر کیا تو کسی نے رائے دی کہ وزیر ہند کے یہاں "وزیٹنگ بک" میں اپنا نام لکھ کر آؤ ... کسی نے کہا اس طرح اور ان لفظوں میں اُن سے ملاقات کی درخواست کرو ..... مگر میں نے تو بھائی! ایک کارڈ (لفافہ نہیں ..... کارڈ! حسرت نے لندن میں بھی سادگی کی وضع کو نباہا) لکھ دیا، اور وہاں سے مجھے بلا لیا گیا، اور میں نے کانگرس اور مسلم لیگ کی پوزیشن وزیر ہند پر اچھی طرح واضح کر دی۔

زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ نام نہاد "ترقی پسند ادب" کی سب سے زیادہ مخالفت اس عاجز نے کی ہے، بمبئی سے جوان "ترقی پسندوں" کا گڑھ

---

[1] سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی۔

ہے وہاں اپنے زمانہ تک میں نے ان کی چلتی نہیں چلنے دی — عجیب اتفاق ہے کہ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وفات کے بعد میں نے حیدرآباد دکن ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا، نواب صاحب کی "مرگِ بے ہنگام" کے بعد دل اچاٹ سا ہو گیا، مگر دکن میں میری زندگی کے کم و بیش تیرہ سال گزرے تھے، وہاں کے ماحول سے گونہ تعلقِ خاطر تھا، اس لیے سال میں ایک دو بار وہاں کا پھیرا ضرور ہو جاتا۔

میں مدراس کے کسی مشاعرے سے واپس آیا تھا، اتفاق کی بات کہ مولانا حسرت موہانی بھی اُن دنوں بلدۂ حیدرآباد میں قیام فرما تھے، ادارہ شرقیہ میں ایک مشاعرے کے انعقاد کی تجویز عمل میں آئی، میں نے مشاعرے کے کارکنوں سے کہا کہ مولانا حسرت موہانی یہاں آئے ہوئے ہیں، اُن کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہیے، مشاعرے کے بعد مولانا کی صدارت میں ایک جلسہ ہونا چاہیے جس میں "ترقی پسند ادب" کی خرافات اور لغویات کو واضح کیا جائے!

سب نے میری رائے سے اتفاق کیا، میرا خیال نہیں یقین تھا کہ حسرت مرحوم کی شاعری کا سارا سرمایہ "غزل" کے سوا اور کچھ نہیں ہے، پھر وہ بڑے پکے مذہبی آدمی ہیں اور "قدامت" تو اُن کی پیشانی پر بہ خطِ جلی لکھی ہوئی ہے، میں نے اُن سے مشاعرے میں شرکت اور جلسہ کی صدارت کے لیے درخواست کی اور مولانا مرحوم نے بغیر کسی تامل کے اپنی محبت سے "ہامی" بھر لی۔

ادارہ شرقیہ[۱] صادق جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا، وسیع صحن، لمبا چوڑا ہال، مشاہیر شعراء کا اجتماع، اربابِ ذوق کا جمگھٹا، مہذب اور موٴدب محفل، مولانا حسرت موہانی مرحوم غزل سنانے کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ ماہر القادری نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی مگر میں اُن کے خیالات سے متفق نہیں ہوں..... وہ ہوسناک شاعری کی مخالفت کرتے ہیں مگر میں کہتا ہوں..... شعر و ادب میں ہوس

---

[۱] اس ادارے میں مشرقی علوم کے امتحانات کے لیے طلباء کو تیار کیا جاتا تھا۔ مولوی حمید الدین قمر فاروقی سنبھلی اس کے بانی اور پرنسپل تھے، جو آج کل دکن کی جمعیۃ علماء کے صدر ہیں! نہ جانے زوالِ حیدرآباد کے بعد اس ادارے کا کیا حشر ہوا؟

کو لاؤ، ہوس کو لاؤ (اس تکرار کو ذہن میں رکھئے اور ساتھ ہی مولانا حسرت کے لہجہ کو بھی.....!) پھر خود اپنی شاعری کی "اقسام" گنانا شروع کیں، جن میں سے ایک قسم "فاسقانہ شاعری" بھی تھی.... سب لوگ حیرت کے ساتھ اُن کا منہ تک رہے تھے، پھر فرمایا "اور مذہب اور خدا"! تو جب میں علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا، وہاں میرے ایک ساتھی کہا کرتے تھے کہ زمین کو کس نے بنایا، آسمان کو کس نے خلق کیا.... یہاں تک کہ خدا کو کس نے بنایا....." مولانا حسرت کے اس جملہ پر مجمع بہت برہم ہو گیا۔ جیسے تیسے مشاعرے کے کارکنوں نے لوگوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا، اُس کے بعد میں نے تقریر کی، میں بہت پُر دل تھا، میں نے اسٹیج پر آتے ہی کہا کہ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو حق اور باطل کے درمیان سمجھوتا چاہتے ہیں، حق اور باطل ایک نہیں ہو سکتے..... پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب لوگ زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں سوال کریں گے اور پھر یہاں تک کہیں گے کہ (العیاذ باللہ) "اللہ کو کس نے بنایا" سو حضورؐ کے ارشاد کی تصدیق ہم اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں....." کہاں یہ ہیچمدان اور کہاں مولانا حسرت موہانی! مگر جذبۂ حق کی عمر دراز، جس نے مجھ میں غیر معمولی جرأت پیدا کر دی! مولانا حسرت کا ظرف بھی قابلِ تعریف ہے کہ اس واقعہ کے بعد جب پہلی بار ملنا ہوا تو ہمیشہ کی طرح تپاک اور محبت سے ملے اور اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں کہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مولانا حسرت (اللہ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) سے آخری بار ملاقات یہیں کراچی میں ہوئی، پار سال حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر وہ کراچی تشریف لائے، شیخ محمد حاضر صاحب نے مولانا کے اعزاز میں پُر تکلف عصرانہ دیا، شیزان ہوٹل کے ہال کا تین چوتھائی حصہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، پھر میں مولانا کی فرودگاہ پر حاضر ہوا، میری گذارش پر مولانا نے چند غزلیں اپنے مخصوص ترنم میں سنائیں، میں نے عرض کیا "حضرت! آپ اپنا پچھلا کلام کبھی نہیں سناتے!" اس پر بولے "میں ہر مشاعرے کے لیے نئی غزل کہتا ہوں، اب یہ مشاعرے والوں کی تقدیر ہے جیسی بھی غزل ہو جائے ـــــ" حسرت مرحوم سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔

مولانا حسرت کی قومی اور سیاسی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں، انھوں نے اس وقت انگریزی سامراج کے خلاف علمِ احتجاج بلند کیا ہے جبکہ ایک برص زدہ "تاملی" کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے حواس باختہ ہو جاتے تھے، "انگریز دشمنی" حسرت کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ اس زمانہ میں جیل میں گئے ہیں جبکہ ہندستان کے بڑے بڑے لیڈر خس خانوں اور شبستانوں میں رہا کرتے تھے، حسرت اپنی جگہ کوہِ وقار و ثبات تھے، کسی قیمت پر بھی وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے ـــــــ ناگپور میں آل انڈیا کانگرس کا معرکہ آرا سالانہ اجلاس ہوا تو حسرت موہانی نے گاندھی جی کی شدید مخالفت کی، وہ "تشدد" پر ایمان رکھتے تھے اور گاندھی جی "اہنسا" کے قائل تھے، جیت گاندھی جی ہی کی ہوئی مگر دنیا نے ایک مسلمان مردِ مجاہد کے حوصلہ کو تو دیکھ لیا۔

قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح مرحوم دھن کے پکے اور بات کے پورے تھے، جس بات پر جم جاتے اس سے پھر ان کو کوئی طاقت اور مخالفت ہٹا نہ سکتی تھی، اپنی ذات پر ان کو غیر معمولی اعتماد تھا، مسلم لیگ کے وہ پریذیڈنٹ ہی نہیں بلکہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ قائدِ اعظم کے ساتھیوں میں اکثریت ان کے نیازمندوں ہی کی تھی، نواب محمد اسمٰعیل خاں، مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اور تیسرے مولانا حسرت موہانی مرحوم ان کے بارے میں سُنا ہے کہ اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے چاہے وہ رائے قائدِ اعظم کی کسی تجویز اور منشاء کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ ان تینوں میں مولانا حسرت سب سے زیادہ جری اور صاف گو تھے۔ ایک طرف "محمد علی جناح" اپنی جگہ چٹان سے زیادہ مضبوط اور دوسری جانب "فضل الحسن حسرت" جذبات کا پُرشور سمندر!

؎ میانِ پختہ کاراں بود بحث خویشتن داری

سُنا ہے کہ حسرت مرحوم بعض اوقات قائدِ اعظم کی ذات پر بھی تنقید کر جاتے تھے مگر قائدِ اعظم اس مخلص رفیقِ کار کی تنقید کا بُرا نہ مانتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی فرنگی محل کے خاندان سے سلسلۂ طریقت میں نسبت رکھتے تھے اور اس طرح اُن کا سلسلہ حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ عرسوں کے تو عاشق تھے، شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گزرتا ہو جس میں کسی بزرگ کے عرس میں نہ جاتے ہوں، اس معاملہ میں وہ بریلوی عقائد سے متاثر تھے، اس لیے

علماءِ دیوبند سے خوش عقیدہ نہ تھے ــــــ غلو کا یہ عالم تھا کہ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کو مخاطب کر کے معروضہ کرتے ہیں :-

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للّٰہ

ایک طرف عرس، فاتحہ، قوالی، تسبیح و درود کی وہ شورا شوری اور دوسری طرف یہ بے تکلفی کہ اُن کی بیگم صاحبہ برقعہ تو پہنتی تھیں مگر چہرہ کھلا رکھتی تھیں اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کسی مسلمان عورت کا بغیر پردے کی سواری میں برقعہ پہن کر سفر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، پہلی بیوی کی وفات کے بعد مولانا نے دوسری شادی کی اور ان دوسری بیوی کو وہ "کھلے چہرہ" نہیں دیکھا گیا، بہت ممکن ہے بے حجابی کی برائیاں دیکھ کر مولانا حسرت پر اپنی رائے کی غلطی واضح ہو گئی ہو یا پھر اُن کی بیگم صاحبہ ہی اس بے اعتدالی کے لیے تیار نہ ہوئی ہوں۔

وہ حضرات جو مولانا حسرت موہانی سے بہت قریب رہے ہیں ان کی زبانی میں نے سُنا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ میں انارکسٹوں کی جو پارٹی ہندستان میں پائی جاتی تھی، اس کے بعض ارکان سے مولانا حسرت کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ حسرت مرحوم فطرتاً انتہا پسند واقع ہوئے تھے، طبیعت میں نوضویت کی چنگاریوں کی گرمی تھی، "تشدد" پر شروع ہی سے اُن کا یقین تھا، انگریز کی دشمنی میں وہ شاید سب سے آگے تھے یہی سبب تھے کہ وہ "کمیونزم" سے خاصے متاثر تھے اور اس مسئلہ میں کسی کی بھی نہ سنتے تھے ــــ نہ جانے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ جملہ اُن تک پہنچا کہ نہیں "کمیونزم بیک وقت بادشاہ کو تخت سے اور خدا کو عرش سے اُتار دینا چاہتا ہے۔"

مولانا حسرت موہانی کی شعروادب کی خدمات بے اندازہ ہیں۔ عروض و بیان اور معانی و تنقید پر انھوں نے گرانقدر مضامین لکھے ہیں، قدیم اساتذہ کے کلام کے انتخابات شائع کیے ہیں اور اپنی غزلوں[1] سے اردو شاعری کی عزت بڑھائی ہے۔ ہم اللہ کے

---

[1] میں اُن کے گزشتہ کلام کا ذکر کر رہا ہوں، آٹھ دس سال اِدھر کی غزلوں میں پہلا سا رنگ نہیں ہے۔ بعض غزلیں تو بہت زیادہ پھیکی ہیں، اگر اُن کی آخری عمر کا کلام کوئی صاحب چھپوائیں تو اس کا انتخاب بہت ضروری ہے، پورے کا پورا کلام چھاپ کر وہ حسرت کی شاعرانہ شہرت اور عظمت پر ظلم کریں گے۔

فضل سے تناسخ کے قائل نہیں ہیں ورنہ کہتے کہ حکیم مومن خاں نے زیادہ حسین اور طرحدار ہو کر حسرت موہانی کی شخصیت میں جنم لیا ہے، اُن کی شاعری سچ مچ "تغزل" کی جان ہے۔

حسرت موہانی کی اخلاقی زندگی کے بارے میں کوئی مشتبہ بات بھی ہم نے نہیں سنی، یوں بھی دیکھنے میں اُن کے چہرے پر "حیرت و اضطراب" کا عالم تو طاری رہتا تھا مگر اُن کے تیوروں سے "شاعرانہ بے اعتدالی" ظاہر نہ ہوتی تھی لیکن اُن کی غزلوں میں "معاملہ بندی" کے اتنے بہت سے اشعار ہیں کہ اُن کو ہم بالکل "روایتی" بھی نہیں کہہ سکتے خاص طور سے اس قسم کے شعر: ؎

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

سنے، سنائے نہیں ہو سکتے، ان میں "آپ بیتی" جھلک رہی ہے! غزل کے لیے کہیں نہ کہیں طبیعت کا اٹکاؤ تو بہر حال چاہیے!

مولانا حسرت موہانی اردو اور فارسی کے پہلے اور شاید آخری شاعر ہیں جنھوں نے "غزل" میں سیاسی افکار کی ترجمانی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ تغزل کی سبک روی پر یہ ترجمانی گراں نہیں گزرتی۔ اُن کی بعض غزلوں میں "ظالم"، "بیدادگر"، "عربدہ جو" اور "قاتل و ستمگر" سے "انگریز" اور "برطانوی سامراج" مراد ہے! تاریخ سن کا ٹھیک تعین تو بہت مشکل ہے۔ مگر یہ اب سے غالباً تیس سال پہلے کی بات ہے، جب مولانا حسرت مرحوم جیل خانہ میں تھے اور چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری تھی۔ عوام نے احتجاجی جلسے منعقد کیے اور حکومتِ برطانیہ سے حسرت کی رہائی کے لیے مطالبہ کیا، مولانا کی یہ غزل:

لطف کی اُن[1] سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

اُسی دَور کی یادگار اور اُنھی تاثرات اور واردات کی آئینہ دار ہے — پھر عوام نے مولانا حسرت موہانی کی رہائی کے لیے "یوم دُعا" منایا۔ حسرت کے کان تک یہ

---

[1] یہاں "اُن" کا مرجع انگریزی حکومت ہے۔

خبر پہنچی، تو بیساختہ پکار اٹھے :

طبع محبوب کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

"تسلیم و رضا" کا یہ وہ مقام ہے جہاں اکابر صوفیا کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔
اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حسرت انتہا پسند واقع ہوئے تھے، مزاج میں فوضویت تھی اور طبیعت باغیانہ پائی تھی، جیل خانوں میں رہ جاتے تو جان کر وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور اس کی پاداش میں انہیں بڑی سخت سزائیں بھگتنی پڑتیں، سنا ہے کہ ایک دو بار کال کوٹھری میں بھی رہنا پڑا۔ حکومت کے اعلیٰ اور ذمہ دار عہدیداروں نے حسرت مرحوم سے سخت باز پرس کی کہ آپ جیل خانہ کے ڈسپلن کا خیال نہیں رکھتے، اس پر حسرت نے کہا کہ میں جیل خانہ میں یہاں کے ڈسپلن کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اسے توڑنے اور درہم برہم کرنے کے لیے ہی آیا ہوں ۔۔۔۔۔۔ یہ مصرعہ چاہے اور کسی پر صادق آتا ہو یا نہ آتا ہو مگر حسرت مرحوم کی زندگی پر اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ پورا اترتا ہے کہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۵۱ء)

پروفیسر حسن عسکری

حسن عسکری مرحوم کے مضامین مختلف رسالوں میں نظر سے گزرتے رہتے تھے، مگر اُن سے پہلی بار ملاقات میرٹھ میں ہوئی۔ پاکستان بننے سے پانچ چھ برس قبل ۱۹۴۲ء میں ! راقم الحروف اپنے ایک عزیز کے یہاں مقیم تھا، حسن عسکری صاحب کو نہ جانے کس طرح میرے میرٹھ پہنچنے کی خبر مل گئی۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج میں شعر وادب کی ایک نشست کا انتظام کیا اور مجھے اس میں بلایا، ڈھائی تین گھنٹے شعر خوانی کا دور رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے، پروفیسر کرار حسین سے بھی اس مشاعرے میں نیاز حاصل ہوا، وہ بھی اسی کالج میں لیکچرار تھے۔ مشاعرے میں شہر کے بعض مشہور شعراء نے بھی حصہ لیا۔ برس ڈیڑھ برس کے وقفہ کے بعد پھر اسی کالج میں بلایا، چائے نوشی کے انتظام میں بھی حسن عسکری کو طلبا کا ہاتھ بٹاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ان نشستوں میں ان سے تبادلہ خیال کا موقع نہ مل سکا۔

پاکستان آنے کے بعد اُن سے کئی بار دعوتوں اور ادبی صحبتوں میں ملاقات ہوئی اب سے ایک برس قبل آخری بار انہیں شان الحق حقی صاحب کے یہاں دیکھا۔ مغرب کی نماز بھی اُن کے ساتھ پڑھی، بھارت کے مرحوم صدر فخر الدین علی احمد کی ہمشیرہ حمیدہ بیگم جو انجمن ترقی اردو دہلی کی صدر یا سکریٹری ہیں، انہی کے اعزاز میں حقی صاحب نے عصرانہ اور بزم شعر وسخن کا اہتمام کیا تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے حسن عسکری مرحوم ترقی پسند گروپ سے تعلق رکھتے تھے! مذہب سے بڑی حد تک بیگانگی وہ پورے نہیں تو شاید "نصف اشتراکی" ضرور تھے۔ مگر پاکستان آنے کے بعد اُن کے اندر دینی انقلاب آیا اور وہ پکے مسلمان بن گئے۔ اس انقلاب کے بعد انہوں نے افسانہ نگاری ترک کر دی اور شعر وادب پر ان کے تنقیدی مضامین بھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ حسن عسکری مرحوم تصوف سے بھی متاثر تھے۔ وہ "

مشہور معروف نقاد اور صفِ اوّل کے ممتاز ادیب تھے مگر اب شہرت کی تمنا انہوں نے اپنے دل سے نکال دی تھی، اُن کے اندر بڑا انکسار پیدا ہو گیا تھا، صوم وصلوٰۃ کے انتہائی پابند، اُن کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ تہجد بھی پڑھتے ہیں اور ذکر اذکار سے شغف رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ارد و تصنیف کا انگریزی میں انہوں نے ترجمہ کیا تھا، اور مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی تفسیر کے انگریزی ترجمہ کا آغاز کر چکے تھے۔ دینی انقلاب کے بعد اُن کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ یہ کہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں حکومت اور اربابِ اقتدار سے تصادم و اختلاف کی نوبت نہیں آنی چاہیئے! مولانا محمد تقی عثمانی صاحب (مدیر مجلہ البلاغ اور رکن اسلامی کونسل) نے مجھے بتایا کہ "البلاغ" میں مسٹر بھٹو پر کبھی کبھار تنقید کی جاتی ہے، تو اس وجہ سے حسن عسکری صاحب ہم سے خفا ہیں۔

حسن عسکری نے شادی نہیں کی، تمام عمر عالمِ تجرد میں گزار دی، رومان اور جمالیات سے صرفِ نظر، بیگانگی اور دامن کشی کی روش اختیار کر رکھی تھی، وہ خود اپنی ذات کے مطالعہ ہی میں کھوئے رہتے اس لیے ؎

من برائے تو خرابم، تو برائے دگراں

مطالعہ غیر معمولی وسیع تھا، کتابیں اُن کی شریکِ زندگی بن کر رہ گئی تھیں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی جانتے تھے، کتابوں کا مطالعہ اُن کا سب سے زیادہ محبوب شغل تھا! تنقید میں اُن کا انداز منفرد تھا، اُن کی موت ایک شریف وخدا پرست انسان اور بلند پایہ ادیب کی موت ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۸ء)

سیّد حسن ریاض

" اب سے پچاس سال پہلے بلند شہر سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلا جس کا نام "نوید" تھا اور ادارہ تحریر میں سیّد حسن ریاض اور صغیر احمد عباسی کے نام مرقوم تھے۔ سیّد حسن ریاض کا نام اُسی زمانہ سے دل پر نقش ہو گیا۔ "نوید" چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا۔ صغیر احمد عباسی تو صحافت سے قطع تعلق فرما کر نواب صاحب چھتاری کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے اور پوری زندگی اس ملازمت میں گزار دی، مگر سیّد حسن ریاض کو صحافت سے فطری مناسبت اور دلی لگاؤ تھا۔ وہ اسی معزز پیشہ سے وابستہ رہے اور مشق و تجربہ نے انہیں عظیم صحافی بنا دیا۔

راقم الحروف کے وطن (کسیر کلاں، ضلع بلند شہر) سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں قادری باغ ہے، وہاں کے نامور زمیندار پیرجی سید محبوب شاہ مرحوم تھے۔ انگریزی دَور کے اسپیشل مجسٹریٹ اور "خاں صاحب" اس نواح میں پیرجی صاحب سے بڑے بڑے ہندو اور مسلمان زمیندار اور رؤسا تھے۔ مگر عوام پر سب سے زیادہ اثر اور رعب انہی کا تھا! میں اُن سے ملنے کے لیے جاتا تو وہ مجھ سے سرکاری عہدیداروں اور اپنے ملنے والوں کو خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے پتہ میں

" ابوالحسن والد سیّد حسن ریاض "

لکھوایا! عام طور پر اولاد باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہے مگر سیّد حسن ریاض کے والد کو لوگ اُن کے بیٹے کی نسبت سے جانتے تھے!

سیّد حسن ریاض مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات کان پور میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا حسرت موہانی کے زیرِ اہتمام کان پور میں ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کنور اشرف اُس کے صدر تھے میں بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا، سیّد حسن ریاض کا اس سیاسی اجتماع میں خاصہ عمل دخل تھا۔ قراردادوں کی تسوید (DRAFTING) انہی سے متعلق تھی۔ مولانا حسرت موہانی سے اُن کے گہرے روابط تھے۔

غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے، حافظ سر احمد سعید خاں (نواب چھتاری) ان دنوں دکن میں صدرِ اعظم تھے۔ میں حیدر آباد دکن سے اپنے وطن آیا ہوا تھا۔ واپسی میں جھانسی کے ریلوے جنکشن پر مولانا حسرت موہانی اور سید حسن ریاض جو کان پور سے آرہے تھے اُسی ڈبے میں سوار ہوئے جس میں راقم الحروف دلی سے بیٹھ کر آیا تھا۔ ایک دن اور ڈیڑھ رات ان دونوں بزرگوں کے ساتھ وقت گزارنے، کھانے پینے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ کسی صحافی کا ہزار نو سو میل سفر کر کے لکھنؤ سے حیدر آباد دکن جانا کسی غرض سے ہی ہو سکتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی سید حسن ریاض کے سفارشی جو اس فن ہی سے ناواقف تھے اور نواب چھتاری صدر اعظم جو سعی و سفارش سننے اور کسی کو فیض پہنچانے کے معاملات میں ضرورت سے زیادہ ریز رو اور محتاط اس لیے قیاس کہتا ہے کہ سید حسن ریاض مرحوم کا یہ سفر شاید ہی سود مند ثابت ہوا ہو۔

۱۹۴۵ء میں راقم الحروف نے بمبئی میں "حلقہ فکر و نظر" قائم کیا تھا، رئیس احمد جعفری مرحوم نے اس حلقہ کا صدر بننا میرے اصرار پر قبول فرمایا۔ نام نہاد ترقی پسند ادب کے دعویدار راقم الحروف سے بہت ناراض تھے کہ یہ حلقہ ہمارے مقابلہ کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اور ان کا یہ قیاس غلط نہ تھا۔ دلی میں بھی اس کی شاخ قائم کی گئی۔ ایک بار میں نے سید حسن ریاض کو حلقہ فکر و نظر کے اجلاس میں تقریر کی دعوت دی۔ وہ وقت مقررہ پر آئے اور ادب میں فحاشی اور عریانی کی تردید میں تقریر کی۔ خاصی مدلل اور منجھی ہوئی تقریر تھی۔ جذبات کم اور فکر و بصیرت زیادہ!

جسے ملاقات، روابط اور تعلقات کہتے ہیں، وہ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں شروع ہوئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری کا مکان دوستی کی اس گنگا جمنا کا سنگم تھا۔ علامہ خلیل عرب مرحوم سے عربی تعلیم کا سلسلہ بھی انصاری صاحب کے یہاں شروع ہوا اسمٰعیل احمد مینائی صاحب اس درس میں اپنی مصروفیتوں کے سبب دو ڈھائی مہینے سے زیادہ ساتھ نہ دے سکے، حسن ریاض مرحوم چھ ماہ تک پابندی کے ساتھ درس میں شریک ہوتے رہے، پھر ناغہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ پھر جناب انصاری اور راقم الحروف ہی ہم سبق رہ گئے۔

سید حسن ریاض مرحوم کی صحافتی زندگی کا آغاز ہفتہ وار "نوید" سے ہوا جو ۱۹۲۱ء

یا سنہ ۱۹۲۲ء میں بلند شہر سے نکلا تھا۔ اُس کے بند ہونے کے بعد مرحوم لکھنؤ چلے گئے۔ سید جالب دہلوی مرحوم اپنے دَور کے بہت مشہور اور بڑے ممتاز صحافی تھے۔ حسن ریاض کو کئی سال اُن کے نائب کی حیثیت سے روزنامہ "ہمدم" اور "ہمت" میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اس صحافتی تجربہ، مشق اور مطالعہ نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی! پھر انہوں نے لکھنؤ سے خود اپنا ہفتہ وار اخبار "دستور" نکالا، جس کے اداریے اور شذرات علمی حلقوں میں پسند کیے جاتے تھے۔ "دستور" میں اُن کے افسانے بھی چھپتے تھے۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حسن ریاض بلند پایہ صحافی ہی نہیں اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔

انگریزی زبان میں روزنامہ "ڈان" مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ اس کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد اردو روزنامہ کی ضرورت محسوس کی گئی، دلّی سے "منشور" نکلا، جس کی زمامِ ادارت حسن ریاض کو سونپی گئی اور یہ نہایت ہی موزوں انتخاب تھا۔ طفیل احمد جمالی صاحب "بیجان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں" کے عنوان سے فکاہی کالم لکھتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد حسن ریاض بھی پاکستان چلے آئے، اردو روزنامہ "ڈان" کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا تو حسن ریاض کے مضامین بھی اُس میں چھپتے تھے۔ مگر پیاسے کا شبنم سے کیا بھلا ہو سکتا تھا۔

مولانا ظفر احمد انصاری، سید حسن ریاض، نواب سید شمس الحسن (لکھنوی) اور گنتی کے چند دوسرے حضرات ہیں جو تحریک پاکستان کے فعال عناصر بلکہ دست و بازو رہے ہیں۔ مگر پاکستان بننے کے بعد انہیں نظر انداز کر دیا گیا، خود انہوں نے پاکستان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ پاکستان کے اکابر کو اُن کی خدمات کی قدر کرنی تھی اور ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ حضرات قصر و ایوان اور درباروں میں بار پانے اور رسوخ حاصل کرنے کے فن سے بھی نا واقف تھے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ جس مسلم لیگ کی جدوجہد سے پاکستان وجود میں آیا اُسی مسلم لیگ کے اکابر رہنماؤں اور کارکنوں نے مسلم لیگ کے ٹکڑے کر دیئے "لیگ" کا لفظ تو باقی رہا مگر اس کے ساتھ بھانت بھانت کی پارٹیوں کے نام جوڑ دیئے گئے۔ بھاشانی ہوں، شیخ مجیب الرحمٰن ہوں، سہروردی، خان عبد القیوم خاں اور دولتانہ صاحب ہوں یہ سب رہنما "کل ہند مسلم لیگ" سے وابستہ تھے۔ مرکز اور صوبوں کی عنانِ حکومت مسلم لیگی رہنماؤں کے ہاتھوں میں آئی۔ انہی حضرات

کی بے تدبیریوں اور خود غرضیوں نے پاکستان کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ ایوب خاں صاحب کو ڈکٹیٹر بننے کا موقعہ میسر آیا اور ایوب خاں کے بعد پھر یحییٰ خاں جیسا بدنام شرابی اور بدکار پاکستان کے سپید و سیاہ کا مالک ہو گیا اور اب قوم اس المیہ سے دوچار ہے کہ اس کشتی کا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکا ہے اور جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ طوفانوں کے ہچکولے کھا رہا ہے۔ سردار شوکت حیات خاں کی مثال سامنے کی تازہ مثال ہے کہ موجودہ دور میں ممتاز دولتانہ سے ملتا جلتا رول ادا کر رہے ہیں۔ کسی خفیہ "پیشکش" نے اس فولاد کو نرم بنا دیا ہے۔ اُن لوگوں کی سیاسی حکمت عملی کی بھی داد دینی چاہیئے جو لیڈروں اور علماء تک کو خرید لیتے ہیں۔ ضمیروں کی سودے بازی، مفاد پرستی، خود غرضی اور اپنے موقف اور نظریہ وعقیدہ کو بدل دینا یہ عام طور پر مسلم لیگیوں کا کردار رہا ہے۔ متحدہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی عہدوں کے واسطے، اسمبلی کے ٹکٹ کی خاطر جلسوں کے اسٹیج پر بیٹھنے اور اخباروں میں تصاویر چھپنے کے لیے ان حضرات میں خاصی کشمکش رہتی تھی۔ اس کمزوری سے معدودے چند مسلم لیگی اکابر مستثنیٰ تھے۔

میں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ سید حسن ریاض کی مسلم لیگ سے وابستگی کا ذکر چھیڑا تو دل کے کچھ کانٹے کاغذ پر منتقل ہو گئے ـــــ ہاں! حسن ریاض مرحوم پر ایک زمانہ خاصی سختی کا گزرا ہے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ شروع شروع میں وہ بہار کالونی میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ پھر دو تین دوستوں کے یہاں رہائش و اقامت کا معاملہ رہا۔ کئی سال سے کراچی یونیورسٹی میں ایم، اے کلاس کو جرنلزم پڑھاتے تھے جس کا معاوضہ انہیں ڈھائی سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ پاکستان کی تحریک پر جو کتاب انہوں نے لکھی تو اس پر پانچ ہزار روپیہ کا انعام ملا۔ اس رقم سے ان کی معاشی حالت میں کسی حد تک کشادگی پیدا ہوئی اور اگلی جیسی تنگی ترشی بہرحال نہیں رہی۔

حسن ریاض کے لباس اور چال ڈھال ہی سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ وہ رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں اور اپنے کو لیے دیئے رہتے ہیں، مزاج میں نفاست تھی میں نے انہیں ہمیشہ اُجلے کپڑوں میں دیکھا۔ بریانی کسی سینہ بہ سینہ نسخہ خاص کے مطابق اتنی لذیذ پکاتے تھے کہ بس۔ میں نے ایک بار ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی بریانی کھائی پھر وہ اس لذت کو نہ بھولا۔ خودداری اور رکھ رکھاؤ سے بعض لوگوں میں تنک مزاجی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صفت ان میں پائی جاتی

تھی، ذرا سی خلافِ طبیعت بات پر مکدر ہو جاتے۔ مگر یہ بھی وقتی ہوتی تھی! بعض مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان کی تنک مزاجی سے مجھے دوچار ہونا پڑا مگر پھر دوسری ملاقات میں وہی کھل مل کے باتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

"فاران" میں اُن کے متعدد مضامین چھپے ہیں، وہ پختہ قلم اور مشاق ادیب تھے! وا مفہوم اور اظہارِ بیان پر پوری قدرت! صحیح زبان استعمال کرتے، ان کی تحریروں میں شگفتگی سے زیادہ سنجیدگی ہوتی تھی۔ سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک مسلمان، ملت اور اسلام کا بے پناہ درد سینے میں رکھتے تھے! وضعداری اُن کا مسلک تھا اور شرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اُن کی معرکۃ آرا تصنیف "پاکستان ناگزیر تھا" پر میں نے "فاران" میں تبصرہ کیا تو مجھے اندیشہ تھا کہ میری گرفت اور احتساب! در خاص طور سے مسلم لیگ کے بارے میں میری تنقید سے وہ کہیں خفا نہ ہو جائیں مگر میرا تبصرہ پڑھنے کے بعد حسن ریاض مرحوم نے شکریہ کا خط لکھا جس کے کسی ایک لفظ سے بھی کسی قسم کی ناگواری اور تکدر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ڈیڑھ دو سال ہوئے جب اُن کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوا تھا تو انہوں نے سوتے میں غلطی سے آنکھ کو مل دیا جس سے آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ ڈاکٹر رضوی جن کی آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں بڑی شہرت ہے انہوں نے اسمٰعیل احمد مینائی صاحب سے کہا کہ آنکھ بیکار ہو چکی ہے مگر ان کی دوسری آنکھ کا ڈاکٹر کرمانی نے آپریشن کیا تو دو تین مہینہ کے بعد پہلی آنکھ بھی آپریشن کے قابل ہو گئی اور ڈاکٹر کرمانی کے آپریشن سے پہلے کی جراحت شدہ آنکھ میں بھی خاصی بینائی آ گئی۔ امیر مینائی کے پوتے جناب اسمٰعیل احمد مینائی کی سعی و توجہ اور ہمدردی اس موقعہ پر بھی کام آئی۔

صغیر احمد عباسی مرحوم کا ذکر شروع میں آچکا ہے اُن کے ساتھ مل کر حسن ریاض نے اب سے پچاس سال قبل بلند شہر سے ہفتہ وار "نوید" نکالا تھا، آخر دنوں میں انہی کے چھوٹے بھائی کے یہاں حسن ریاض مرحوم رہتے تھے صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد کمرے میں بیٹھے تھے اور بالکل اچھے بھلے نظر آتے تھے کہ ان نے میں طبیعت بگڑی اور دو چار منٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی موت کی اطلاع اخبارات میں چھپ جاتی تو جنازے کی نماز اور تدفین میں زیادہ مجمع کی توقع تھی! کراچی یونیورسٹی کے قبرستان میں چالیس کے قریب سوگوار موجود تھے وائس چانسلر صاحب کے علاوہ کئی پروفیسر اور لیکچرار بھی تھے، کفن سرکایا گیا تو ایسا نظر آیا جیسے اللہ کا نیک بندہ اطمینان سے سو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۲ء)

خواجہ حسن نظامی

کسی شاعر اور انشا پرداز سے جان پہچان کا سب سے بڑا ذریعہ اُس کا کلام اور مضامین ہوتے ہیں۔ مگر یہ تعارف یک طرفہ ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی سے یہ تعارف اُس زمانے سے ہے جب اخبار اور رسالے پڑھنے کا مجھے نیا نیا شوق پیدا ہوا۔ اُس وقت میری عمر مشکل سے نو دس برس کی ہوگی۔ دلّی کے ماہنامہ "نظام المشائخ" کے سرِ ورق پر سب سے پہلے یہ عبارت نظر سے گزری :-

زیرِ سرپرستی

"سیدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی خواہر زادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ"

"سیدی و مولائی" اور "خواہر زادہ" کے معنی مجھے اُس وقت کہاں معلوم تھے۔ اس کے لیے دوسروں سے پوچھنا پڑا۔ جب کہیں جا کر یہ قفلِ ابجد وا ہوا۔ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کا نامِ نامی بچپن ہی سے سُن رکھا تھا اور نام ہی کیا سن رکھا تھا اُن کی عقیدت دل و دماغ میں رچی ہوئی تھی۔ مگر یہ غلط فہمی کچھ دنوں کے بعد جا کر دور ہوئی کہ خواجہ حسن نظامی حضرت سلطان جیؒ کے حقیقی بھانجے نہیں ہیں۔ حضرت کی بہن کی اولاد سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں — تاریخ کے زمان و مکان کے بُعد و اختلاف کا بچپن میں کسے شعور ہوتا ہے۔

خواجہ صاحبؒ کا سب سے پہلا مضمون جس نے مجھے متاثر کیا، اُس کا عنوان "میرا کالا کویلہ" تھا۔ اس تاثر کا اثر شاید سب سے بڑا سبب تحریر کی سادگی اور سلاست تھی۔ پورے مضمون میں کسی ایک لفظ کے لیے بھی مجھے کسی سے معنی پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی اسے میں نے اپنی ذہانت کی خوبی سمجھا۔ حالانکہ یہ لکھنے والے کا کمال تھا۔ پھر تو یہ عالم ہوگیا کہ رسالوں میں خواجہ صاحب کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا۔

زمانہ گزرتا چلا گیا۔ ذرا پلک جھپکی تھی کہ کم و بیش دس سال بیت گئے۔ ۱۹۲۴ء

میں میرے والد کا انتقال ہوا جس کے بعد گھر کے حالات دگرگوں ہو گئے۔ انگریزی اسکول کے پڑھے ہوئے نوجوان کے لیے شہری زندگی میں زیادہ کشش تھی مگر وسیلہ اور سعی و سفارش کے بغیر ملازمت کا ملنا آسان نہ تھا۔ حیدر آباد دکن میں خواجہ صاحب کے اثر و رسوخ کے افسانے سُن رکھے تھے۔ میں نے اُن کی خدمت میں کسی تعارف کے بغیر ایک طویل خط لکھا۔ غالبًا ایک ہفتہ کے اندر اندر تسلی آمیز جواب آگیا۔ جواب کے ملتے ہی میں دہلی کے لیے چل پڑا۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے سامنے بالا خانہ پر خواجہ حسن نظامی تشریف فرما تھے۔ میں اندر پہنچا۔ بڑی شفقت سے ملے۔ میں نے اپنے خط اور اُن کے جواب کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ میں جب حیدرآباد جانے لگوں تو آپ بھی میرے ہمراہ چل سکتے ہیں۔ یہ معاملہ بس اسی مرحلہ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی سلسلہ جنبانی کی نوبت نہیں آئی۔

خواجہ صاحب جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کی دیواروں پر ملنے ملانے والوں کے لیے کچھ ہدایتیں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہدایت تو مجھے اب تک یاد ہے لفظوں کی ادل بدل ہو گئی ہو تو اسے حافظہ کا قصور سمجھیے :-

"قرض اور خرچ نہ مانگیے۔"

خواجہ صاحب کا چھریرا بدن، اُس پہ نیچا کرتا۔ شانوں کو زلفوں کے پیچ چھوتے ہوئے گہرے رنگ کی سبز مخمل کی قبہ نما ٹوپی جس کی نوک خوب اونچی اٹھی ہوئی۔ ہونٹوں پر پان کی لالی۔ اُن کی خاندانی نسبت اور پیری مریدی کی شہرت کے ساتھ یہ وضع قطع یقیناً بہت سوں پر اُن کے تقدس کا اثر قائم کرتی ہوگی۔ مگر مجھ پہ اُن کی اس سج دھج کا کچھ اور اثر ہوا۔

تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب "نظام الدین" سے شہر جانے لگے۔ مجھے بھی واپس جانا تھا۔ اُنھوں نے خود اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا لیا۔ غالبًا موٹر خواجہ صاحب نے نئی نئی خریدی تھی۔ عزآئی خاں کے یہاں پہنچ کر خواجہ صاحب نے موٹر واپس کر دی۔ اور چند منٹ کے بعد گھر ٹیلی فون کر کے موٹر پہنچنے کا حال پوچھا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ خواجہ صاحب ان معاملات میں نپی تُلی اور محتاط زندگی رکھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب مرحوم

کے پچاس سالہ دوست اور رفیق ملا محمد واحدی صاحب سے ابھی ڈیڑھ دو مہینے پہلے اس واقعہ کا میں نے ذکر کیا تو وہ بولے کہ خواجہ صاحب تو بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے ہیں۔

مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان سے خط وکتابت کی بھی پھر نوبت نہیں آئی۔ دوسری بار اس ملاقات کے کوئی سال ڈیڑھ سال بعد ملنا ہوا۔ میں اور میرے ہم زلف بابو محمد اسمٰعیل خاں صاحب جمعۃ الوداع پڑھنے کے لیے دہلی گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے خسر کو کچھ دن پہلے کسی دشمن نے قتل کر دیا تھا۔ ہم خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے واقعۂ قتل کی تفصیل بتاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"۔۔۔۔ کہ یہ صورتِ حال پیش آتی تو آپ کیا کرتے ۔۔۔۔۔۔۔"

اس سوال کا ایکا ایکی جواب دینا مشکل تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں میرے جواب کا آخر وہ کب تک انتظار کرتے۔ انہوں نے خود ہی اپنے خسر کی جرأت کی تعریف فرمائی اور دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔

خواجہ صاحب مرحوم نے بڑی ملنسار طبیعت پائی تھی۔ ہر عقیدے، ہر مزاج اور ہر حیثیت کے آدمی کو خوش رکھنے کا فن تو اُن کو اتنا آتا تھا کہ شاید ہی کسی کو آتا ہو۔ مگر رئیس الاحرار مولانا محمد علی (اللہ تعالیٰ اُن کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے) سے نزاع بلکہ قرطاس وقلم کی معرکہ آرائی خواجہ صاحب کی زندگی کا انتہائی ناخوشگوار واقعہ ہے۔ اُدھر سے روزنامہ "ہمدرد" میں یہ جنگ چھیڑی گئی اور خواجہ صاحب کی طرف سے "عزیزوں کا اخبار" نکلا۔ خوب خوب چوٹیں چلیں، کیسے کیسے مُچیٹے رہے۔ کس کس طرح سے ایک دوسرے کی ٹوپیاں اُچھلیں۔ کچھ لوگوں نے مزے لے لے کر اس لڑائی کا تماشا دیکھا۔ کچھ نے اس آگ کو ہوا دی۔ مگر جو لوگ ملت کا درد رکھتے تھے اُن کے دل پر آرے سے چلتے رہے۔ سب سے بڑا غم اور حیرت اس پر تھی کہ مولانا محمد علی اس میں کیوں اُلجھ گئے اور اُن کے قلم سے "ختمِ خواجگی" جیسا مقالہ کس طرح نکلا۔

خواجہ صاحب نے اس قلمی جنگ کو "جنگِ صفین" کا نام دیا۔ بلکہ اسی نام سے ایک ضخیم کتاب بھی چھپوا دی۔ کون جیتا؟ کون ہارا؟ اس کا فیصلہ اُس وقت نہیں ہوا تو اب بیس سال بعد کیا ہوگا؟

مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھ تھی۔ مجھے اُس زمانے میں لکھنے لکھانے کی مشق ہوتی تو "سیدی ومولائی" کے مقابلہ میں "رئیس الاحرار" کا ساتھ دیتا۔ لیکن زبانی طور پر مولانا محمد علی کی طرفداری کی اور یہ سمجھ کر کی کہ حق وانصاف کا یہی تقاضا ہے۔

مزاج وطبیعت کے اس رجحان کے باوجود خواجہ صاحب کا کوئی مضمون یا کتاب کہیں مل جاتی تو اُسے ضرور پڑھتا اور شوق ودلچسپی کے ساتھ پڑھتا۔

غالباً ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالواحد عثمانی بدایونی جو اس زمانے میں روزنامہ "وحدت" (دہلی) کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کے کسی عزیز (شاید ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے) کے یہاں میلادشریف کی محفل تھی۔ مجھے انہوں نے زاہد القادری صاحب کو بھیج کر بلوایا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی اس محفل میں موجود تھے۔ میرے نظم (سلام) پڑھنے سے قبل واحد میاں نے مختصر سی تعارفی تقریر فرمادی اور اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ مجھے "علامہ" تک کہہ دیا۔ میرا یہ حال کہ اپنی علمی تہی دامانی کے احساس سے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ میں نظم پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو مجھے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا پڑا۔ میں نے جب کہا کہ "میں نہ تو "مولانا" ہوں اور نہ "علامہ" ہوں . . ." اس پر خواجہ صاحب نے بلند آواز سے فرمایا :-

"مگر ہم تو سمجھتے ہیں"

یہ جملہ اُن کی عالی ظرفی اور خورد نوازی کی دلیل تھا اور اگر یہ طنز بھی تو دلخراش نہیں دلنواز طنز تھی۔

خواجہ صاحب مرحوم سے آخری بار نیاز پاکستان ہی میں حاصل ہوا۔ اسے بھی کوئی چار سال ہونے کو آئے۔ روزنامہ "ڈان" (اردو) ٹائپ پر چھپنا شروع ہوا تو اس کا افتتاحی جلسہ سینٹرل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ عصرانہ کے بعد خواجہ صاحب نے بڑی دلچسپ تقریر فرمائی۔

وعظ وخطابت خواجہ صاحب کا فن نہ تھا مگر جب بھی بولتے خوب جم کر بولتے اور تقریر مربوط ہوتی۔ ظرافت کی چاشنی اُن کی ہر تقریر میں ضرور رہتی۔ ایک بار دہلی میونسپل کمیٹی کے ہال میں ایک سوشل اجتماع تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی (سحر) جو اُس زمانہ میں

دلی کے سٹی مجسٹریٹ اور ہر طبقہ میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ انہی کی تحریک سے یہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ میل ملاپ کی اس سبھا میں سکھوں کے ممتاز افراد خاصی تعداد میں شریک تھے۔ اس جلسہ میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ خواجہ صاحب نے بھی تقریر کی۔ اُن کے اس جملہ پر جو انہوں نے اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے کہا:

"سکھوں سے ہم مسلمانوں کی ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ اُن کی ڈاڑھیاں ہماری ڈاڑھیوں سے ملتی ہوئی ہیں" سارا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

خواجہ صاحب مرحوم وضع کے بڑے پابند تھے۔ اُن کے پچاس پچاس سال کے دوست آج بھی موجود ہیں۔ جن سے انہوں نے جب سے اب تک یک رنگ انداز میں دوستی نباہ دی۔ ہفتہ وار "ریاست" کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں کے ساتھ البتہ ایسا واقعہ ضرور پیش آیا کہ خواجہ صاحب کی اُن سے کھٹک گئی اور کھٹکی بھی اس طرح کہ ساری دُنیا نے اس شور کو سُنا۔ خواجہ صاحب کی شوخیٔ تحریر کا ایڈیٹر "ریاست" بھلا کیا جواب دیتے۔ مگر سردار دیوان سنگھ نے دوستی کے زمانے میں شاید اسی دن کے لیے ایک "حربہ" سینت کر رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کے اصل خطوط[1] کے بلاک اپنے اخبار میں چھاپ دیے اور یہ وہ حربہ تھا جس کا توڑ ممکن نہ تھا۔

شہر جے پور کے جوہری بازار کی ایک مسجد کے سلسلہ میں ریاست سے مسلمانوں کی نزاع تھی۔ خواجہ صاحب اُن دنوں جے پور گئے ہوئے تھے اور ریاست کے مہمان تھے۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے وقت پولیس نے مسجد میں گھس کر مسلمانوں پر بے تحاشا فیر پر فیر کر ڈالے۔ بہت سے مسلمان شہید اور مجروح ہوئے۔ خواجہ صاحب بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ اخبارات میں اس المناک حادثہ کی خبریں چھپتی رہیں اور رائے زنی ہوتی رہی۔ ریاست جے پور کے محکمۂ اطلاعات کا بیان کچھ اور تھا۔ مسلمانوں کی داستانِ غم اس سے مختلف تھی۔ خواجہ صاحب مرحوم نے بھی اپنے مشاہدات قلم بند کیے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اصل صورتِ حال کیا تھی مگر خواجہ صاحب کی روش

---

[1] نواب صاحب رامپور کی بہن کا یہ قضیہ تھا جس کا حکومتِ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے تعلق تھا۔

سے جے پور کے مسلمانوں کو شکایت ہی رہی۔

خواجہ صاحب صُوفی تھے مگر خانقاہ نشین نہ تھے۔ وہ ادیب تھے لیکن گوشہ نشینی انہوں نے اختیار نہ کی تھی۔ اُن کی زندگی اس قسم کے ہنگاموں سے بھی گزری ہے جس کی ایک دو جھلکیاں ابھی ابھی دکھائی گئی ہیں۔ ان کے سوانح نگار نے ان واقعات سے صرف نظر کر لی تو تصویر کے یہ رُخ چھُپ جائیں گے اور یہ سیرت و کردار کی ادھوری عکاسی ہوگی۔ اس قسم کے معاملات میں نواب عبدؔاللہ خاں کسمنڈوی اور ہاپوڑ کے ضیاءالحق کے ساتھ خواجہ حسؔن نظامی صاحب کا بھی لوگ تذکرہ کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب مردم شناسی کے فن میں شاید اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ وہ ہر آدمی کے مزاج اور طبیعت کا اندازہ کر کے اُس کے ساتھ برتاؤ کرتے۔ اسی لیے ان کے دوستوں، عقیدت مندوں اور جاننے پہچاننے والوں کا حلقہ بہت وسیع بلکہ غیر محدود تھا۔ راجے، مہاراجے، نواب، وزیر، جاگیردار، سیٹھ ساہوکار، لیڈر، مولوی، شاعر، اخبار نویس، صوفی، بدعتی، وہابی، حکیم، ڈاکٹر، ہندو، مسلمان، انگریز، سکھ، پارسی۔ غرض ہر مسلک اور ہر حیثیت کے آدمی سے اُن کے روابط تھے۔ آج مہاراجہ الوؔر کے مہمان ہیں تو دوسرے ہفتہ نواب صاحب رام پور کے قصر ——— خاص باغ ——— میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تیسرے ہفتے کسی درگاہ کی سجادہ نشینی کی نزاع میں ثالثی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے مشاغل میں عجیب بوقلمونی، اور رنگا رنگی پائی جاتی تھی۔

گاندھی جی اور قائدِ اعظم مسٹر جناح دونوں سے سیاسی اختلافات کے انتہائی طوفانی دَور میں خواجہ صاحب ملتے اور بیک وقت مخالف کیمپ کے ان دونوں لیڈروں سے تعلقات نباہتے۔ ہندوستان میں جب جنگِ آزادی جاری تھی اور ملک کے ہر طبقہ کے بڑے لوگ اس طوفان میں کُود پڑے تھے۔ خواجہ صاحب اس سے نہ صرف یہ کہ دامن کشاں بلکہ منزلوں دُور رہے۔

خواجہ صاحب پکے صوفی تھے اور اس مسلک و مشرب کے تمام ظاہری لوازم و رسوم کے حامل اور عامل تھے۔ بدعات کے معاملہ میں اتنے بڑھے ہوئے کہ سجدۂ تعظیمی کے جواز میں ایک رسالہ تصنیف کر دیا۔ اور سب سے زیادہ عجیب تر یہ کہ ہندوؤں کو مُرید کرتے تھے۔

خواجہ صاحب پروپیگنڈے کے فن میں یدِطولیٰ رکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ "یدِطولیٰ" سے بھی اُن کے اس وصف کی صحیح تعریف نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں کوئی اس فن میں مشکل ہی سے اُن کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اپنی ذات کو کس کس عنوان سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس منزل میں کوئی اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حیدرآباد دکن میں ایک شخص دیوانہ خواجہ حسن خواجہ صاحب کا مریدنھا۔ شاعر کیا تُک بند تھا اور تُک بندی بھی بحر اور وزن سے بے نیاز ہوتی۔ خواجہ صاحب کی تعریف میں وہ الفاظ جوڑ لیتا تو اُن تُک کو خواجہ صاحب اپنے روزنامچے میں چھاپ دیتے۔

خواجہ صاحب جدت طراز بھی تھے، مہینوں کے نام ائمہ اہلبیت کے ناموں پر رکھے۔ یہ جدت عوام میں مقبول نہ ہو سکی۔ مگر وہ انہی مہینوں میں اپنے روزنامچے میں لکھتے رہے۔ دلی کا املا "دل لی" اُنہی کی جدت ہے اور کتنی حسین جدت ہے۔ اپنے مکان کا نام "رین بسیرا" رکھا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام کتنے دلچسپ اور اچھوتے ہیں۔

"کم لوموت" "پریم سندیسہ" "مچھر کا اعلانِ جنگ" "طمانچہ بر رخسارِ یزید" "کرشن بیتی" "چٹکیاں اور گدگدیاں ...." لاؤڈ سپیکر کا ترجمہ "بڑبولا" اُنہی کی ایجاد ہے۔

اپنے مُریدوں کو اُن کی وضع قطع اور طبیعت و مزاج کی مناسبت سے خطابات عطا فرماتے۔ بعض مُریدوں کے اصل نام اُن خطابات کی شہرت میں گم ہو کر رہ گئے۔ کشفی شاہ، علمی شاہ،، خسرو شاہ، وجودی شاہ ...... کو جو کوئی جانتا ہے، اِن خطابوں ہی سے جانتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کو (غالباً) "خماری شاہ" خطاب دیا مگر یہ خطاب ذرا بھی شہرت نہ پا سکا۔

حکیم اجمل خاں مرحوم نے جب انگریزی گورنمنٹ کے عطاکردہ خطاب "حاذق الملک" کو واپس کیا تو خواجہ حسن نظامی ہی نے سب سے پہلے اُن کے نام کے ساتھ "مسیح الملک" لکھنا شروع کیا اور اس خطاب کو بہت جلد قبولِ عام حاصل ہو گیا۔

حیدرآباد دکن کے علی بخش قوال کو "واعظ" کا خطاب خواجہ صاحب ہی نے دیا۔ اس خطاب نے "واعظ قوال" کو اتنا چمکایا کہ ہر طرف اس کی مانگ ہونے لگی اور اس کے کاروبار کو اتنی ترقی ہوئی کہ وہ خود "شیخِ طریقت" بن کر لوگوں کو مُرید کرنے لگے۔

خواجہ صاحب نے مصر، شام اور حجاز کا سفر بھی کیا تھا لیکن قدرت و استطاعت رکھنے کے باوجود فریضۂ حج ادا نہ کرسکے۔ ایک وہ دور تھا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کو انگریزی حکومت کی طرف سے "شمس العلما" کا خطاب دیا گیا۔ مگر آخر دور میں انگریز اس معاملہ میں بہت فیاض ہوگیا تھا۔

ہندوستان کے مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی نے ایک رباعی کہی تھی :

لہ
. . . .
گرچہ فہرست اب کے چھوٹی ہے
سمجھیں اس کو غنیمت اہلِ وفا
بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے

اسی زمانے میں خواجہ صاحب کو حکومتِ برطانیہ نے "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا، حالانکہ خواجہ صاحب اپنے کو عالم سمجھتے تھے اور نہ عوام !

ہندوستان اور پاکستان میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کی سب سے زیادہ آؤ بھگت غالباً حیدرآباد دکن میں ہوتی تھی اور اس کے ساتھ مالی منفعت کے مواقع بھی حاصل تھے۔ یوں سمجھیے کہ دکن سے چاندی کی نہر نکل کر "رین بسیرے" میں جاکر گرتی تھی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر حکومتِ آصفیہ کے صدرِ اعظم اور بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اُن کا وقار گورنروں سے بڑھ کر تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ خواجہ صاحب کے آنے کی اطلاع پاکر اُنھوں نے حقہ کو اٹھوا دیا اور اُن کے رُو برُو بڑے ادب کے ساتھ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔

خواجہ صاحب کے مشاغل گوناگوں تھے۔ اُن کی بوقلمونی کا کیا پوچھنا؟ کنگ جارج پنجم ہندوستان آئے اور دلی میں شاہانہ دربار ہوا تو خواجہ صاحب مرحوم نے ایک مضمون چھپوایا جس میں کنگ جارج کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ سوامی شردھانند کی ناپاک کوششوں سے ملکانوں میں ارتداد کی ہوا چلی تو خواجہ حسن نظامی نے اس کے توڑ کے لیے زمین آسمان ایک کر دیئے اور "شیخ التبلیغ" کہلائے۔ پوسٹروں اور جھنڈیوں کی تحریک انھوں نے شروع کی۔ "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی" کی بنا ڈالی۔ بہت سی کتابیں اس کمپنی

لہ مصرعہ اولیٰ افسوس ہے یاد نہیں رہا۔

نے چھپوائیں۔ مگر یہ سلسلہ دیر تک نہ چل سکا۔ نظام حیدر آباد ۱۹۲۸ء میں دہلی آئے تو خواجہ صاحب نے "نظام گزٹ" نکالا جو نظام دکن کے دلّی میں قیام کے دنوں میں پابندی کے ساتھ چلتا رہا۔ اُس میں انگریزی دَور کے "ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام" اور موجودہ ہند دَور کے "راج پرمکھ" کی مصروفیات کی خبریں پوری تفصیل کے ساتھ چھپتی تھیں۔ یہ بات تو شہنشاہ جارج پنجم کے شاہانہ دَورے کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔

اخبار وہ نکالتے تھے۔ کتابوں کی تجارت اُن کے یہاں ہوتی تھی۔ تعویذ گنڈے وہ کرتے تھے۔ دواؤں کے وہ موجد تھے اور اُن کی تجارت فرماتے تھے۔ پیری مریدی ان سب پر مستزاد۔ خواجہ صاحب کی آمدنی کے متعدد ذرائع اور یافت کی بہت سی راہیں تھیں۔

خواجہ صاحب بہت محنتی آدمی تھے۔ گھنٹوں مسلسل کام کرتے مگر ان کی طبیعت میں استقلال نہ تھا۔ کوئی کام شروع کیا۔ کچھ دن بڑا زور شور اور ہما ہمی رہی۔ مگر پھر وہ جوش سرد پڑ گیا' اور اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کام کا آغاز فرما دیا۔

ضرورت مندوں اور پریشان حالوں کی افسروں اور عہدیداروں کے یہاں سعی سفارش کرنے میں خواجہ صاحب بڑی فراخدلی سے کام لیتے۔ اور ہمدردی کا جذبہ اُن کی شخصیت کے احساس پر غالب آجاتا۔ " SELF MADE " کی تعریف خواجہ حسن نظامی کی ذات پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ شہرت، عزت اور دولت کی اتنی ترقی اور وہ بھی اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کی ہوئی ترقی کم ہی دیکھنے اور سُننے میں آتی ہے۔ ایک وہ دَور بھی اُن پر گزرا ہے کہ "نظام الدین" سے دلّی پیدل آتے تھے۔ نان بائی کے یہاں آٹا دے کر روٹیاں پکوائیں، کھایا پیا اور سرہانے تکیہ کی جگہ پتھر رکھا اور سو گئے۔ پھر وہ زمانہ بھی آگیا کہ ان کے گھر کا خرچ تین چار ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھا۔ روپے کی تو اُن پر صبح صبح بارش ہوتی تھی۔ ملا واحدی صاحب اس کے راوی ہیں کہ ایک بار خواجہ صاحب جہانگیر آباد کے راجہ نوشاد علی خاں اور وہ حضرت سلطان جیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ فاتحہ پڑھ کر واپس ہونے تو دروازے پر جوتوں کی حفاظت کرنے والے کو کچھ دینے کے لیے خواجہ صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اتفاق سے اشرفی ہاتھ میں آگئی اور خواجہ صاحب نے وہی اشرفی جوتے والے کو دے دی ــــ اس پر خواجہ صاحب کہا کہ ایک

وہ بھی زمانہ تھا کہ میں بھی اسی طرح درگاہ شریف کے دروازے پر زائرین کی جوتیوں کی رکھوالی کر کے چند پیسے کما لیا کرتا تھا اور اب اللہ تعالیٰ کی دین کا یہ حال ہے کہ میں ایک اشرفی جوتے والے کو انعام میں دے سکتا ہوں۔

کتابوں کی تصنیف کا کام وہ زیادہ تر آخری شب میں کرتے۔ پانوں کے بہت شوقین تھے، پان کے بیڑے خاصدان میں بھرے رکھے رہتے اور وہ لکھتے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے پان چباتے جاتے۔ کہتے تھے کہ میں اپنے جسم کے وزن سے زیادہ مقدار میں تمباکو اب تک کھا چکا ہوں۔

خواجہ صاحب کا شمار اُردو زبان کے محسنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ کم و بیش ساٹھ سال تک اُن کے قلم نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ سلاست، روانی اور سادگی تو اُن کے اندازِ تحریر اور اسلوبِ نگارش پر قربان ہو ہو جاتی۔ بات میں بات نکال لینے اور نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر تحریر میں تکلف اور آورد پیدا نہ ہوتی۔ دس بیس نہیں چھوٹی موٹی سینکڑوں کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے ساتھ نہ اُن کی شہرت گئی، نہ مال و دولت نے قبر میں اُن کا ساتھ دیا، نہ بڑے آدمیوں سے روابط و تعلقات اور مُریدوں کی عقیدت نے اُن کی رفاقت کی۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، صرف اعمال ان کے ساتھ گئے۔ ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ پیش آتا ہے۔ اُس قلب کی غفلت و بے حسی کو کیا کہیے جسے کسی کی موت پر بھی آخرت کی جواب دہی کا خیال نہ آئے۔

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۵۵ء)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

اب سے تیس اکتیس سال پہلے کا واقعہ ہے جب حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے، اور وہاں کے مشہور دیندار وکیل مولوی فیض الدین[1] مرحوم کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ انہی کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن حیدرآباد پہلی مرتبہ آئے اس وقت انہیں عوام بہت ہی کم جانتے تھے۔ یہ ان کی شہرت کے آغاز کا زمانہ تھا، پھر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی عظیم شخصیت کے ہوتے ہوئے، مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف عوام اور خواص کے متوجہ اور رجوع ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا!

میں نے انہیں حیدرآباد میں دوبار دیکھا، مولوی فیض الدین کے یہاں اور عابد شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے، کھدر کا کرتہ، کھدر کا پاجامہ اور اسی کی ٹوپی گھنی ڈاڑھی ان کی صورت، چال ڈھال اور وضع قطع کو دیکھ کر ان کی طرف دل کھنچتا تھا۔

---

[1] مولوی فیض الدین مرحوم عدالتِ مال کے کامیاب ترین وکیل تھے۔ اپنی استطاعت کی حد تک پورا اطمینان کر لیتے کہ مقدمہ بنایا ہوا نہیں ہے، جب اُسے ہاتھ میں لیتے، معاملہ کے کھرے اور بات کے سچے، لاگ لپیٹ کی باتیں انہیں آتی ہی نہ تھیں، سچ تو یہ ہے کہ وکالت کے پیشہ کی ان کے دم سے عزت و آبرو تھی! چالیس سال سے کیا کم عمر ہوگی، جب انھوں نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا، اور درسِ نظامی کی سبقاً سبقاً تکمیل کی! مسلمانوں کے خیر خواہ، ملت کے درد مند، شریعت کے پابند، مہمان نواز، سیر چشم! لوگوں کی نظروں سے چھپا کر ضرورت مندوں کی امداد کرنے والے! ان کی کوٹھی عربوں کی مہمانداری کے لیے مشہور تھی، حجاز، حضرموت، بحرین اور شحر و مکلا سے کوئی عرب بلدہ حیدرآباد میں نیا نیا آتا اور سرائے یا ہوٹل کا پتہ پوچھتا، تو تانگے اور چھکڑے والے اُسے فیض الدین مرحوم کے یہاں پہنچا آتے اور وہ مہینوں ان کے یہاں مہمان رہتا ——— دین اور دنیا دونوں اچھی اور کامیاب! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے!

تقریباً چودہ سال کے بعد جب میں حیدرآباد چھوڑ کر اور بمبئی میں فلم کے چکر سے نکل کر، دلی آگیا، تو مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے حصول نیاز کے بارہا موقعے ملے۔ وہ جب بھی ملتے بڑی خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ملتے! دلی کی جامع مسجد کے سامنے بالاخانے پر ادارہ مشرقیہ تھا، وہاں ہر جمعہ کو ندوۃ المصنفین کے ارکان اور دوسرے اہل علم اور احباب جمع ہوتے، چائے کا دور چلتا، اور دو چار شاعر آجاتے تو چھوٹی سی بزم شعر وسخن بھی منعقد ہو جاتی! اسی بزم احباب میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوتی رہتی۔ شعر کا وہ خاصہ ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعروں پر اُن کے داد دینے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ سخن فہم ہی نہیں، شعر کے ناقد بھی ہیں، اور کیا عجب ہے کہ اپنی جوانی کے آغاز میں انھوں نے شعر بھی کہے ہوں!

مولانا مرحوم سے میری مفصل اور طویل ملاقات آگرہ میں ہوئی، یہ (غالباً) ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے، میں اپنے ایک عزیز کے یہاں ریاست رام پور میں مقیم تھا۔ ان دنوں وہاں بڑی دھوم دھام کی نمائش ہو رہی تھی، آل انڈیا مشاعرہ بھی تھا۔ جناب اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کا دعوت نامہ ملا کہ سال کے سال قصر الادب کی جانب سے سیرت النبیؐ کا جلسہ اور نعتیہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے، تمہیں اس میں ضرور شریک ہونا پڑے گا — میں نے جواب دیا کہ مشاعرے میں شریک نہ ہو سکوں گا، ہاں! سیرت کے جلسہ میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کروں گا، اور جو نعتیہ کلام میں مشاعرے میں سناتا، وہ جلسہ میں سُنا دوں گا، بات پکی ہو گئی، میں رام پور سے آگرہ پہنچا اور مجھے ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا، اُس میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم پہلے سے قیام فرما تھے، علیک سلیک کے بعد مصافحہ اور معانقہ ہوا!

یہ وہ دور تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری تھی کہ اس کی تھاہ نہ ملتی تھی، مولانا اس جمعیتہ علماء کی روح رواں تھے، جو کانگریس کی حلیف بلکہ اس کا دست و بازو تھی، جمعیتہ علماء اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی تو "آل انڈیا کانگریس" — "آل ہندو کانگریس" بن کر رہ جاتی — مولانا مرحوم سے اُس وقت کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا، بعض اکابر دیوبند اور جمعیتہ العلماء سے جماعت اسلامی کے اختلافات اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ذکر آیا، اُن کی عالی ظرفی تھی کہ میری بعض

تند و تیز باتوں پر وہ چیں بہ جبین تک نہیں ہوئے! شب کا کھانا ساتھ ہی کھایا، پھر ہم ساتھ ہی جلسہ گاہ میں پہنچے، شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں شامیانہ تنا ہوا تھا، حاضرین کی تعداد خاصی تھی!

اس جلسہ کا یہ واقعہ جب بھی یاد آجاتا ہے، تو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے کہ جاتی ہے کہ قصر الادب (اکبرآباد) کے زیر اہتمام سیرۃ النبیؐ کا یہ جلسہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ ایک صاحب خوش پوش، خوش شکل، ہاتھ میں موٹی سی چھڑی لیے ہوئے اسٹیج پر پہنچے اور پہنچے کیا خود ہی لمبی لمبی ڈگیں بھرتے دندناتے ہوئے علماء کی صف میں جا دھمکے، اور فرمایا کہ میں تقریر کروں گا! اُن کا چہرہ خاصہ وجیہہ تھا۔ ڈاڑھی سے، لباس سے اور وضع قطع سے عالم نظر آتے تھے، اُن کا نام پوچھا گیا، گرجدار آواز میں ارشاد ہوا: ——— "اورنگ زیب عالمگیر"

قرآنِ کریم کی تلاوت کے بعد، وہ صاحب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، اور آغاز ہی بے ربط جملوں سے کیا، اسال وبے ربطی کی یہ "بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ مجمع کے اضطراب اور ناپسندیدگی کو دیکھ کر، انہیں تقریر کرنے سے روک دیا گیا! بعض تُک شاعروں کو تو مشاعروں میں ذلیل ہوتے دیکھا ہے مگر کسی مقرر کی ایسی ذلت دیکھنے میں نہیں آئی!

اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے سر رہا، ایسی دل آویز اور کیف انگیز تقریر کی کہ سننے والے جھوم جھوم گئے۔

اس واقعہ کے دو سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور ملک کے طول و عرض میں وہ خونین ہنگامہ برپا ہوا، جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی! اس کو ہجرت کہیے، فرار سے تعبیر کیجیے، لاکھوں مسلمانوں کی طرح میں بھی پاکستان چلا آیا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے، اب ۱۹۶۲ء ہے۔ اس پندرہ سال کی مدت میں، مشاعروں کے طفیل تین بار ہندوستان جانا ہوا، مگر کہاں؟ مدراس، بمبئی، احمد آباد، اپنے وطن کے دیکھنے کے لیے اب تک دل و نگاہ ترس رہے ہیں........ ضلع بلند شہر اور دلی کا سوانہ قریب قریب ملا ہوا ہے، دلی سے ریل میں چلے، شاہدرہ پہنچے، پھر غازی آباد آیا، اس کے بعد بلند شہر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، ادھر جانا ہو جاتا تو دلی ضرور جاتا

اور مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے لازمی طور پر نیاز حاصل کرتا! یہ تمنا دل کے دل ہی میں رہ گئی! عالم برزخ میں روحوں کا ایک دوسرے سے ملنا ملانا ہوتا ہوگا، تو یہ تمنا مرنے کے بعد ہی پوری ہو سکے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے وہ اپنی ذہانت، تقریر اور علمی شغف کی بدولت دینی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے! اور اُن کا شمار ممتاز ترین طلباء میں ہوتا تھا، درس نظامی کی تکمیل کے بعد انھوں نے درس و تدریس اور دینی علوم کے مطالعہ کے سلسلہ کو جاری رکھا! اُن کی شخصیت میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی، وہ دینی رہنما تھے، سیاسی لیڈر تھے، شعلہ بیان مقرر تھے اور ساتھ ہی بلند پایہ مصنّف بھی! ندوۃ المصنفین جیسے اونچے درجہ کے علمی ادارے کی بنا انہی نے ڈالی، اُن کی تحریریں علمی سنجیدگی اور دینی فکر کے ساتھ ادبی دل کشی بھی پائی جاتی تھی، اُن کی تصانیف میں "قصص القرآن" کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی! تقریر و خطابت میں وہ آپ اپنا جواب تھے، شعلہ نوا بھی اور شبنم فشاں بھی! تقریر، تحریر اور ذہانت میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کم مگر دینی شغف اور ارکانِ شریعت کی پابندی میں اُن سے بڑھ کر! انگریزی دورِ حکومت میں آزادی بے باکی اور حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں! سیاسی مسلک میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قدم بہ قدم پیرو، مسلم لیگ کی مخالفت کی مگر شائستگی کے ساتھ! تقسیم ہند کی مخالفت انھوں نے کسی لالچ میں آکر نہیں کی، وہ نیک نیتی کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ ملک کے اس بٹوارے سے مسلمانانِ ہند کو نقصان پہنچے گا۔ پاکستان بن گیا، تو دینی اخوت کی بناء پر اُس کے استحکام و بقا کے متمنی اور خیر خواہ رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف اٹھتی تھیں، اور مولانا آزاد کی وفات کے بعد تو اُنہی کی تنہا ذات دہاں کے مسلمانوں کا مرجع سمجھی جاتی تھی، آخری زمانے میں انھوں نے بھارت کی پارلیمنٹ کو اپنی تقریروں سے ہلا ہلا دیا، کس قدر جرأت و بیباکی کے ساتھ حکومت پر تنقید کی! خاص طور سے اردو زبان کی حمایت میں اُن کا جوشِ عمل اور سرگرمی مثال اور یادگار بن کر رہے گی۔

چند سال سے تو وہ ملک، قوم کی ملکیت و متاع اور سراپا خدمت خلق بن کر رہ گئے تھے۔ دن رات کا زیادہ وقت دوسروں ہی کے کام آتا، اُن کی صحت لوگوں کی غمخواری ہی کی نذر ہوگئی!

انگریزی دورِ حکومت میں اصل مسئلہ ملک کی آزادی کا تھا، اس تحریکِ آزادی میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا، اسی لیے وہ حکومت کے معتوب و مقہور رہے، مگر ہندو راج میں جسے سیکولر گورنمنٹ کا نام دے دیا گیا ہے، مسلمانوں کے جان و مال پر ہی نہیں تہذیب و تمدن، عصمت و آبرو، زبان و ادب اور دین و ایمان پر قیامت گزر گئی — مگر ان حالات میں ہندو راج کے قہر و عتاب کی سعادت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور اُن کے ہم مسلک علماء اور رفقاء کی بجائے دوسرے ہی "داعیانِ حق" کے حصہ میں آئی۔

علم و ادب ہو شاعری ہو، سیاست ہو ان کی شہرت کے ساتھ خوشحالی بھی آئی ہے، مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی اللہ تعالیٰ نے شہرت اور عزت کے ساتھ معاشی فراغت اور خوشحالی بھی عطا فرمائی۔ لوازم زندگی کی کوئی بڑی سے بڑی تمنا اور اُن کی ضرورت رُکی نہ رہی تھی۔ بھارت کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لال نہرو سے اُن کے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے، ہندوستانی حکومت میں مولانا مرحوم کی بڑی عزت تھی، اُن کی بلند پایہ شخصیت کے سامنے حکومت کے وزیر تک کچھ نہ کچھ دبتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔

آہ! وہ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے، جب ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کی بہت زیادہ ضرورت تھی، اُن کی موت نے کروڑوں دلوں کو سوگوار بنا دیا، اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کے درجات بلند فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۶۲)

حفیظ ہوشیار پوری

اب سے کوئی تیس تیئیس سال پہلے کی بات ہے جب میں حیدرآباد دکن سے دلی آیا ہوا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی زمانے میں "آغا شاعر ڈے" منایا گیا۔ ہارڈنگ لائبریری سے مشاعرہ نشر ہوا، میں نے بھی اس میں شرکت کی، وہاں حفیظ ہوشیار پوری کو پہلی بار دیکھا۔ وہ ان دنوں محکمہ ریڈیو میں اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر تھے! دوسرے دن جناب تابش دہلوی نے اپنے یہاں کھانے پر مجھے مدعو کیا، اس دعوت میں حفیظ بھی شریک ہوئے کھانے کے بعد شعروسخن کی محفل گرم ہوئی اور بے تکلفی کی باتیں بھی رہیں! پاکستان بننے سے قبل ۱۹۴۵ء میں لائل پور سے اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مظفر گڑھ سے جو مشاعرے نشر ہوئے اُن انتظامات کے نگراں حفیظ مرحوم ہی تھے۔ وہاں اُن سے دُعا سلام کا موقعہ ملا۔

کراچی میں اُن سے دعوتوں اور پارٹیوں میں ملنا ہوتا رہتا، کئی بار تصوف کی کتابوں کی تلاش میں دفتر "فاران" میں بھی تشریف لائے۔ وہ صوفی نہیں تھے! مگر علم تصوف سے بڑا شغف تھا، میں نے تصوف کی بعض اونچے درجے کی کتابوں (عوارف المعارف، فصوص الحکم، رسالہ قشیریہ، فیہ مافیہ، لوائح ......) کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ کتابیں میرے یہاں موجود ہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری مرحوم پروگرام پروڈیوسر کی پوسٹ سے ترقی کرکے پاکستان ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے، فرض شناس اور مرنجان مرنج عہدیدار تھے، پنشن لینے کے بعد بھی ریڈیو پاکستان کو اُن کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی! فلسفہ میں ایم۔ اے کیا مگر اس کے ساتھ فارسی ادب کا شستہ ذوق رکھتے تھے! فطرتاً کم آمیز اور سنجیدہ تھے اس لیے شعروسخن کی محفلوں میں دوسروں کی طرح کھل کر داد دینے کے عادی نہ تھے، شعراء اُن کی اس افتادِ طبیعت کو بخل پر محمول کرتے۔

ایک بار اُن کی زبان سے ایک لطیفہ سنا ـــ کہنے لگے کہ میں اپنے لڑکے کو گاندھی گارڈن لے گیا تھا۔ وہاں اُس نے گوریلے بندر کو دیکھ کر مجھ سے کہا آبا! یہ بندر تو ٹائر ڈن پر بیٹھا ہوا ہے۔

اس بات کو دس بارہ برس ہوئے ہوں گے ایران کی ایک خاتون (جن کے نام کا ایک جز "منگنا" تھا) پاکستان آئی تھیں، وہ خطاط تھیں، شاعرہ تھیں اور بچوں کی تربیت کے فن میں خاص مہارت رکھتی تھیں، ان کے اعزاز میں "فرہنگ خانہ ایران" میں استقبالیہ دیا گیا۔ حفیظ ہوشیارپوری بھی اس تقریب میں شریک تھے، انہوں نے اپنا فارسی کلام بھی سنایا۔

علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حفیظ ہوشیارپوری اکثر حاضر ہوا کرتے تھے، اُن کی نیازمندی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات علامہ کے خانگی کاموں میں بھی اپنا وقت صرف کرتے گویا عقیدت "خدمت" کے قالب میں ڈھل گئی تھی۔

اردو غزل گوئی میں حفیظ ہوشیارپوری کا بڑا مقام ہے۔ ندرت فکر کے ساتھ اسلوبِ بیان بھی دلکش و حسین! اس دورِ بے راہ روی میں اس قدر منجھی ہوئی غزل کہنے والے کم ہی نکلیں گے! مشاعرے کے وہ شاعر ہی نہ تھے۔ اس لیے عام طور پر مشاعروں میں شریک ہونے سے گریز کرتے۔ کسی مشاعرے میں شریک ہونا پڑتا تو اس انداز میں شعر پڑھتے جیسے وہ نثر کا کوئی ٹکڑا دہرا رہے ہیں! اس لیے داد اسٹیج پر بیٹھے ہوئے سخن فہم شعراء ہی تک محدود رہتی۔

اردو شاعری میں چار "حفیظ" شہرت رکھتے ہیں:

(۱) حضرت امیر مینائی کے شاگرد حفیظ جون پوری جن کی غزل کا یہ مطلع مشہور و مقبول بلکہ زبان زدِ خواص و عوام ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

(۲) ابوالاثر حفیظ جالندھری[۱]:

سوچ کر غم دیجیے ایسا نہ ہو! آپ کو کرنی پڑیں غمخواریاں

---

[۱] (ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔) مرتب

(۳) حفیظ میرٹھی :

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے　　دل ٹوٹے آواز نہ آئے
ہائے! وہ نغمہ جس کو مغنی　　روتا جائے گاتا جائے

(۴) حفیظ ہوشیارپوری مرحوم

کیا دل گرفتہ ہم تری محفل سے آئے ہیں　　آنکھوں میں اشک بھی بڑی مشکل سے آئے ہیں

حفیظ ہوشیارپوری مرحوم تقریباً ڈیڑھ سال سے بیمار اور صاحبِ فراش تھے، مہینوں جناح ہسپتال میں زیرِ علاج رہے مگر موت کا علاج کون کرسکتا ہے وہ دن آکر رہا جو ہر جاندار کے لیے مقدر کردیا گیا ہے - اُن کی وفات پر رسالوں اور اخباروں میں مضامین و قطعات شائع ہوئے، ادبی انجمنوں نے تعزیتی قراردادوں کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا ـــــ اللہ تعالیٰ کی مغفرت مرنے والے کے کام آئے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۳ء)

حمید صدیقی لکھنوی

اب سے تیس سال پہلے جناب حمید صدیقی لکھنوی کا نعتیہ کلام رسالوں اور اخباروں میں میری نگاہ سے گزرتا رہا، یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب میں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لکھنؤ کے مدحِ صحابہ کے مشاعرے میں مجھے بلایا گیا، کان پور میں بھی انہیں دنوں ایک مشاعرہ میں چند دنوں کا فصل تھا، ایک چھوڑ دو دو مشاعروں کی دعوت، میں دکن سے چل کر سیدھا لکھنو پہنچا، مدحِ صحابہ کے مشاعرے میں حمید صدیقی کو دور سے دیکھا۔ بات چیت کیا علیک سلیک تک نہیں ہوئی۔ ایک صاحب نے اشارے سے بتایا کہ یہ زائرِ حرم حمید صدیقی ہیں، مگر اُن کی طبیعت ناساز ہے اور گلا بیٹھا ہوا ہے، مشاعرے میں کچھ سنا ئیں گے نہیں۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے جو تھائی صدی ختم ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک برس رہ گیا ہے۔

اب سے پانچ سال قبل کراچی میں حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی یاد میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا اس میں حمید صدیقی مرحوم کو بھی بلایا گیا۔ اُن سے پہلی بار معانقہ ہی میں یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک دوسرے کے نہ جانے کب سے دوست ہیں۔ فرمانے لگے ریڈیو پر "آپ کی نعتیں سنتا رہا ہوں، اور ......" پھر کراچی کی شعر و ادب کی متعدد نشستوں میں اُن سے ملاقاتیں رہیں، اُن کا کلام سُنا۔ اُن کے ساتھ چائے پی، کھانا کھایا، یہاں تک کہ ہوائی جہاز میں کراچی سے ڈھاکہ تک کا سفر کیا۔ وہاں بھی مشاعرہ تھا ایک ہی بنگلہ میں کئی دن ساتھ ٹھہرنا ہوا۔

تعلقِ خاطر کا کرشمہ اور دو دلوں کے ربط و اتحاد کا فیض تھا کہ انتقال سے چند ماہ پہلے حمید صدیقی نے اپنی دو نعتیہ نظمیں خاص طور سے "فاران" میں چھپنے کے لیے ایک صاحب کی معرفت روانہ فرمائیں۔ براہِ راست کلام بھیجنے اور خط لکھنے میں شاید وہ کسی خاص سبب سے محتاط تھے۔ پچھلے مہینے ہندوستان کے ایک اخبار میں چند سطروں کی خبر پڑھی کہ

زائرِ حرم حمید صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد کئی خط بھی مجھے ملے، جن سے اس سانحہ کی تصدیق بھی ہو گئی! کاش! یہ اطلاع غلط اور یہ خبر غیر مصدق ثابت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ کا کارخانہ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا پابند تھوڑی ہے۔ جس جاندار اور ذی حیات کے لیے جو گھڑی مقرر ہو چکی ہے وہ پھر ٹل نہیں سکتی۔

حمید صدیقی کے نعتیہ کلام میں جو تنوع، تازگی، شادابی اور عقیدت و محبت پائی جاتی ہے بس وہ انہی کا حصہ ہے۔ مدینہ منورہ کے گلی کوچوں، باغوں، بازاروں اور حرم نبوی کے دروازوں، ستونوں اور دوسرے متبرک آثار و مقامات کو انہوں نے جس شاعرانہ زبان میں منظوم کیا ہے، اس سے اُن کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، پڑھنے کا انداز بھی بڑا ہی دلکش تھا۔ صورت، شکل اور وضع قطع خالص مشرقی اسلامی! صوم و صلوٰۃ کے اس درجہ پابند کہ اشراق و تہجد اور تسبیح و ذکر معمولات میں داخل تھے، مدینہ اور مدینہ والے کے فدائی، عاشق، متوالے اور مدح خواں! برسوں مسلسل حج کیے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ہر حاضری اور زیارت کے بعد شوق دوچند ہو جاتا، دل کی لگی اور بھڑک جاتی! مدینہ اور سرکارِ مدینہ کی یاد اور تصوّر ہی میں ابدی نیند سو گئے۔

زائرِ حرم حمید صدیقی مرحوم کی زندگی توکل و قناعت کی زندگی تھی۔ اصغر علی محمد علی کارخانہ عطر لکھنؤ سے آخر دم تک ملازمت کا تعلق رہا۔ حاجی اصطفا خاں مرحوم اُن کے قدر دان اور مداح تھے۔ خوش نویسی اور خطاطی پیشہ کے طور پر سیکھی تھی۔ شاعری میں جگر مرادآبادی سے متاثر بلکہ یوں کہیے اُن کے فیض یافتہ تھے۔ ترنم، اندازِ بیاں یہاں تک کہ ڈاڑھی اور چہرے مہرے میں جگر کا مثنیٰ دکھائی دیتے تھے۔ طبیعت میں اس درجہ تواضع و مسکنت اور مزاج میں اس قدر انکسار تھا جیسے انہیں اپنی شاعرانہ شہرت اور مقبولیت کی کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منوّر و معطر اور اُن کی آخرت کو فوز و فلاح اور نجات و مغفرت سے ہمکنار بنائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۶۵ء)

مرزا حیدر بیگ

پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لوگوں سے میرے تعارف بلکہ تعلقات کا ذریعہ مشاعرے رہے ہیں۔ صرف ایک شہر بنگلور ہی کے مشاعروں کی رُوداد بیان کرنا شروع کروں تو اچھی خاصی ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے، دعوتیں، پارٹیاں، استقبالیے، میسور کا دلچسپ سفر —— اس خاک نشین کی طرح طرح سے مدارات اور پذیرائی! ہاں! تو ۱۹۶۱ء میں بنگلور کے ایک کل ہند مشاعرے کی دعوت قبول کر چکا تھا۔ اور ان دنوں حیدرآباد دکن سے وطن آیا ہوا تھا، متھرا میں میرے ایک عزیز کے یہاں شادی تھی، وہیں میرے چھوٹے بھائی (مسرور) نے بمبئی کے مشاعرے کا تار لا کر دیا جو وطن کے پتہ پر آیا تھا جس کے بعد میں نے پروگرام اس طرح بنایا کہ بمبئی کے مشاعرے میں ہوتا ہوا بنگلور جاؤں اور وہاں سے حیدرآباد!

کرافٹ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں ہوٹل تھا، فضل شاہ صاحب اس کے مالک تھے، مولانا ظفر علی خاں مرحوم اسی ہوٹل میں قیام فرمایا کرتے تھے، انہوں نے کچھ اشعار بھی ہوٹل کے مالک شاہ جی مرحوم کی مدح میں کہے تھے۔ جو ایک مخطوطہ کی شکل میں منیجر کے کمرے میں آویزاں تھے۔ راقم الحروف کو بھی مشاعرے والوں نے اسی ہوٹل میں ٹھہرایا۔ مشاعرہ کامیاب نہیں، بہت زیادہ کامیاب رہا۔ متحدہ ہندوستان کے قریب قریب تمام مشاہیر شعراء نے شرکت کی! فلمی ستاروں کے ہجوم نے مشاعرہ گاہ کو اور زیادہ خوش منظر بنا دیا۔

حکیم مرزا حیدر بیگ مشاعرہ کمیٹی کے رکن تھے، اُن سے تعارف ہوا اور مشاعرے کے تیسرے دن وہ ہوٹل سے مجھے اپنے فلیٹ میں اصرار کر کے لے گئے، اُن کے گھر کے لوگ اُن دنوں پونا گئے ہوئے تھے، حکیم صاحب نے بڑے خلوص و محبت کے ساتھ مہمان داری کی۔

چھ سات مہینہ کے بعد بمبئی میں پھر مشاعرہ ہوا میں اُسی ہوٹل میں ٹھہرا حکیم صاحب کو ٹیلیفون کیا تو ناراض ہو گئے کہ تم میرے یہاں آنے کی بجائے ہوٹل میں کیوں گئے، شاعر تو بڑے ملنسار، حساس اور یاروں کے یار ہوتے ہیں، میں نے معذرت کی تو بولے، آپ کی کوئی معذرت قبول نہیں کی جائے گی میں ملازم بھیج رہا ہوں آپ اپنا سامان لے کر اسی وقت وہاں سے چلے آئیے۔

اس کے بعد تو اُن کا مکان مستقل قیام گاہ بن گیا جب بھی میرا بمبئی جانا ہوتا حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرتا، حضرت جگر مرحوم بھی انہیں کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے، دو چار دن نہیں ہفتوں! بعض اوقات جگر صاحب سے ملنے کے لیے دس بارہ بارہ شاعر اور اہلِ ذوق آجاتے، حکیم صاحب کے یہاں سب کی تواضع کی جاتی۔

میری طلب اور کوشش کے بغیر فلم کمپنیوں میں مجھے گانے لکھنے کا کام مل گیا، ہر بار پہل اُدھر ہی سے ہوئی، اب مجھے بمبئی میں زیادہ دنوں تک رہنا پڑا، میں نے سوچا کہ حکیم صاحب کے یہاں مہمانی کب تک، اب مشاعروں کی بجائے روزگار اور بزنس کی صورت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ میرن ڈرائیو میں چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل تھا، غالباً "مرینا" نام تھا، اس کو میں نے ٹھہرنے کے لیے منتخب کیا، حکیم صاحب کو جب میرے اس ارادے اور منتقلی کا پتہ چلا تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا:

"ماہر! میرے یہاں پندرہ سولہ آدمیوں کا کھانا پکتا ہے، تمہارے ایک کے ہونے سے جنس میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کرنا پڑتا، ہوٹل میں روزانہ قیام و طعام کے تمہیں چودہ روپے دینے پڑیں گے، ساڑھے چار سو روپے کے قریب تو یہی ہو گئے، پھر دوستوں کا آنا جانا، سات سو آٹھ سو روپیہ کا خرچ اپنے ذمہ کیوں مول لیتے ہو، میں دواخانہ کے اوپر کا حصہ صاف کرائے دیتا ہوں، دواخانہ میں پنکھا ہے، ٹیلیفون ہے، تمہاری خدمت کے لیے کئی کئی نوکر ہیں تمہیں یہاں کسی چیز کی تکلیف نہیں ہو گی۔"

حکیم صاحب کے پُرخلوص اصرار پر ہوٹل میں منتقل ہونے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا، حیدری دواخانہ (محمد علی روڈ) میں ہی دو ڈھائی مہینہ قیام کیا، ہر طرح کا آرام اور سہولت اور بے تکلفی ایسی جیسے میں اپنے گھر میں رہ رہا ہوں۔

تقسیم ہند کے تقریباً بارہ سال بعد حکیم حیدر بیگ پاکستان تشریف لائے، کراچی میں تخشب جارچوی کے یہاں قیام کیا اور "یوم جگر" کے مشاعرے میں شرکت فرمائی! ان کی صحت پہلی سی نہ رہی تھی کراچی کی معمولی سی سردی میں وہ گرم کپڑوں کے بنڈل بنے رہتے۔

پاکستان بننے کے بعد مشاعروں کے سلسلہ میں بمبئی تین بار جانا ہوا، دوبارہ تخشب

جارچوی کے یہاں ٹھہرا اور تیسری دفعہ مدراس سے آتے ہوئے حکیم صاحب کے یہاں قیام کیا۔ اس سفر میں اُن کے یہاں کھانے کا انتظام غیر معمولی پایا۔ ہر چیز انتہائی خوش ذائقہ اور ایک وقت میں کئی کئی کھانے! اُن کی بیگم صاحبہ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتیں۔

پاک و ہند کی جنگ سے قبل بمبئی سے آنے جانے والوں کی زبانی حکیم صاحب کی خیریت ملتی رہتی تھی۔ نخشب مرحوم کے یہاں سے مہینہ دو مہینہ میں ٹیلی فون پر بھی گفتگو ہو جاتی، تین سال پہلے وہ شدید بیمار ہو گئے اور کئی دن ہسپتال میں آکسیجن پر رہے، پھر اچھے ہو گئے، یہ بھی سننے میں آیا کہ دواخانہ انہوں نے پگڑی پر دے دیا اور اب خانہ نشین ہو گئے ہیں ——— دو سال سے اُن کی کوئی خیر خبر نہیں ملی، اور اسی مہینہ کے روزنامہ جنگ میں خبر ملی بھی تو وہ اُن کی وفات کی خبر تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

حکیم مرزا حیدر بیگ مرحوم کے والد کسی ریاست میں طبیب تھے، حکیم صاحب نے کسی طبی درسگاہ میں باقاعدہ طب نہیں پڑھی تھی۔ اُن کی ذہانت، مطالعہ اور تجربہ نے اُنہیں اچھا خاصہ طبیب بنا دیا، اُن کے ہاتھ میں شفا تھی، اُن کے دواخانہ اور طبابت کو شہرت دواسازی نے دی، دواؤں کی تیاری میں اتنا اہتمام نظامی دواخانہ (کراچی) کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مشک، عنبر، زعفران، جواہرات اور دوسری قیمتی ادویہ خالص اعلیٰ ترین! تکلیس، تسحیق، تدبیر اور قرع انبیق کے فن کے تقاضوں کی پوری پوری رعایت! حیدری دواخانہ کی دوائیں سونے کے مول بکتی تھیں، بندھے ہوئے مستقل گاہک جو کبھی ٹوٹتے ہی نہ تھے۔ طاقت کا ایک نسخہ جس میں کشتہ قلعی ضرور ہوتا پٹینٹ تھا! حکیم صاحب خود چائے نہیں پیتے تھے، میرے لیے شام کو ہوٹل سے چائے منگاتے اور خمیرہ ابریشم ارشد خانی کا ایک چمچہ عنایت فرماتے! اُن کے دواخانہ کا تیار کیا ہوا دانتوں کا منجن، تعریف سے بالاتر، دانت بلور کی طرح چمکنے لگتے۔ دواخانہ حیدری کا شربت پینے میں کام و دہن لذت میں ڈوب جاتے اور ایسا محسوس ہوتا جیسے منہ سے ہی نہیں کانوں سے بھی خوشبو کی لپیٹ نکل رہی ہے۔ حضرت جگر مرحوم کو اور مجھے حکیم صاحب خمیروں کا مرکب عنایت فرمایا کرتے تھے۔ دو تین بار تحفہ اور نذرانہ کی یہی صورت رہی، پھر میرے اصرار پر نصف قیمت لینے کی ملازم کو تاکید کر دی! پاکستان بننے کے بعد دو بار بمبئی سے خمیرہ ابریشم میرے لیے بھیجا۔

حکیم صاحب کا چہرہ، ناک نقشہ، رنگ روپ اُن کے مُغل ہونے کی زندہ دلیل تھا۔ وجاہت کے ساتھ دیدہ زیبی بھی! مجروالمزاج تھے، لہجہ میں بھی مزاج کی گرمی آگئی تھی، بیوی بچے اور ملازم اُن کی گرمیٔ مزاج سے ڈرتے تھے۔ جگر مراد آبادی ہوں یا پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شکیل بدایونی ہوں یا مجروح سلطان پوری جب کہنے پر آتے تو سب کو جھاڑ دیتے! ایک بار ایک خان بہادر صاحب کو جو اُن کے دوست بھی تھے، بے نقط باتیں سنا کر بولے، یہ دیکھو، میں نے پہلے ہی یہ قطعہ لکھ کر دواخانہ میں آویزاں کر دیا ہے کہ ؎ روح را صحبت ناجنس عذاب است الیم

ایک صاحب تھے صابر "تمثیل" نام کا ماہنامہ بمبئی سے نکالتے تھے، پھر وہ فلموں میں (SIDE ACTOR) کی حیثیت سے کام بھی کرنے لگے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے حکیم صاحب کے یہاں آتے اور حکیم صاحب سے عرض کیا کہ ——— ماہر صاحب کو ایک گھنٹہ کے لیے میں لے جانا چاہتا ہوں۔! حکیم صاحب نے اس پر اپنے خاص لہجہ میں فرمایا:

"اگر ایک گھنٹہ سے ایک منٹ بھی زیادہ ہو گیا تو تمہارا نام انسانوں کی فہرست سے خارج کر دونگا۔"

راقم الحروف کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ بمبئی کے خوشحال لوگ مجھے دعوت میں بُلانے لگے، تو فرمایا کہ میں تمہیں یونہی نہیں جانے دوں گا کہ کھانا کھایا، شعر سنائیے، واہ واہ ہوئی اور خالی ہاتھ چلے آئے۔ تمہاری شعر خوانی کا ان سرمایہ داروں کو نذرانہ دینا ہوگا۔

بمبئی میں ایک صاحب تھے محمد طاہر خاں، شاہجہان پور کے رہنے والے، باندرہ میں ان کی شاندار کوٹھی تھی، لاکھوں کے آدمی تھے، اُن کی بیگم صاحبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی حقیقی بھانجی تھیں، بیگم طاہر خاں نے مجھے فون کیا کہ یہاں باندرہ میں ہم خواتین شعر و شاعری کی ایک نشست کا انتظام کر رہی ہیں اُس میں صرف آپ ہی کو بلانا اور سننا مقصود ہے..... مگر حکیم حیدر بیگ سے جو گفتگو ہوئی، تو انہوں نے آڑے ہاتھوں لیا، اور بڑے تند و تیز لہجہ میں کہا کہ ماہر کو نذرانہ ضرور دینا ہوگا! میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ آپ حکیم صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو نہ فرمائیں۔ وقت مقررہ پر کار بھیج دیں میں آ جاؤں گا، حکیم صاحب کو اس کی خبر نہ ہونے پائے ورنہ قیامت ہی آجائے گی! تاریخ اور

وقت طے ہوگیا، پُرتکلف عصرانہ کے بعد شعرخوانی ہوئی، چلتے وقت چاندنی کی عطردانی جو عطر سے بھری ہوئی تھی، مجھے اس بزم میں نذر کی گئی، یہ تحفہ میں نے بھی کسی کو نذر کردیا۔

حکیم صاحب کثیرالاولاد تھے، بچوں کی تعلیم و تربیت مشنری اسکولوں میں ہوئی۔ ان کا ایک لڑکا ہوٹلوں میں پیانو بجانے لگا، اس ماحول اور پیشہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک عیسائی لڑکی سے بالا ہی بالا شادی کرلی، حکیم صاحب نے اُسے گھر میں نہیں رہنے دیا! ان کی ایک لڑکی کی شادی مشہور فلمساز محبوب کے فرزند سے ہوئی، دولہا کی رنگت آبنوسی اور دلہن سراپا جمال اور مجسم رعنائی یہ رشتہ تین چار سال کے بعد منقطع ہوگیا۔ دو ڈھائی سال ہوئے کہ پھر اس لڑکی کی شادی فلم "پکار" کی شہرہ آفاق ہیروئن نسیم کے لڑکے سے ہوگئی۔

حکیم صاحب خوش خوراک، خوش پوشاک اور خوش ذوق انسان تھے، اُن کے یہاں خود مجھے روزانہ کپڑے بدلنے پڑتے، میلے لباس کو دیکھ کر اُن کے ماتھے پر بل پڑجاتے، شعروشاعری کے بعد اُن کو سب سے زیادہ لگاؤ قوالی سے تھا، ان کے یہاں گانے بجانے کی محفل ہوتی تو بڑی فراخدلی کے ساتھ دعوت کا اہتمام کرتے! پکے راگ کو وہ تھوڑا بہت سمجھتے بھی تھے۔

پاکستان بننے کے گیارہ سال کے بعد میں بمبئی گیا تو مشاعرے میں یہ رنگ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ حکیم مرزا حمید بیگ کا نام پکارتے ہی سامعین "مرزا ہینڈ بیگ" کہتے ہوئے تالیاں بجانے لگے اور اسی عالم میں حکیم صاحب نے غزل سنائی! دو تین مشاعروں میں سامعین نے اسی انداز پر اُن کی تواضع کی! یہ ایک رسم سی پڑگئی تھی! —— حکیم صاحب مرحوم موزوں طبع تھے اور زود گو بھی! ایک نشست میں غزل کہہ لیتے، ایک دو بے تکلف دوستوں کی اصلاح و مشورت اور غزل کی تزئین و ترتیب کو بھی قبول فرما لیتے، اُن کا مجموعۂ کلام خاصے اہتمام سے شائع ہوچکا ہے۔ ان کی غزل کا مطلع کتنا بلند اور نفسیاتی ہے۔

تصور آرہا ہے، جا رہا ہے
خیال اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۷ء)

علامہ حیرت بدایونی

راقم الحروف کا تاریخی نام منظور حسین ہے، علامہ حیرت کا نام منظور حسن (۱۳۱۴ھ) تھا، وہ مجھ سے عمر میں دس برس بڑے تھے۔ بدایوں سب سے پہلے میرا جانا ۱۹۲۵ء میں ہوا، اس وقت علامہ حیرت حیدرآباد دکن میں اقامت پذیر تھے، اُن سے پہلی بار تعارف کا موقع حیدرآباد دکن میں ملا۔ یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔

میں ایک دو برس نہیں چودہ پندرہ برس حیدرآباد دکن میں رہا ہوں، علامہ حیرت سے ہفتہ عشرہ میں اور زیادہ سے زیادہ مہینہ دو مہینہ میں ایک دو بار ملنا جلنا رہتا، بے تکلفانہ مراسم کی کوئی حد و نہایت نہ رہی۔

پاکستان بننے کے بعد دوسرے احباب اور عزیزوں کی طرح علامہ حیرت سے ملاقات کا سلسلہ ختم ہو گیا، پندرہ سولہ برس ہوئے ہوں گے جب وہ ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے کراچی تشریف لائے، جناب تابش دہلوی کے یہاں ایک مہینہ کے قریب ان کا قیام رہا، یہ دن بڑی ہنسی خوشی میں گزرے۔ حیدرآباد دکن جانے کے بعد انہوں نے جو مجھے خط لکھا اس میں اخلاص و محبت کی فراوانی تو تھی ہی مگر یہ خط ادب انشا کا بھی شاہکار تھا، یہ خط حفاظت سے رکھنے کے قابل تھا مگر میں کیا کروں اپنی تعریف میں آئے خطوں کو سینت کر رکھنا میرا مزاج ہی نہیں ہے۔ پھر ۱۹۶۲ء میں جب راقم الحروف مدراس کے پاک و ہند مشاعرے میں گیا تھا، تو وہاں علامہ حیرت سے ملاقات ہوئی اور اُن سے یہ آخری ملاقات تھی۔ مدراس کے ایک بڑے ہوٹل میں جناب جوش ملیح آبادی کے ساتھ اُن کو ٹھہرایا گیا۔

جس طرح مہاراجہ کرشن پرشاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم حکومت دکن کے یہاں راقم الحروف کی باریابی مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی مرحوم و مغفور کی وساطت سے ہوئی، اسی طرح علامہ حیرت کو بھی مفتی صاحب نے مہاراجہ بہادر کے دربار میں پہنچایا۔ برس

ڈیڑھ برس مہاراجہ بہادر کے یہاں سے انہیں تنخواہ ملتی رہی، پھر باب حکومت میں مہاراجہ بہادر نے اہلکاری پر اُن کا تقرر کر دیا جہاں تنخواہ کے سوا پچاس روپیہ ماہوار الاؤنس بھی ملتا تھا۔ اب سے پچاس برس پہلے بڑے سستے کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک خاندان سو روپے ماہوار میں آرام و خوشحالی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ باب حکومت سے وہ پھر محکمہ امور مذہبی میں منتقل ہو گئے۔ اور جب وہ وظیفہ (پنشن) پر سبکدوش ہوئے ہیں تو اُس محکمہ میں منتظم (آفس سپرنٹنڈنٹ) تھے۔

حیرتؔ بدایونی نے درس نظامی کی تکمیل بدایوں کے شمس العلوم میں کی تھی، انہوں نے مولوی عالم کا امتحان بھی پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا تھا، اُن کی شخصیت جامع الصفات تھی، وہ عالم تھے، شاعر تھے، مقرر اور انشاء پرداز تھے! وہ جو فارسی کی ضرب المثل "مشت از خروارے" ہے، تو علامہ حیرتؔ کے دو شعر نمونے کے طور پر یہاں درج کرتا ہوں۔

عجب کیا ہے کہ فرق ناظر و منظور مٹ جائے تجلی بڑھتی جاتی ہے نظر کم ہوتی جاتی ہے
تم نہیں ہو تو کیا لطف برسات کا آگ برسا رہے ہیں یہ پانی کے دن

علامہ حیرتؔ کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی، وہ مزاح نگار شاعر نہ تھے، مگر کبھی کبھار اُن کی خوش طبعی اشعار کا روپ بھی دھار لیتی، فرماتے ہیں:

قورمہ کھا لیے یا دال گزر جاتی ہے رہیے میکہ میں کہ سسرال گزر جاتی ہے
کمبی کھو لیے یا ٹال گزر جاتی ہے ابن آدم کی بہر حال گزر جاتی ہے

شاعروں میں اس علمی قابلیت کے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے مشہور سلام (ظہور قدسی) میں "اَحَد" کا قافیہ "اُحُد" نظم کیا، اس پر علامہ حیرتؔ نے ٹوکا کہ "اُحُد" کی "ح" پر زبر نہیں پیش ہے۔ اُن کی گرفت درست تھی عروض میں اختلافِ توجیہہ (اقوا) ایک عیب ہے! مگر میرے خیال میں اسم معرفہ (PROPER NOUN) میں یہ عیب "مکروہ تنزیہی" کا درجہ رکھتا ہے۔

علامہ حیرتؔ کی نثر نگاری کا اندازہ ان کی صاحبزادی جیلانی بانو کے مقبول افسانوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جیلانی بانو اپنے محترم والد علامہ حیرتؔ ہی کی تربیت یافتہ ہیں۔ عربی میں بول چال کی بھی انہیں مشق تھی اور فارسی رباعیاں بڑی جاندار ہیں۔ یار دوستوں نے حیرتؔ بدایونی کو "علامہ" کہنا شروع کیا پھر یہ لقب چل پڑا اور اُن کے نام کا جزو بن گیا۔

علامہ حیرت بدایونی بڑے باغ و بہار آدمی تھے، وہ باتیں کیا کرتے تھے پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے، ان کے طنز و مزاح میں علمی نکات اور نفسیاتی نزاکتیں بھی ہوتی تھیں! دوستوں کی محفل سے وہ سب کو ہنسا کر اٹھتے۔

اُن سے آخری ملاقاتوں میں محسوس ہوا کہ بڑھاپے کی وجہ سے شعر و ادب اور علم و فن کی گفتگو میں ان کا مزاج قدرے ضدی ہو گیا ہے، اور باتوں میں الجھاؤ بھی! تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو بیتا پڑی خاص طور سے حیدر آباد کے سقوط کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو جس آشوب قیامت سے گزرنا پڑا، اُس کے ردِ عمل نے علامہ حیرت کو اس طرح جھنجھوڑا کہ کمیونزم کی طرف قدرے مائل ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ میں سرخ رومال رہتا تھا، مگر بعد میں جاکر یہ ذہول دُور ہو گیا اور یہ دھندلکا بہت جلد چھٹ گیا۔

"فاران" ان کے نام جاتا تھا جسے وہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتے۔ فرماتے تھے کہ ماہر! ہمارے گھر میں الیاس (علامہ کے برادرِ نسبتی) تمہارا مرید ہے، تم لکھتے ہو وہ اُس پر عمل کرتا ہے، وہ "فاران" کے رنگ میں رنگ کر رہ گیا ہے اور تمہارے دینی مشن کا مبلغ ہے۔

وہ جو غالب نے کہا ہے۔

اڑتی سی کچھ خبر ہے زبانی طیور کی

تو علامہ حیرت کی وفات کی خبر کا بھی یہی حال رہا مگر پھر اُن کی صاحبزادی جیلانی بانو سے اس کی تصدیق ہو گئی، کاش! یہ خبر غلط نکلتی ——— مگر کاتبِ تقدیر نے جو لکھ دیا ہے اُسے کون بدل سکتا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۵ء)

عبدالمجید حیرت شملوی

جناب حیرت شملوی کی غزلیں تو رسالوں میں نظر سے گزری تھیں مگر اُن سے سب سے پہلی ملاقات سنہ ۴۳ء یا سنہ ۴۴ء میں دلی میں ہوئی۔ ایک بار وہ اصرار کر کے جلیل قدوائی صاحب کے یہاں بھی لے گئے، جہاں بزم سخن برپا تھی، اور مجاز لکھنوی اپنا کلام سنا رہے تھے، دلی میں کبھی کبھار حیرت صاحب سے ملنا ہوتا رہتا، اُردو بازار میں، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کسی ادبی نشست میں! یہ ملنا ملانا یارانہ کی حد تک نہیں پہنچنے پایا، مگر اُن کی طرف دل کھنچتا تھا اور طبیعت اُن سے قربت اور ہم رنگی سی محسوس کرتی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد دوست، احباب اور عزیز متفرق ہو گئے، کوئی پاکستان میں کوئی ہندوستان میں! بہت سوں کی تو مہینوں خیر خبر ہی نہیں ملی کہ مر گئے یا زندہ ہیں، اور زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ان حادثات نے دلوں کو حساس بھی بنایا اور بے حس بھی!

"فاران" نکلنے کے کوئی ایک سال بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں حیرت شملوی مرحوم کا خط ملا، یہ خط انہوں نے موڑک (کوٹہ بوندی اسٹیٹ) سے لکھا تھا۔ پھر وہ کچھ دنوں کے بعد رام پور چلے گئے اور خط و کتابت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ میری طرف سے جواب دینے میں کبھی کوتاہی یا تاخیر ہو جاتی تو وہ نہ بُرا مانتے اور نہ شکوہ کرتے! اُن کے مزاج میں بڑا تحمل تھا، کسی مسئلہ میں اختلاف بھی کرتے تو بڑی شائستگی کے ساتھ، کسی قسم کی طنز و تعریض نہیں! لہجہ نرم اور ہمدردانہ! بہت سے لوگوں کو بحث کرنے اور اُلجھنے میں مزہ ملتا ہے، مگر حیرت شملوی اس مزے اور چٹخارے سے نا آشنا تھے، کوئی شاعر اور ادیب اُن کے دینی معتقدات کا کتنا ہی مخالف ہوتا، اُس کا بھی احترام کرتے، اور اس کی فن کارانہ عظمت کا اعتراف بھی!

جب تک وہ رام پور میں رہے، جناب عروج زیدی بدایونی کے ذریعہ (جو راقم الحروف اور حیرت شملوی کے مشترک کرم فرما ہیں) طرفین کی خیریت ملتی رہتی، "فاران" میں مرحوم کی

غزلیں چھپتی رہی ہیں اور نہ جانے کتنی بار بے طلب نوازش کی ہے۔

۱۹۶۲ء میں پاکستان آنے کے بعد وہ چند مہینہ سکھر میں مقیم رہے، پھر کراچی آ گئے یہاں کلفٹن میں حضرت سید عبداللہ شاہ غازی بخاری کی درگاہ ہے وہاں محکمۂ اوقات کے ناظم صاحب کی نوازش و توجہ سے اُن کے قیام و طعام اور ماہوار الاؤنس کا انتظام ہو گیا مگر اس عالم میں وہ کب تک رہتے، بیوی بچے کہیں، وہ کہیں! حکومت ہند نے پنشن ملنے کی کارروائی بھی کئی سال سے معلق تھی۔ اس قدر شدید علالت اور افکار کا ہجوم پھر گھر بلو طعن و طنز کی بوچھاڑ اور سوہانِ روح! انہیں کا دل گردہ تھا کہ ان مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

میں پہلی بار نخشب جارچوی کی کار میں، اُن کے اور تابش دہلوی صاحب کے ساتھ حیرت شملوی سے ملنے کے لیے کلفٹن گیا، درگاہ کے عقب میں ایک حجرے میں جو متوسط درجہ کا کمرہ تھا وہ مقیم کیا صاحبِ فراش تھے، چلنے پھرنے سے قطعاً معذور! اُن کی دُنیا بس پلنگ تک سمٹ کر رہ گئی تھی، اسی عالم میں لیٹے لیٹے پُرخلوص مسکراہٹ سے ہمارا خیر مقدم کیا، تھوڑی دیر بات چیت رہی پھر ہماری فرمائش پر انہوں نے اپنی دو غزلیں سنائیں! اس کے بعد میرا اُن کے یہاں جانا دو تین بار سے زیادہ نہ ہو سکا جس کی مجھے خدا جانتا ہے بڑی ندامت ہے! اپنی مصروفیات کا عذر کروں تو یہ عذر خود میرے نزدیک "بدتر از گناہ" ہے۔

حیرت شملوی مرحوم کے خطوط کئی سال ہوئے "فاران" میں چھپے تھے، ان کو وہ مرتب کرنا چاہتے تھے، اور اصرار تھا کہ "فاران" کے فائل سے وہ شمارے لے کر میں اُن کے یہاں جاؤں تاکہ وہ اُن خطوں کو نقل کر لیں، میں سوچ ہی رہا تھا کہ آج جاؤں کل جاؤں ..... اسی تردد و تامل کے عالم میں اُن کے داماد عبدالوحید خاں صاحب نے ٹیلی فون پر یہ غم انگیز خبر سنائی کہ ۹ ستمبر کو حیرت صاحب اچھے بھلے تھے اور بعض احباب کو اپنی غزل کو دے رہے تھے مطلع سنانے کے بعد طبیعت ایکا ایکی بگڑ گئی اور پھر نہ سنبھلی اور تھوڑی سی دیر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حیرت شملوی انگریزی دورِ حکومت میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے اور بڑی شرافت اور آبرو کے ساتھ متوسط درجہ کی زندگی گزارتے تھے، اُن کی فرض شناسی کارکردگی اور قابلیت کے سبب عہدیدار اُن سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتے، تقسیم ہند سے کچھ

دنوں قبل ان پر فالج کا خفیف سا حملہ ہوا اور اُس کے بعد اُن کا دھڑ بالکل ماؤف ہوگیا۔ چلنے پھرنے سے پوری طرح معذوری! سولہ سترہ سال انہوں نے اسی تکلیف کے عالم میں گزارے۔ سردی کے موسم میں یہ تکلیف اور بڑھ جاتی مگر اس قدر مسلسل اور تکلیف دہ علالت کے باوجود عام مریضوں کی سی تنک مزاجی پیدا نہیں ہونے پائی صبر و شکر اور ظرف و تحمل کی یہ دولت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔

لیٹے لیٹے ہی شاعری کرتے، کتابیں اور اخبار پڑھتے، دوستوں کو خط لکھتے آخری دور میں خطوط نویسی شاید اُن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا اس میں اُن کا خاصہ وقت صرف ہوتا بلکہ گزر جاتا۔ کراچی میں جب وہ آکر مقیم ہوئے تو جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری اور مُلّا واحدی جیسے مشاہیر اُن سے ملنے کے لیے گئے۔ دو بار حیرت شملوی نے ریڈیو اسٹیشن کراچی سے اپنا کلام خود سنایا۔ اُن کا ریڈیو اسٹیشن پہنچنا بس انہی کی ہمت تھی!

چند دن وہ جناح ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بھی رہے ہیں تسے وہاں جاکر عیادت کی تو بڑی مسرت کا اظہار کیا، دو شاعروں کی ملاقات اور گفتگو آس پاس کے مریض قدرے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ عجیب لوگ ہیں ہنستے بولتے جھومتے ہیں اور پھر کئی کئی منٹ کے لیے کسی گہرے سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔

منحنی جسم، چھوٹا قد، بچوں جیسے ہاتھ، باریک ناک نقشہ مگر مجموعی طور پر بدن متوازن! شاید جسم و اعضاء کی مناسبت سے چھوٹی بحروں میں زیادہ تر غزلیں کہتے تھے، کلام ترنم سے سناتے، قد و قامت کی طرح اگرچہ آواز نحیف اور پست تھی مگر نغمگی سے خالی نہ تھی! نہایت مشاق غزل گو شاعر، مصرعوں کے نوک پلک درست، تغزل میں قیامت کی سادگی اور بے تکلفی، ہر غزل میں ایک آدھ شعر تو ضرور "ممتنع" ہوتا — ! زبان و روزمرہ کی پابندی کا سختی کے ساتھ خیال رکھنے والے! "آئینۂ حیرت" اُن کا کلام شائع ہو چکا ہے، نثر میں "بنی اسرائل کا چاند" اردو ناول ترجمہ کی حیثیت سے یادگار چھوڑا! نہ جانے اُن کے کتنے نثر پارے، یادداشتیں اور غزلیں چھپنے سے رہ گئیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ موتی بازار میں آئیں گے یا گمنامی کے گرد و غبار میں دب کر رہ جائیں گے۔

دینی فکر میں جماعت اسلامی سے نہ صرف یہ کہ متاثر بلکہ اس کے پُرزور موئد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مداح و عقیدت مند! شدید علالت و معذوری کے زمانے میں

بھی نماز سے غافل نہ رہے، صبر و شکر اور سختیاں جھیلنے کے معاملے میں مردِ مومن اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

جناب مُلّا واحدی دہلوی نے حیرتؔ شملوی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کارڈ روانہ فرمایا ہے، جس پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء ۱ بجے دن۔ مرقوم ہے! اور مندرجہ ذیل غزل سے یہ نامہ محبت شمامہ مزین ہے:-

ایک مدت سے حزیں ہے کوئی ‏ اس قدر بر سرِ کیں ہے کوئی
ہم نوائے دلِ ناشاد نہیں ‏ ہم نے مانا کہ حسیں ہے کوئی
واسطہ اس سے پڑا ہے دل کا ‏ جس کا ایماں ہے نہ دیں ہے کوئی
ذرّہ ذرّہ ہو جہاں دشمن جاں ‏ وہ بھی رہنے کی زمیں ہے کوئی
بدگمانی کا وہی عالم ہے ‏ خاک پابندِ یقیں ہے کوئی
ہے ہماری ہی نظر کی خامی ‏ ورنہ کچھ دور نہیں ہے کوئی
حال سب کا ہے وہاں آئینہ ‏ بے خبر ہے تو ہمیں ہے کوئی
چھوڑیے شکوۂ اربابِ جفا ‏ دیکھیے رحیم بہ جبیں ہے کوئی

حالِ دل کس کو سنائیں حیرتؔ
سُننے والا بھی نہیں ہے کوئی

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پروفیسر محمود الحسن خسرو

۱۹۳۸ء میں مہاراجہ کشن پرشاد صدرِ اعظم حیدرآباد دکن کے دربار میں پہلی بار پروفیسر خسرو کو دیکھا، انہوں نے ترنم کے ساتھ اپنی غزلیں بھی سنائیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عربی کے فاضل ہیں جامعہ ملیہ (دہلی) اور مدراس کی کسی عربی درسگاہ سے اُن کا تعلق رہا ہے، کچھ دنوں سے حیدرآباد میں وکالت کر رہے ہیں، پھر اُن سے دو چار بار حیدرآباد میں ملاقاتیں ہوئیں! مگر یہ تعارف زیادہ تفصیلی نہ تھا، پاکستان بننے کے بعد جب وہ دکن سے کراچی تشریف لے آئے تو اُن سے ملنے جلنے کے مواقع ملتے رہے۔

مسٹر غلام محمد جب حکومتِ پاکستان میں فنانس منسٹر تھے تو اُن کی کوٹھی کے قریب ایک فلیٹ میں عطیہ فیضی رہتی تھیں بمبئی میں جب وہ تھیں تو اُن کے یہاں ہر چہار شنبہ کو اہلِ قلم کا اجتماع ہوتا تھا، مجھے خاص طور پر اصرار کر کے بلاتیں، شعر و شاعری کا دور رہتا اُس کے بعد چائے نوشی! یہاں کراچی میں بھی "سفری آرٹس سرکل" (بمبئی) کی روایات کو عطیہ فیضی نے باقی رکھا اور ہر چہار شنبہ کو اُن کے فلیٹ میں اجتماع ہونے لگا۔

ایک بار مسٹر جی۔ ایم سید اس اجتماع میں شریک ہوئے اور پروفیسر محمود الحسن خسرو بھی! پروفیسر خسرو کی گفتگو سے مسٹر جی۔ ایم سید بہت متاثر ہوئے، اُن کو اپنی کوٹھی میں دعوت دے کر بلایا اور باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد اُن سے اصرار کیا کہ آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں تنہا ہیں، میرے یہاں آپ قیام فرمائیں تو میں آپ سے عربی پڑھوں گا، میرے بچے بھی آپ سے استفادہ کریں گے۔ چنانچہ پروفیسر خسرو جی ایم سید کی کوٹھی میں رہنے لگے۔ یہ کوٹھی نشتر پارک (قدیم پٹیل پارک) سے متصل واقع ہے۔ جب تک خسرو صاحب کا قیام جی۔ ایم سید صاحب کے یہاں رہا، مہینہ میں دو تین بار اُن سے ملنے کے لیے میں ضرور جاتا اور اس بہانے جی۔ ایم سید صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی!

پروفیسر محمود الحسن خسرو کئی برس مسٹر جی۔ ایم سید کے یہاں مہمان رہے۔ اُن کو

ہر طرح کا آرام میسر تھا، جی ایم سید صاحب کی میزبانی کی وہ تعریف کرتے تھے، جب سید صاحب اپنی جاگیرسن میں اقامت گزیں ہوتے تو خسرو کا بھی وہیں قیام رہتا۔ پروفیسر خسرو جی ایم سید کے سیاسی خیالات سے نہ صرف یہ کہ متفق نہیں تھے بلکہ مخالف تھے۔ اُس زمانے تک سید صاحب پر اسلام اور پاکستان کی مخالفت اور صوبائی عصبیت کا بھوت سوار نہیں ہوا تھا، ہاں! ان کے ذہن و فکر میں اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی[1]

خسرو مرحوم ایک بار سن سے کراچی آئے تو شہد کی ایک بوتل مجھے تحفہ میں دی، سن کا شہد پورے سندھ میں مشہور ہے مگر دو ڈھائی مہینہ کے بعد اس میں تلخی آگئی جس شہد کو میں خالص سمجھ کر استعمال کرتا رہا اس میں ملاوٹ نکلی۔

جی۔ ایم سید نے کچھ دنوں پروفیسر خسرو سے عربی پڑھی، ان سے علمی مسائل پر گفتگو بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے لڑکوں کے بھی وہ ایک حد تک اتالیق اور نگراں تھے۔ پھر جی ایم سید پروفیسر خسرو سے قرض لینے لگے، کبھی دو ڈھائی ہزار کبھی اس سے بھی زیادہ! یہاں تک کہ قرضہ کی رقم تیس بتیس ہزار تک پہنچ گئی، اور پھر انہوں نے خسرو کو دھتا بتا دی! خسرو سید صاحب کی کوٹھی سے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے قرضہ کے بارے میں بہت کچھ منت سماجت کی، اپنی غریب الوطنی اور بے روز گاری کا بھی واسطہ دیا مگر جی۔ ایم سید کا دل نہ پسیجا وہ لٹ لٹا ہو گئے! خسرو مرحوم کے بعض بہی خواہوں نے عدالت میں نالش کرنے کا مشورہ بھی دیا مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے حالانکہ خسرو مرحوم کے پاس جی۔ ایم سید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض رقوم کی رسیدیں بھی تھیں۔

مسٹر جی۔ ایم سید کے یہاں قیام کے زمانے میں خسرو مرحوم نے عربی سے اُردو کی لغت چار جلدوں میں لکھ ڈالی، میں نے اُس لغت کے بعض اجزاء کو دیکھا تھا، بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ یہ لغت انہوں نے مرتب کی تھی۔ عربی کی مشہور لغات الصحاح، المحکم، لسان العرب، القاموس المحیط، اقرب الموارد اور المنجد لغت نویسی میں ان کا منبع و ماخذ تھیں! ابو نصر اسمٰعیل جوہری (المتوفی ۳۹۵ھ) کی الصحاح اور سعید الشرتونی (لبنانی ادیب ۱۸۴۹ - ۱۹۱۲) کی اقرب الموارد کے وہ بہت مداح تھے، افسوس ہے اتنی مفید اور

---

[1] مسٹر جی ایم سید نے کراچی میں مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں اسمبلی کا الیکشن لڑا تھا۔

جامع لغت چھپ کر منظرِ عام پر نہ آسکی۔

پروفیسر خسرو مدراس کے جمالیہ کالج میں پرنسپل رہے تھے، دینی علوم میں اُن کی خاصی گہری نظر تھی، حج پر جامع اور مفید کتاب لکھی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ غالباً روزے اور نماز پر بھی کئی کتابیں تالیف کی تھیں، کسی مسئلہ پر اُن سے بحث و گفتگو ہوتی تو اپنی علمی قابلیت کی طرف اشارے بھی کر دیتے! اُن کی عمر ۸۵ برس سے کم نہ تھی، پیرانہ سالی کے سبب مزاج میں تندی وبرہمی پیدا ہو گئی تھی، تنہائی اکثر و بیشتر لوگوں کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے مگر پروفیسر خسرو تنہائی سے مانوس ہو گئے تھے، تنہا نشینی میں انہیں لطف آتا تھا۔ اسٹار ٹیکسٹائل ملز کے مالک سیٹھ دادا بھائی مرحوم اُن کے قدر دان تھے۔ سیٹھ صاحب کے یہاں اتوار کے دن ضرور جاتے اور دو تین گھنٹہ مذاکرہ اور علمی گفتگو رہتی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی اگر کراچی میں ہوتے تو وہ اور مسٹر حسین امام اس محفل میں ضرور شرکت فرماتے!

پروفیسر محمود الحسن خسرو کے علم و فضل کو بہت ہی کم لوگوں نے جانا، گمنامی اور تنہائی ہی اُن کے لیے مقدر ہو چکی تھی، اُن کی موت پر دو سطریں بھی کسی اخبار اور رسالہ میں نظر سے نہیں گزریں مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ وہ شہرت پاتے تو نہ جانے کیسے کیسے حاسدوں اور بد خواہوں کا ہدف بنتے، گمنامی نے اس اذیت سے انہیں محفوظ رکھا۔ برد اللہ مضجعہ۔

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۵ء)

دردؔ سعیدی

صابرؔ دہلوی مرحوم سے راقم الحروف کی انتہائی بے تکلفی کی دوستی تھی، یہ شخص بڑا باغ و بہار تھا۔ صابرؔ کے ساتھ زیادہ وقت ہنسنے ہنسانے اور لطیفوں اور چٹکلوں ہی میں گزرتا، میں جن دنوں دلّی میں رہتا تھا، اُسی زمانے میں (غالباً ۱۹۳۵ء تھا) صابرؔ نے مجھ سے کہا کہ آغا شاعرؔ دہلوی کے فرزند آغا سرخوش کی کتابوں کی دکان (نگارستان) پر ٹونک کا ایک نوجوان نیا نیا ملازم ہوا ہے، یہ اس کا حلیہ ہے، شعر سن کر جس انداز میں وہ داد دیتا ہے، بس وہ دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے، تمہیں لطف آجائے گا! چنانچہ ہم دونوں "نگارستان" پہنچے، وہاں شعر خوانی ہوئی، دردؔ صاحب کی والہانہ انداز میں داد سے خوب لطف لیا۔ اُن سے میرا یہ پہلا تعارف تھا، دلّی میں وہ جب تک رہے ان کی زبان سے اُن کا کوئی شعر نہیں سُنا، غالباً دردؔ صاحب اپنی مسکینی اور انکسار کے سبب شعر سنانے سے جھجکتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں ٹونک کے مشہور شاعر جناب بسملؔ سعیدی کے زیرِ اہتمام خاصے بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہوا، جناب شعریؔ بھوپالی کی وہ جو مشہور غزل ہے:

کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

یہی مصرع طرح قرار پایا! بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی، مگر مشاعرہ گاہ میں حاضرین کی کثرت نے سردی کے علی الرغم خاصی گرمی پیدا کر دی، رات کو نو بجے جو مشاعرہ ہوا ہے تو دن میں دس بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ صبح کے دَور میں ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم والیٔ ٹونک بھی تشریف لائے!

اس مشاعرے میں اس نفسیاتی حقیقت کا احساس ہوا کہ شاعر اپنی مشہور اور منتخب غزل پر دوسری غزل کہے گا تو وہ اُس کے جوڑ کی نہیں ہوگی، شعریؔ صاحب کو اپنی وہی مشہور غزل مشاعرے میں پڑھنی تھی، مگر انہوں نے دوسری نئی غزل کہی،

جو اُن کی مشہور و مقبول پرانی غزل کے مقابلہ میں بہت پھیکی رہی!

بسمل سعیدی صاحب سے میرے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے اور اب بھی ہیں۔ اگرچہ تقسیم ہند نے سینکڑوں میل کا بُعد مکانی پیدا کر دیا ہے! مشاعرے کے بعد دعوتوں اور شعری نشستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، بسمل صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ریاست کے مفتی صاحب نے میری ایک نظم پر کفر کا فتویٰ دیا ہے وہ تمہیں اپنے یہاں دعوت میں بلائیں، تو وہاں نہ جانا۔ چنانچہ ایک صاحب لوٹنک کے مفتی اعظم کی دعوت کا پیغام لے کر آئے، مگر میں ٹال گیا۔ انہوں نے بہت اصرار کیا، لیکن میں نے مفتی صاحب کے یہاں جانے کی ہامی نہیں بھری، جب وہ مایوس ہو گئے تو فرمانے لگے رات کے مشاعرے میں آپ کی غزل کا مطلع ـــــــ

یہی ہے زندگی اپنی یہی ہے بندگی اپنی
کہ تیرا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

کچھ تھا نہیں، مگر مشاعرے کے لیے "بم کا گولہ" ثابت ہوا، میں اُن صاحب کی اس طنز پر مسکرا کر رہ گیا۔ جو داد بھی تھی اور بیداد بھی!

ہاں! تو اسی مشاعرے میں درد سعیدی صاحب کی غزل پہلی بار اُن کی زبان سے سُنی، ان کی غزل کے تین چار شعر مشاعرے میں خاصے پسند کیے گئے اور بسمل صاحب کے اشارہ کرنے پر درد صاحب جلدی سے مقطع پڑھ کر، اسٹیج سے اتر آئے! پھر کراچی میں پاکستان بننے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔

درد سعیدی نے پاکستان آنے کے بعد سندھ کے ایک معروف قصبہ ٹنڈو آدم کو اپنا مستقر بنایا، اس نام کو سن کر پہلے ہنسی آیا کرتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ نام گوارا ہو گیا، مجید لاہوری نے کیا خوب کہا ؎

جانے والے! ٹنڈو آدم بھی اسی منزل میں ہے

مگر جب سے ایک ریلوے اسٹیشن پر "اللہ دینو ساند" کا بورڈ نظر سے گزرا تو "ٹنڈو آدم" بہت غنیمت معلوم ہونے لگا۔

ٹنڈو آدم خاصہ بڑا قصبہ اور اُس نواح میں تجارتی مرکز ہے، آبادی چالیس ہزار سے کچھ زائد ہی ہوگی، درد سعیدی مرحوم کی بدولت وہاں شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا،

خاصے بڑے پیمانے پر وہاں مشاعرے ہوتے رہے ہیں، جن کے کرتا دھرتا ورد مرحوم ہی ہوتے تھے، ایک مشاعرے میں حضرت جگر مراد آبادی، مجاز لکھنوی اور روش صدیقی نے بھی شرکت فرمائی، ورد صاحب خاکسار کو بڑے اصرار کے ساتھ مشاعروں میں بلاتے، دعوت نامہ میں اکثر یہی لکھتے کہ سب سے زیادہ رقم آپ ہی کو دی جارہی ہے، یہاں کے حالات کے لحاظ سے یہ بہت بڑی پیشکش ہے، آپ کو ضرور آنا پڑے گا!

ٹنڈو آدم میں سب سے بڑا آخری مشاعرہ اب سے چند سال پہلے ورد صاحب ہی کے زیر اہتمام منعقد ہوا، قابل اجمیری مرحوم اس وقت زندہ تھے، وہ بھی شریک ہوئے، اس مشاعرے میں ایک صاحب کی غزل کا یہ مطلع

ٹھہر بھی جا درِ ساقی پہ دو گھڑی کے لیے
تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لیے

حاصل مشاعرہ رہا۔

ورد سعیدی کے بارے میں دو سال پہلے سننے میں آیا کہ وہ بیمار ہیں اس کی اطلاع کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں، ڈاکٹر اختر صاحب کے خط سے ملی، انہوں نے لکھا کہ ورد صاحب کی حالت اچھی نہیں ہے کراچی میں آکر علاج کے لیے اتنے سو روپیہ درکار ہوگا۔ میں نے اختر صاحب کو بھی لکھا اور ورد سعیدی کو بھی کہ آپ اللہ کا نام لے کر کراچی آجائیے یہاں انشاء اللہ سب کچھ بندوبست ہو جائے گا۔

گزشتہ رمضان میں وہ کراچی آئے، دو دن ایک ہوٹل میں ٹھہرے، پھر دفتر "فاران" میں آگئے، اور بیس پچیس دن قیام کیا۔ میں انہیں لے کر جناح سنٹرل ہسپتال کے ناظم اعلیٰ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ کینسر کے شعبہ کے جو ڈاکٹر صاحب انچارج ہیں وہ ولایت گئے ہوئے ہیں آٹھ دس دن میں آجائیں گے اُن سے رجوع کرنا ضروری ہے، پھر وہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے، ورد سعیدی کو انہوں نے دیکھا، اور بجلی لگانے کا مشورہ دیا، مگر ورد صاحب نے فرمایا کہ بجلی لگانے میں بڑی تکلیف ہوگی، میری صحت اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے گی، اس عرصہ میں انہوں نے ہومیوپیتھک علاج بھی شروع کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ میں فائدہ محسوس کر رہا ہوں، اس کے بعد وہ اپنے معالج سے دو ہفتہ کی دوا لے کر

ٹنڈو آدم چلے گئے، فرماتے تھے کراچی کا پانی مجھے موافق نہیں آتا، یہاں کی آب و ہوا میں سانس کی تکلیف پیدا ہوگئی۔

ٹنڈو آدم سے اُن کے خط آتے رہتے، کسی خط میں لکھتے کہ پہلے کے مقابلہ میں فائدہ ہے، کسی میں یہ کہ تکلیف بڑھتی جارہی ہے، اسی دوران میں سانگھڑ، جو ضلع کا مستقر ہے۔ میرا جانا نکل آیا وہاں مشاعرہ تھا "روزنامہ جنگ" کے نمائندے نے مجھ سے کہا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب سے آپ درد صاحب کی مالی امداد کے لیے کہیں، مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا، میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا کہ درد سعیدی صاحب آپ کے ضلع کے نامور شاعر ہیں، کینسر میں مبتلا ہیں، مشاعرہ فنڈ سے اُن کی امداد فرمائیں۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا، مشاعرہ ختم ہوجانے کے بعد میں نے پھر کہا! معاملات میں تکرار اور اصرار میری عادت ہے! ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے علم دوست، بات کے پکّے اور قول کے سچّے نکلے۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے خود ٹنڈو آدم جاکر درد سعیدی کی مزاج پُرسی کی پانسو روپیہ عنایت فرمائے۔

درد سعیدی کے مرض میں کبھی ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا، کبھی افاقہ اور کبھی زیادتی! کئی مہینہ تک یہی اُتار چڑھاؤ رہا، وہ دوبارہ کراچی تشریف لائے اور تقریباً ایک مہینہ اپنے ہم وطن شاعر جوہر سعیدی کے یہاں کورنگی کے کوارٹر میں قیام فرمایا اور پھر ٹنڈو آدم واپس چلے گئے وہاں پہنچ کر مرض کے ساتھ کمزوری بھی بڑھتی رہی، لکھنا پڑھنا تک موقوف ہوگیا، دوسروں سے خط لکھواتے یہاں تک کہ ایک دن صبح سویرے اخبار "جنگ" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی۔

درد سعیدی شعر و سخن میں بسمل سعیدی کے شاگرد تھے، شاعری میں بتدریج ترقی کی خوش گو اور صاحب ذوق شاعر! مطالعہ بھی خاصہ وسیع تھا، دفتر "فاران" میں جب ان کا قیام تھا تو میں نے فلسفہ کی کتابیں انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا، بال بچّوں کے بکھیڑے سے آزاد تھے ضعیفہ ماں کی بہت خدمت کی، پردیس میں وہ بھی دنیا سے سدھار گئیں۔ شروع شروع میں ٹنڈو آدم کے کسی پرائمری اسکول میں مدرسی کی، پھر وہاں میونسپل لائبریری میں منتظم ہوگئے، ان کی خوش ذوقی اور محنت نے اس لائبریری کو چار چاند لگا دیئے، قصبہ کے خاص و عام میں اُن کی بڑی عزت تھی، جماعت اسلامی کے ہمدرد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے عقیدتمند تھے، شاعری میں ایک دیوان یادگار چھوڑا! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۶ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

میں انگریزی مڈل اسکول کی ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا جب علی گڑھ میگزین کا کوئی شمارہ نظر سے گزرا، یہ میرا عہدِ شعور تھا، اس سے پہلے مجھے یاد پڑتا ہے بدایوں کا ماہنامہ "نقیب" اور لاہور کا "عالمگیر" میرے مطالعہ میں آچکا تھا۔ علی گڑھ میگزین کے سرِ ورق پر رشید احمد صدیقی کا نام دیکھ کر ہی یاد ہو گیا، پھر ان کے دو تین مضامین جستہ جستہ پڑھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سلور جوبلی پر علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ ضخیم بھی تھا اور متنوع بھی! میں ان دنوں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، اس خاص نمبر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ انہوں نے اپنے اس مقالے میں وہ عبارتیں، اشعار، ضرب الامثال، مصرعے اور فارسی اردو کے جملے اور مقولے جمع کر دیئے تھے جو شادی بیاہ، ختنہ، غسل صحت، عید بقرعید، شب برات، سالگرہ، تعزیت، کھانے کی دعوت، مبارکباد اور پرسے وغیرہ کے موقعوں پر بولے اور لکھے جاتے ہیں، اس مضمون سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد جس رسالے میں بھی ان کا مضمون نظر آتا اسے پورا پڑھ کر دم لیتا۔ فانی بدایونی کے مجموعۂ کلام "باقیاتِ فانی" پر ان کا طویل مقدمہ بار بار پڑھا اور ذہن و فکر نے اس کا اثر قبول کیا۔ ملا رموزی بھوپالی کی "گلابی اردو" کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا مگر رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ لطف انگیز طنز کے آگے "گلابی اردو" نقشِ بے رنگ ہی نظر آئی! قاضی عبد الغفار مرادآبادی کے "لیلیٰ کے خطوط" کی دھوم مچی ہوئی تھی، کوئی شک نہیں یہ خطوط طنز و ادب کا شاہکار ہیں مگر اسی زمانے میں رشید احمد صدیقی کے مضامین رسالوں میں نظر سے گزرے تو میرا ذوق و وجدان محسوس کرتا کہ —— ایں جہانے دیگر است! ان کی ادبی شخصیت طلوعِ صبح کی طرح میرے ذہن و فکر کے افق پر ابھرتی جا رہی تھی!

سنہ ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ نمائش میں مشاعرہ تھا، مسٹر ابو طالب نقوی (A-T. NAQVI)

علی گڑھ کے کلکٹر مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ پروفیسر عبدالعزیز پوری مشاعرے کے کنڈکٹر تھے، طلباء نے مشاعرے میں اس قدر زور شور کی ہوٹنگ کی کہ مشاعرہ کا اختتام ضروری سمجھا گیا، اتنے میں راقم الحروف مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا اور پھر صبح چار بجے تک یہ بزم جمی رہی۔ میں نے سامعین کی فرمائش پر اپنی دسیوں غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ اس کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسٹر ایم۔ بی احمد علی گڑھ میں سیشن جج تھے اُن کے یہاں خاصہ پُر تکلف عشائیہ رہا ——— علی گڑھ کلب میں بھی شعر و ادب کی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں زیادہ تعداد یونیورسٹی کے پروفیسروں، لیکچراروں اور ضلع کے ڈپٹی کلکٹروں اور عہدے داروں کی تھی۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو "اُردوئے معلیٰ" نام کی کوئی انجمن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قائم تھی اس میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مجازؔ لکھنوی اور راقم الحروف کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو فرمایا۔ رشید صاحب مرحوم نے مجازؔ اور میرے بارے میں تعارف کراتے ہوئے تحسین آمیز کلمات کہے۔ رشید احمد صدیقی مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

جب تک میں ہندوستان میں رہا رشید صاحب اور میرے درمیان خط و کتابت کا کوئی موقع نہیں آیا۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں نے "فاران" نکالنا شروع کیا تو اُن کی خدمت میں رسالہ بھیجا اور اُن سے مضمون لکھنے کی درخواست کی! مرحوم بے حد مصروف انشاء پرداز تھے۔ "یک انار و صد بیمار" والا معاملہ تھا، میری طرح نہ جانے کتنے بہت سے ایڈیٹر اُن کے مضامین کے خواہشمند اور تمنائی تھے! اٹھائیس برس کے "فاران" کے شماروں کو دیکھنا کارِ دشوار ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کون سا مضمون کس عنوان سے شائع ہوا، عام طور پر وہ معذرت ہی کر دیا کرتے تھے! ہاں اُن کے مضامین کے مجموعوں پر "فاران" میں تبصرے ضرور ہوئے ہیں۔

جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جو کانووکیشن ایڈریس پڑھا اُسے وائس چانسلر کے دفتر کے ایک ذمہ دار عہدیدار نے "فاران" میں تبصرے کے لیے بھیجا اور اپنے مراسلے میں لکھا کہ رشید احمد صدیقی صاحب نے اس "خطبہ" کی آپ کے یہاں بھیجنے کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "فاران" میں کتابوں پر تبصروں

کو وہ اہمیت دیتے تھے۔

رشید احمد صدیقی اب سے تقریباً ۶۵ برس پہلے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کلکٹری کچہری یا کسی سرکاری دفتر میں کلرکی کے خواہشمند تھے مگر اپنے خیر خواہ دوستوں اور بزرگوں کے غیرت دلانے اور ہمت بڑھانے پر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کالج میں داخل ہو گئے! اُن کا تعلیمی کیریر شاندار اور حوصلہ افزا رہا، پھر وہ ایم اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گئے اس کے بعد برسوں ریڈر رہے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے سے دو تین برس پہلے پروفیسری کا اعزاز میسر آیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو وہ "مرشد" کہا کرتے تھے اور آپس میں بڑے خوشگوار تعلقات تھے بلکہ یوں کہیئے بے تکلفی تھی! مگر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی وائس چانسلری کے دور میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کو توسیع نہیں مل سکی حالانکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی روایات کے مطابق دو تین برس کی توسیع مل سکتی تھی اس سانحہ نے انہیں بہت کچھ دل برداشتہ کر دیا، یونیورسٹی کی تقریبات میں حصہ لینا قطعاً موقوف کر دیا بلکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی) کے لکھنے کے مطابق رشید صاحب نے پھر مسلم یونیورسٹی کے احاطہ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا جب تک جامعہ ملیہ سے تعلق رہا اُن کے رویہ کی سب تعریف کرتے تھے کس اخلاص و ایثار کے ساتھ انہوں نے جامعہ ملیہ کی خدمت بلکہ یوں کہیے سرپرستی کی مگر سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں سے وابستگی نے ان کو وہ نہ رہنے دیا جس کی اُن سے توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ عزیمت اور جرأت سے کام لیتے تو اُن کی شخصیت ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا ایک حد تک سہارا بن سکتی تھی! مگر اُن کی سیرت کا یہ ورق سادہ ہی رہا۔

مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کی نسبت سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا جو گھریلو سانحہ ظہور میں آیا اس سے رشید صاحب کو بہت بڑا دھچکا لگا اس صدمہ نے انہیں اپنی ذات سے بیزار کر دیا اب ان کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ ادیبوں اور ایڈیٹروں کے اصرار کے باوجود خطوں میں تاکید کے ساتھ لکھ دیا کرتے تھے کہ مجھ پر کوئی مضمون شائع نہ کیا جائے کوئی رسالہ میری شخصیت پر "خاص شمارہ" نہ چھاپے، مجھ پر کوئی کتاب نہ لکھی جائے راقم الحروف نے اُن سے پُر زور درخواست کی کہ اپنے جستہ جستہ خود نوشت حالات

"فاران" کے لیے بھیجیں مگر چند سطروں کے جواب میں انہوں نے اپنی دل گرفتگی اور دل شکستگی کی داستان رقم کر دی۔ کون شاعر اور ادیب شہرت نہیں چاہتا مگر رشید احمد صدیقی اب شہرت سے دُور بھاگتے تھے۔ اُن کا کچھ ایسا رویہ تھا جو لوگ جانتے ہیں وہ بھی اُن کو بھول جائیں تو اچھا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے دو صاحبزادے کراچی آ گئے تھے، ان کے برادر نسبتی اور دوسرے اعزا بھی پاکستان میں موجود تھے، یہاں کے ادیب اور اہل قلم بھی اُن کے لیے چشم براہ تھے مگر رشید احمد صدیقی نے پاکستان آنے کا نام ہی نہیں لیا جیسے انہوں نے پاکستان آنے کی قسم کھا رکھی تھی، وہ کچھ دنوں کے لیے تشریف لے آتے تو اُن کی بڑی پذیرائی ہوتی۔ مگر اب اُن کو خیر مقدم، پذیرائی اور اعزاز و تکریم کی تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اُن کا دل بجھ گیا تھا اور ولولے سرد ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کی بیگم صاحبہ دو تین بار عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے کراچی تشریف لائیں کئی ملاقاتوں میں راقم الحروف نے محسوس کیا کہ وہ شعر و سخن سے خاصی دلچسپی رکھتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی شریف النفس انسان تھے اُن کی ذات سے کسی کو دُکھ نہیں پہنچا، دل آزاری کو وہ کفر سمجھتے تھے اور خدمت خلق کو عبادت! خدمت خلق اور دوسروں کو آرام اور سہولت پہنچانے کا جذبہ اُن پر اس قدر غالب تھا کہ اس کے مقابلے میں فرائض عبادت شاید اُن کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ، رسول، اسلام اور آخرت کے بارے میں اُن کا یقین پختہ اور غیر متزلزل تھا، ملت اسلامیہ کے سچے بہی خواہ تھے۔ اس کے ساتھ سر سید احمد خاں سے بھی وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ "تجدد" کی بھی تھوڑی بہت چھینٹ اُن کو لگ گئی تھی! مسلمان حقوق العباد ادا کرنے میں چونکہ ڈھیل برتتے ہیں اس لیے وہ حقوق العباد پر بہت زور دیتے تھے اور دوستوں اور عزیزوں کی گھریلو زندگی کی عافیت، اطمینان اور خوش حالی کی خبر اُن کے لیے نوید جانفزا ہوتی تھی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اوّل کے اہل قلم میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے خطوں میں لکھتے ہیں کہ فلسفہ سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر اُن کے طنز و مزاح میں فلسفیانہ تفکر ملتا ہے۔ اُن کی طنز برائے طنز نہیں برائے زندگی ہوتی ہے۔ اُن

کے قلم نے معاشرے کو بہت کچھ دیا ہے ــــــ تعمیری رجحانات اور پاکیزہ افکار!
زبان پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔ اُن کی تحریروں میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ لمبے چوڑے جملوں کو بھی وہ اپنی فن کاری سے نباہ لیتے ہیں۔
علی گڑھ سے انہیں بے حد محبت تھی، کم و بیش ساٹھ برس مسلسل علی گڑھ میں رہے جوانی بھی یہیں گزری بڑھاپا بھی علی گڑھ میں بسر ہوا اور آخر اسی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے۔

رشید احمد صدیقی اس دَور سے بھی گزرے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اُن کی ملازمت ختم کر دی گئی اور توسیع نہ مل سکی اور پھر انہوں نے اپنے لائق فرزند (ڈاکٹر احسان رشید) کو کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے پر فائز بھی دیکھ لیا۔ صاحبِ "گنج ہائے گراں مایہ" کی قبر پر اللہ کی رحمت کے پھولوں کی بارش ہو۔ (آمین)

رشید احمد صدیقی کی تحریریں اردو زبان و ادب کی آبرو ہیں، اُن کی کوئی سطحی تحریر یا چلتا ہوا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، اُن کا ہر مقالہ بلند پایہ ہوتا، وہ صاحب فکر اور صاحب طرز ادیب تھے، اپنے اندازِ فکر اور اسلوب نگارش میں منفرد! جو بات کہی سلیقہ کے ساتھ کہی۔ حسنِ ابلاغ کے فن سے وہ پوری طرح واقف تھے، اسی لیے اُن کی تحریریں دلنشیں ہوتیں ؎

جو پڑھتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۷ء)

علّامہ رشید ترابی

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

اس عالم کون و فساد میں موت ہر جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے فانی اور آنی جانی ہے، احتیاج اور فنا مخلوق کی صفت ہے، آدمی کوئی شک نہیں خلاصہ کائنات اور اشرف المخلوقات ہے مگر وہ "ضعیف البیان" بھی تو ہے۔

کریں کیا اپنی ہستی کا یقیں ہم
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں ہم

جس جان کے لیے کاتب تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے اُس میں کمی بیشی ممکن نہیں، ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا ـــــ مگر

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے پیغامِ فنا دیتا ہے

ہر قبر ایک نشانِ عبرت ہے، مہد سے لے کر لحد تک کا فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو جاتا ہے ؎ موت میں اور حیات میں وقفہ درمیاں کہاں
دنیا میں چل چلاؤ لگا ہوا ہے

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

حافظ شیرازی نے بڑی سچی بات کہی

؎ زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

عہدِ رسالت کا واقعہ ہے ایک صحابی کا جنازہ قبرستان میں رکھا تھا، قبر کھودی جا رہی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشِ خاک پر رونق افروز تھے اس موقعہ پر حضورؐ

نے فرمایا: ـــــــ "لوگو! آج کے لیے کچھ رکھو۔"

جس کسی نے زندگی کھیل کود اور عیش و تفریح میں گزار دی وہ بڑے ٹوٹے میں رہا، اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ وہاں اعمالِ صالحہ کام آئیں گے، ساتھ جانے والی چیز نہ تخت و تاج ہیں، نہ جاہ و منصب مال و دولت اور شہرت ہیں۔

ـــــ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

مولانا رشید ترابی کے ذکر نے حیدرآباد دکن کی یاد دلا دی اور بہت سی دبی ہوئی چوٹوں کو ابھار دیا، سلطنت آصفی نے علوم و معارف کی سرپرستی و آبیاری اور اہلِ کمال کی قدر شناسی میں قرطبہ اور غرناطہ کی یاد تازہ کر دی تھی، جامعہ عثمانیہ بغداد کی شہرہ آفاق درسگاہ نظامیہ کا نقشِ بدیع تھی، آج کی طرح دل بجھے ہوئے اور سہمے ہوئے نہ تھے، وہ مشرقی بادشاہت یورپ کی نام نہاد جمہوریت اور عوامی (پرولتاری) حکومت کے مقابلے میں رحمت تھی!

کاش! صاحبانِ اقتدار و اختیار نوشتۂ دیوار پڑھ سکتے

کم کن ز کبر و ناز کہ دیداست روزگار

چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہ کے

ہاں! تو یہ اب سے ۳۰ سال پہلے کی بات ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے۔ روزنامہ "رہبرِ دکن" میں جلسۂ عام کا اعلان نظر سے گزرا کہ فلاں تاریخ کو نمازِ عشاء کے بعد جدید ملک پیٹ کے میدان میں لسان الامت نواب بہادر یار جنگ کی زیرِ صدارت جلسہ ہوگا جس میں رشید ترابی (بی۔اے عثمانیہ) تقریر کریں گے، عوام و خواص کے لیے بالکل نیا نام پھر مقرر کے نام کے ساتھ مولوی، مولانا، حضرت، قبلہ، مدظلہ...... غرض تعظیم و تکریم کا کوئی لقب نہ تھا، مشرقی امتحانات اور دینی علوم کی کسی ڈگری کی بجائے بی۔اے لکھا ہوا، ذہن اس طرف جاتا تھا کہ ایک گریجوایٹ مذہب و شریعت پر کیا بولے گا، اور وہ بھی اُس اجتماع میں جس میں جنوبی ہند کے سب سے بڑے خطیب نواب بہادر یار جنگ کو بھی مجمع سے خطاب کرنا ہے، اُن کے سامنے کس کا چراغ جل سکتا ہے! جدید ملک پیٹ کا میدان بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا، اسٹیج پر نواب صاحب (مرحوم) کے قریب ایک خوش پوشاک اور

خوبرو جوان شخص بیٹھا تھا، عمر بہت سے بہت پچیس چھبیس سال کی ہوگی مگر شیخ سعدی کے بقول :
بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

تلاوت کے بعد یہی جوان اس جلسہ کا پہلا مقرر تھا، اس نے آغاز میں حمد وصلوٰۃ پر مشتمل عربی خطبہ اس انداز سے پڑھا کہ اُس کا چہرہ سامعین کی نگاہوں کا مرکز بن گیا! تقریر کا موضوع اچھوتا مگر ساتھ ہی انتہائی خشک، وضو کرتے ہوئے جو پانی ناک میں لیتے ہیں یعنی "استنشاق" تقریر کا عنوان تھا، تھوڑی سی دیر میں سامعین کو اندازہ ہوا کہ یہ تو بلبلِ ہزار داستان ہے جس کے میٹھے بول کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ اور پھر صرف لب لہجہ اور الفاظ ہی نہیں، استدلال بھی، معلومات بھی، تقریر وخطابت کے فن کا حسین مظاہرہ بھی، ترابی صاحب نے دماغی اعصاب، ناک و حلق کی ساخت اور ان کے سائنسی وظیفہ عمل (SCIENTIFIC FUNCTION) کی نہایت ہی دلچسپ اور عالمانہ انداز میں تشریح کی اور پھر طب مغربی کے اصولوں کی روشنی میں ثابت کیا کہ ناک میں پانی لینے (استنشاق) سے دماغ کے کن امراض کا ازالہ ہوتا ہے اور وضو کا یہ عمل صحت کے لیے کس قدر مفید اور فطرت کے عین مطابق ہے، مجمع سے سبحان اللہ، جزاک اللہ اور نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سارے شہر میں اس تقریر کی دھوم مچ گئی، وہ دن جناب رشید ترابی کے تعارف کا پہلا دن تھا، پھر تو مجلس اتحاد المسلمین کے ہر بڑے جلسہ میں ان کی تقریر ہوتی اور اُن کی خطابت سے سماں بندھ جاتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے سعید الملک سر احمد سعید خاں نواب چھتاری جب صدرِ اعظم ہوئے تو باغ عام میں بلدہ حیدر آباد کے معزز شہریوں نے اُن کے اعزاز میں بڑے پیمانے پر ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس ضیافت میں رشید ترابی مرحوم نے بھی مختصر سی تقریر کی اور لوگوں کے اصرار پر شعر بھی سنائے، شعر سنانے سے پہلے فرمایا کہ تقریر مقامِ اختیار تھا اور شعر خوانی مقامِ جبر ہے۔

بلدہ حیدر آباد کے عظیم الشان جلسوں میں نواب بہادر یار جنگ اور علامہ رشید ترابی کی تقریروں کے ساتھ میری نظم بھی لازماً ہوتی تھی، اس طرح مرحوم سے ملنے جلنے کے مواقع ملتے رہتے، جب بھی آمنا سامنا ہوتا مصافحہ کے ساتھ معانقہ

بھی کرتے، اس پیران کا محبوبانہ تبسم جو دل میں اُتر جاتا۔ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کے انتقال سے دو ڈھائی سال پہلے اتحاد المسلمین کے جلسوں میں رشید ترابی شاذ و نادر ہی دیکھے گئے! یہ دنیا ہے یہاں افراد اور تنظیموں سے وابستگی اور ربط و تعلقات میں مد و جزر بھی آتے رہتے ہیں!

نواب بہادر یار جنگ کی تقریر میں ایسا محسوس ہوتا جیسے بادل برس رہا ہے اور جناب رشید ترابی جب تقریر کرتے تو ایسا لگتا جیسے کوہ آتش فشاں حرکت میں آگیا ہے! اُن کی تقریر و خطابت کے جوہر پوری طرح پاکستان میں آکر کھُلے، مجالسِ عزا میں بس انہی کا طوطی بولتا تھا، ادبی زبان میں جسے فضا پر چھا جانا کہتے ہیں وہ چیز ان کو میسر آگئی تھی، وہ جب تقریر کرتے تو مجمع ان کی مٹھی میں ہوتا، جہاں چاہا رُلا دیا اور جہاں چاہا دلوں کو گرما دیا اسی کا نام "سحرِ خطابت" ہے۔

راقم الحروف نے شیعہ مقررین میں علامہ حائری، مولانا سید سبط حسن، حکیم مرتضیٰ حسن، علامہ کفایت حسین، مولانا سید محمد دہلوی، علامہ ابن حسن جارچوی، مولانا کبن صاحب لکھنوی اور مولانا لقاعلی بدایونی کو سُنا ہے، مدرسۃ الواعظین کے پرنسپل مولانا سید سبط حسن تو خطابت و تقریر کے بادشاہ تھے، دوسرے مقررین کا کچھ ایک دوسرے سے ملتا جلتا انداز تھا مگر رشید ترابی مرحوم کی خطابت میں جو انفرادیت پائی جاتی تھی وہ انہی کا حصہ تھی اپنی ذہانت سے نئے نئے موضوعات ایجاد کرتے اور اُن پر الفاظ و بیان اور استدلال کی عمارت کھڑی کر دیتے، مجھے یاد ہے کہ "خالقدینا ہال" میں جو اُن کے مواعظ سال ماہ محرم کے شروع کے دس دنوں میں ہوتے تھے۔ ایک بار اُن کی تقریر کا عنوان "حسینؑ اور اقتصادیات" تھا۔ اس موضوع پر بولنا اور نبھانا بس انہی کا کام تھا۔ تقریر میں الفاظ کی وہ پُر جوش روانی جیسے بپھرا ہوا دریا اور موّاج سمندر! اس طوفان میں بعض اوقات اتنی دُور نکل جاتے کہ خود ہی چونک کر موضوع کی طرف واپس آتے!

خلفاءِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں شیعوں کے جو معتقدات ہیں وہ سب کو معلوم ہیں اگرچہ : ؎

ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

اپنی محفلوں اور مجلسوں میں ذاکرین کسی نہ کسی عنوان سے خلافتِ راشدہ اور صحابہ کرامؓ

پر طنز ضرور کرتے ہیں اور بعض شیعہ مقررین کا اتنا عمیق انداز ہوتا ہے ــــ کہ کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اُمّت پر دُنیا داری کا غلبہ ہو جانا" یہ صحابہ کرامؓ کے مقدس معاشرے پر چوٹ ہے ــــ "اسلام میں مدافعت کے لیے تلوار اٹھانا جائز ہے۔ ملک فتح کرنے اور حدودِ مملکت بڑھانے کے لیے اسلام تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔" یہ خلفاءِ ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مثالی دور کی فتوحات اور مجاہدانہ معرکہ آرائیوں پر طنز ہے ــــ پھر جب بھی شیعہ مقررین یقین کے مقابلے میں شک بولتے ہیں، اخلاص سے نفاق کا مقابلہ کرتے ہیں کہ قرآن کو وہی معصوم نفوس سمجھ سکتے ہیں جو مہبطِ وحی و قرآن سے خاندانی قربت رکھتے ہیں ــــ تو شیعہ سامعین ان تمام اشاروں کی رمز سمجھ کر خوب داد دیتے ہیں کہ اس طنز کا کن شخصیتوں کی طرف روئے سخن ہے، رشید ترابی صاحب کی تقریریں جو مجالسِ عزا میں ہوتی تھیں اُن میں اس قسم کے طنزیہ اشارے کنایے ہوتے تھے۔ مگر وہ افتراق و نزاع کے مقابلے میں اتحاد و رواداری کو ترجیح دیتے تھے کہ طنز و تنقید موجبِ فساد نہ بننے پائیں اور بات رمز و اشارات تک محدود رہے!

اپنی تقریروں میں علامہ اقبالؒ کے اشعار وہ بڑے سلیقہ سے استعمال کرتے جس سے تقریر کا لطف دوبالا ہو جاتا! مولانا رشید ترابی کے لب و لہجہ میں بڑی کشش تھی، تقریر کا آغاز دھیمی آواز سے ہوتا پھر لہجہ بلند تر ہوتا جاتا اور آخر میں پوری قوت کے ساتھ سینہ پر زور دے کر اس قدر تند و آتشیں انداز میں بولتے کہ دوسرا مقرر دو چار تقریروں کے بعد شاید خون تھوکنے لگتا! اُردو فصیح اور شستہ ہوتی مگر کبھی کبھار دکنی روزمرہ زبان سے نکل جاتا، شامِ غریباں کی تقریر میں فرمایا:

"حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے سے کہا تمہاری آنے سیلاؤ۔"

اس جملے میں "اپنی" کہنے کا محل تھا مگر دکن میں اپنی کی جگہ "تمہاری" بولتے ہیں! دسویں محرم کو عاشورے کے دن "شامِ غریباں" کی تقریر نے علامہ رشید ترابی کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ کروڑوں آدمی اُن کی اس تقریر کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے سنتے تھے۔

میرا مزاج یہ ہے کہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو کلمۂ حق کہتے ہوئے میں

جھجک محسوس نہیں کرتا اور رشید ترابی سے تو دوستانہ روابط تھے۔ تقریباً بارہ برس پہلے کی بات ہے، رجب کی ستائیسویں شب میں "معراج نبوی" کے موضوع پر ان کی تقریر اور میری نظم تھی۔ اس پروگرام کے بعد جب ہم دونوں براڈ کاسٹنگ روم سے نکل کر گیلری میں آئے تو میں نے کہا کہ حضرت! آپ کی تقریر خوب تھی مگر آخر میں ایسے جملے زبان سے ادا ہوئے جو توحیدی نقطۂ نگاہ سے خاصے محلِ غور تھے! ـــ احباب کی ایک محفل میں فرمایا کہ کئی برس ہوئے ملتان میں "کل مذاہب کانفرنس" ہوئی تھی۔ دوسرے علماء نے توحید کو سلبی انداز میں پیش کیا، مگر میں نے ایجابی انداز میں توحید کی شرح و ترجمانی کی، اس پر میں بولا کہ قرآن کریم میں ایجابی اور سلبی دونوں انداز پائے جاتے ہیں یہ کہ اللہ تعالیٰ قادر و توانا ہے اور کافروں کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ منکرینِ حق اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور "ان اللہ لیس بظلام للعبید"! میری باتیں سن کر رہ خاموش رہے.....

رشید ترابی مرحوم نے خاندانی منصوبہ بندی کی زبان سے نہیں عملاً قانون شکنی اور خلاف ورزی کی، کثیر الاولاد اور کثیر الازواج! شہرت کے ساتھ خوشحالی اور ترفہ میں اضافہ ہوتا گیا، اتنا بڑا کنبہ رکھنے کے باوجود معاشی طور پر غیر مطمئن نہیں رہے انہیں ہر طرح کا آرام اور آسائش میسر تھی۔ علامہ ترابی کی شخصیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہز ہائی نس میر پور ان کے خویش قرار پائے۔

ملک کے سیاسی حالات پر اخباروں میں ان کا ردِ عمل عوام کے سامنے نہیں آتا تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سیاسیات کے خارزار سے اپنے دامن کو بچائے رکھا، ان کی اس روش کے سبب کسی بھی دورِ حکومت میں ان کو خطرناک نہیں سمجھا گیا۔ اربابِ اقتدار پر تنقید کی برہنہ شمشیر تو مولانا ابن حسن جارچوی تھے۔

مرحوم کی آخری علالت کے دوران مرکزی منسٹر نے ان کے علاج و معالجے کے اخراجات کی کفالت کا اعلان کیا۔ مگر علامہ مرحوم کے مخلص خیر خواہ اور عقیدتمند اس کے منتظر رہے کہ ان کے اہلِ خاندان کی طرف سے اخباروں میں بیان آیا کہ فیاضی اور ہمدردی کا یہ سلوک ضرورت مند مریضوں کے ساتھ کیا جائے مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے: ؎ تجھ کو کیا معلوم ناصح! کون کس مشکل میں ہے

خود صاحبِ کمال اور اہلِ کمال کے قدردان بھی تھے۔ استاد قمر جلالوی کو برسوں اپنے یہاں مہمان رکھا اور ہر طرح کی خاطر داری اور پذیرائی کی، استاد قمر رشید ترابی مرحوم کی مہمان نوازی اور سیر چشمی کے بڑے مداح تھے:

مطالعہ بہت وسیع تھا کتب بینی اُن کا محبوب شغل تھا، مقرر بھی، مصنف بھی اور شاعر بھی مگر تقریر و خطابت اُن کا سب سے نمایاں اور ممتاز وصف تھا، اسی نے اُن کی شخصیت کو ابھارا اور چمکایا، شاعری پر پوری طرح وقت صرف کرنے اور توجہ دینے کا موقعہ نہیں ملا مگر پھر بھی اُن کا کلام بعض مشہور شاعروں کے کلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے!

سال سوا سال ہوا اُن کے صاحبزادے نصیر ترابی صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے اور اپنی شادی کی دعوتِ ولیمہ کا رقعہ دیتے ہوئے بولے: "باباتے کہا ہے کہ ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں، آپ اس دعوت میں ضرور آئیں" ان دنوں میری بعض مصروفیات بھی تھیں، اپنے رسالہ کی تیاری اس پر مستزاد! مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ علامہ رشید ترابی محبت سے یاد فرمائیں اور میں طرح دے جاؤں۔ چنانچہ میں حاضر ہوا، دوسروں سے تو وہ مصافحہ کرتے رہے مگر مجھے دیکھ کر بے ساختہ آگے بڑھے اور گلے سے لگا لیا۔

تیرہ اولادیں چھوڑیں اور سب کو ناز و نعم سے پالا اور لکھایا پڑھایا، اُن کے صاحبزادے مولانا عقیل ترابی صاحبِ علم و فضل اور تقریر و خطابت میں اور شکل و صورت میں بھی باپ کے شبیہہ اور "الولد سرٌ لابیہ" کے مصداق ہیں۔

رشید ترابی مرحوم پر کئی بار دل کے دورے پڑے، مہینوں ہسپتال میں رہے، کئی دفعہ آکسیجن دی گئی، اچھے ہو کر اُسی شان اور لب و لہجہ کے ساتھ مجالسِ عزا میں تقریریں کرتے اور پھر بیمار پڑ جاتے، دل اتنی مشقت برداشت کرنے کے قابل کہاں رہا تھا، آخر یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا، اُن کی موت پر ہفتوں اخبارات میں مشاہیر کے تعزیتی بیانات ادیبوں اور شاعروں کے مضامین، نظمیں اور قطعے آتے رہے! شاہنشاہِ ایران تک نے تعزیت کا پیغام بھیجا اور پاکستان کے وزیرِاعظم قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے! اتنی شہرت، ہر دلعزیزی اور مقبولیت ہر بڑے شخص کو کہاں میسر آتی ہے۔ رہے نام اللہ کا!

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۴ء)

روشؔ صدیقی

یہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے، جب روشؔ صدیقی کی نظمیں ماہنامہ "نگار" (لکھنؤ) میں شائع ہوتی تھیں، اُن کی شاعری کے بارے میں شروع ہی سے راقم الحروف کے ذہن و وجدان اور ذوق و طبیعت نے اچھا اثر قبول کیا، اُن سے ملاقات (غالباً) ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ وہ پہلی بار حیدرآباد دکن تشریف لائے، ان دنوں میرا وہیں قیام تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت، صدر اعظم نے شعراء کو دعوت میں بلایا، روشؔ صدیقی کو خاص طور پر مہمان شاعر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ الوال[1] مہاراجہ بہادر کی جاگیر کا صدر مقام اور عدالتوں کا مستقر تھا، ایک دن قبل مہاراجہ بہادر نے حیدرآباد کے انگریز رزیڈنٹ کو الوال میں ڈنر دیا تھا۔ دوسرے دن شعراء کی دعوت میں بھی وہی اہتمام رہا۔ مہاراجہ کے یہاں دو نوجوان انگریز لڑکیاں (GOVERNESS) تھیں وہ بھی ڈنر میں شریک رہیں، حالانکہ بعض دوسری دعوتوں میں میں نے انہیں نہیں دیکھا غالباً شعراء کے ذوقِ نگاہ کی پذیرائی مدنظر تھی! ان میں ایک لڑکی انتہائی صحت مند اور خوب صورت تھی، سرو قد، شہابی رنگت اور سیاہ پتلیاں! روشؔ صاحب سے پھر جب کہیں ملاقات ہوتی تو اس دعوت کا ضرور ذکر آتا، ذوقِ نظارہ و جمال شاعر کی خوبی بھی ہے اور اُس کی کمزوری بھی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مشاعروں میں حضرت جگرؔ مرادآبادی کے علاوہ حفیظؔ جالندھری، احسانؔ دانش، ساغرؔ نظامی اور روشؔ صدیقی کو بلایا جاتا تھا۔ ہم تک تو مشاعروں میں ان شاعروں کی پذیرائی کے قصے پہنچتے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد راقم الحروف کو بھی "آل انڈیا قسم" کے مشاعروں میں شرکت کے مواقع ملنے لگے،

---

[1] بلدہ حیدرآباد سے دس بارہ میل پر واقع ہے اور بلارم چھاؤنی سے قریب تر!

روشؔ صاحب سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں کراچی میرا آنا ہوا، خاصے بڑے پیمانے پر مشاعرہ تھا۔ روشؔ صاحب بھی تشریف لائے مگر وہ آتے ہی شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے۔ دو سال کے بعد پھر یہاں مشاعرہ ہوا، نعمانؔ تاثیر صاحب جو پاکستان بننے سے پہلے شعر و ادب کی سرگرمیوں میں خاصہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ گمنام ہو گئے ہیں اُن کے فلیٹ کی بالائی منزل (SUMMER HOUSE) میں روشؔ صاحب اور میرا ٹھہرنا ہوا، تین چار دن اُن کا ساتھ رہا۔ اس سفر اور رفاقت کی خاص بات یہ ہے کہ روشؔ صدیقی نے اپنا کوئی شعر مجھے نہیں سنایا، میں نے باتوں باتوں میں اپنے دو تین شعر انہیں سُنا دیئے اور پھر سوچا تو ندامت ہوئی کہ روشؔ اس معاملہ میں وزنی نکلے اور میں ہلکا ثابت ہوا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں تیسری بار کراچی کا پھیرا ہوا، حضرت جگرؔ، روشؔ صدیقی اور مجھے رائل ہوٹل (میکلوڈ روڈ، اصفہانی بلڈنگ کے قریب) میں ٹھہرایا گیا! پاکستان بننے کے بعد روشؔ کئی بار کراچی تشریف لائے (غالباً) سنہ ۱۹۵۲ء میں جگرؔ، مجازؔ لکھنوی، روشؔ صدیقی اور راقم الحروف ٹنڈو آدم کے مشاعرے میں بھی شریک ہوئے! ایک بار بابائے اردو مولوی عبدالحق نے شعر و سخن کی تقریب میں جگرؔ مراد آبادی اور روشؔ صدیقی کو تحفے دیئے۔

روشؔ صدیقی آخری بار اب سے ڈیڑھ سال پہلے سنہ ۱۹۶۹ء میں کراچی آئے، میں ان دنوں افریقہ اور یورپ کے سفر میں تھا، واپس آیا تو کراچی ایرپورٹ پر بعض دوسرے احباب کے ساتھ روشؔ صاحب بھی موجود تھے! بڑی محبت اور خندہ پیشانی کے ساتھ بغل گیر ہوئے، دو تین بار غریب خانہ پر بھی تشریف لائے۔ اس بار روشؔ مرحوم کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، پُر تکلف دعوتیں، شاندار استقبالیے، سپاسنامے اور ان کے اعزاز میں شعر و سخن کی صحبتیں!

روشؔ صدیقی کا شمار مشاہیر شعراء میں ہوتا تھا، نظمیں غزلوں سے اچھی اور غزلیں نظموں سے زیادہ حسین! کوئی شک نہیں روشؔ صاحب طرز شاعر تھے حسن و عشق کے معاملات کی ترجمانی میں انہوں نے ادب و سنجیدگی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا، اُن کا کلام اُن کی زندگی کی طرح شریف، پاکیزہ اور معصوم تھا! بادہ و ساغر کا ذکر بھی کیا تو اس انداز میں:

غمیں نہ ہو جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

اور

ہمیں رسم سفر آئی نہ اندازِ قیام آیا — نہ جانے ہم کہاں ہو گئے اگر اُن کا پیام آیا

مرزا غالب کی زمینوں میں ایسی ایسی معرکہ کی غزلیں کہیں کہ غالب زندہ ہوتے اور سنتے تو ان کی "انا" حیرت زدہ ہو جاتی!

صوم و صلوٰۃ کے پابند، خوش عقیدہ اور خوش اوقات مسلمان، جگر صاحب کے ساتھ کبھی کبھار لیس رمی کھیل لیا کرتے تھے، اُن کے بارے میں کوئی اور بات دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی۔

عجیب بات ہے کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے، مگر اُن کی شاعرانہ شہرت و شخصیت کا یہ اثر تھا کہ ہر بڑے مشاعرے میں اُن کو بلایا جاتا، بعض اوقات طویل نظم شروع کر دیتے تو مجمع میں سکوت کے بعد سرگوشیاں سی ہونے لگتیں، پھر روش صاحب اور سامعین کے درمیان طنز و تنقید، عمل اور ردِ عمل سوال و جواب اور نوک جھونک کا سلسلہ شروع ہو جاتا! سامعین جب ہوٹنگ کے موڈ میں ہوں تو انہیں کون روک سکتا ہے!

روش صدیقی بڑے کنبہ پرور اور عزیزوں کے ساتھ سلوک کرنے والے تھے، والد کے خدمت گزار فرزند! مجھ سے کہتے تھے کہ ماہر صاحب! میرے والد بھی قادری ہیں، تمہارا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کرتے ہیں! شاعری ہی روش کا ذریعہ روزگار تھا، کئی سال آل انڈیا ریڈیو سے ملازمت کا تعلق رہا۔ وہاں ساغر نظامی پہلے سے موجود تھے، بادشاہوں کی طرح شاعر بھی "بہ اقلیمے نہ گنجند" ساغر کی ملازمت برقرار رہی اور روش سبکدوش کر دیئے گئے۔

روش صدیقی کی شادی دیر سے ہوئی، اس وقت اُن کی عمر ۳۵ کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر اُن کی خانگی زندگی انتہائی خوشگوار تھی، اُن کے خسر مظہر جلیل صاحب شوق مراد آبادی اپنے داماد (روش) کی سعادت مندی پر فخر کرتے تھے! روش صدیقی کے کراچی سے واپس جانے کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے یہاں آئے، قد میں تو روش صاحب سے نکلتے ہوئے تھے مگر صورت شکل میں عین مین باپ کی شبیہ، چہرے سے ——

دمی تاقت، ستارۂ بلندی"! نوعمری میں کتنے ہی تعلیمی اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔
دو ہفتہ ہوئے میں اپنے مکان میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا اتنے میں جناب تابش دہلوی کا ٹیلی فون آیا، آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر سنی ہے کہ روش صدیقی شاہجہاں پور کے مشاعرے میں گئے تھے وہیں اُن کا ہارٹ فیل ہوگیا ——— کتنی غیر متوقع اور غم انگیز خبر، دل کو دھچکا سا لگا، میں نے محمد صالح صاحب کو اسی وقت ٹیلی فون کیا، وہ غلام محی الدین صاحب اشرفی (پنشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس) کو اپنی کار میں لے کر غریب خانہ تشریف لائے پھر ہم شوق صاحب کے یہاں پہنچے، اُن کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، شوق صاحب یوں بھی دھان پان ہیں۔ بیٹی کی بیوگی اور داماد کی اچانک موت کے غم نے اُن کے بدن میں لرزش سی پیدا کر دی تھی، مگر اُن کے مومنانہ تحمل کو صد آفریں کہ زبان صبر و شکر اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تمجید کے کلموں سے تر تھی! اللہ تعالیٰ مرنے والے کو آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۱ء)

رئیس احمد جعفری ندوی

رئیس احمد جعفری مرحوم سے بمبئی میں پہلی بار ملاقات ہوئی، ان دنوں وہ روزنامہ "خلافت" کے ایڈیٹر تھے۔ بمبئی میرا آنا جانا ہوتا رہتا تھا اور وہاں کے قیام میں کسی نہ کسی دعوت یا جلسہ میں مرحوم سے ملاقات ضرور ہو جاتی۔ ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف نے کل ہند پیمانے پر "حلقۂ فکر و نظر" قائم کیا تھا۔ مقصد نام نہاد ترقی پسند ادب کی بے راہ رویوں کی روک تھام تھی۔ بمبئی کی شاخ کا صدر رئیس احمد جعفری مرحوم کو مقرر کیا گیا، وہ مجھے دہلی، بمبئی سے خط لکھتے رہتے کہ آپ نے میرے ساتھ جن کام کرنے والوں کو منتخب کیا ہے وہ زیادہ فعال نہیں ہیں اس لیے حلقہ کے کام میں سستی پائی جاتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ بھی کراچی آ گئے اور میں نے بھی اسی شہر کو اپنا مستقر بنایا۔ حکیم نصیر الدین صاحب ندوی[1] جو ندوہ میں برسوں مرحوم کے ہم درس رہے ہیں۔ اُن کے یہاں (نظامی دواخانہ" میں) جعفری صاحب مرحوم سے ملنا جلنا رہتا، پھر وہ لاہور چلے گئے، وہاں ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے اور مرتے دم تک اس ادارہ سے ملازمت کا تعلق رہا۔ ادارۂ مذکور کے آرگن "المعارف" کے علاوہ ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" اور لاہور کے ایک دو رسالوں پر بھی اُن کا نام اعزازی مدیر یا معاون کی حیثیت سے لکھا ہوا دیکھا گیا۔ ہر ادبی حلقہ، علمی ادارہ اور رسالہ رئیس احمد جعفری مرحوم سے ربط و انتساب کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ دو ڈھائی سال ہوئے انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے نام

---

[1] حکیم حبیب احمد ندوی صاحب بھی مرحوم کے خاص دوستوں میں ہیں ندوہ کے ہوسٹل میں سات آٹھ سال ایک ہی کمرے میں رہے۔ اُس کے بعد برسوں بے تکلفانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم صاحب موصوف نے بمبئی کے دورانِ قیام میں قومی تحریکوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ افسوس ہے کہ فالج کا حملہ ہونے کے بعد ٹھیک طور پر چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔

پر ایک اکیڈمی قائم کی تھی، جس کی غالباً پہلی اور آخری کتاب "اوراق گم شدہ" تھی۔
سیرت، تذکرہ، تاریخ، اخلاق، ناول، افسانہ، ترجمہ، کتابوں کی تلخیص و تالیف۔
ان متنوع موضوعات پر اُن کی کتابوں کی مجموعی تعداد دو سو سے بھی متجاوز ہے،
اور ان میں سے بعض کتابیں تو ہزار ہزار اور بارہ بارہ سو صفحات سے بھی زیادہ ضخیم ہیں۔
سچ مچ لکھنے کی مشین، تین چار مہینہ میں پانسو چھ سو صفحوں کی کتاب کی تصنیف و تالیف
یا ترجمہ تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ زود نویسی اور مشاقی کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں!
اپنے زورِ قلم سے لاکھوں روپیہ انہوں نے پیدا کیا اور اُن سے زیادہ کمائی ناشرین نے کی۔
رئیس احمد جعفری مرحوم اہلِ قلم ہی نہیں اہلِ علم بھی تھے۔ مطالعہ وسیع، تجربہ و مشاہدہ
وسیع تر، فلسفہ و کلام کے نازک مسائل و مضامین بھی انہوں نے بڑے سلیقہ اور سلجھاؤ کے
ساتھ اردو میں منتقل کیے ہیں۔ قدیم مضامین کی تدوین و ترتیب میں اُن کی "قینچی" بڑی
مہارت اور مشاقی دکھائی تھی۔ ان کے بعض دوستوں اور جاننے والوں کی زبانی یہ بھی سننے
میں آیا کہ ناشرین کی فرمائشوں کے ہجوم میں عربی کی بعض کتابوں کے تراجم اُجرت پر دوسروں
سے بھی انہیں کرانے پڑے۔

پاکستان کے جس علمی و ثقافتی ادارے سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ حکومتِ پاکستان کی
مالی امداد کے سہارے چل رہا ہے۔ اس وابستگی کے جو تقاضے تھے، اس کے پیشِ نظر رئیس احمد
جعفری مرحوم کا قلم جرأت و عزیمت کا کوئی نقش نہ چھوڑ سکا، یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی
اور مولانا مودودی کے خلاف انہوں نے ایک کتاب لکھی۔ اللہ تعالیٰ ان کے تسامحات
کو معاف فرمائے۔ (آمین)

رئیس احمد جعفری گرمیوں میں ہر سال کوئٹہ جایا کرتے تھے۔ اس مرتبہ کوئٹہ میں
معمول سے کم قیام رہا۔ کراچی میں اُن سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔ ہمدرد دواخانہ کے
مالک حکیم محمد سعید صاحب نے ایران کے صحافتی وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تھا
اُس میں جعفری صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا، میں انہی کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا
کہ دو تین صاحبان تہران کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبارات ——— کیہان اور
اطلاعات ——— کے نمائندوں کو راقم الحروف کے پاس لے کر آئے۔ اچھے الفاظ میں
میرا تعارف کرایا، یہ بھی کہا کہ یہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ اُن کی فرمائش پر میں نے اپنی

غزل کے دو شعر سنائے۔

تا آں بُتِ گلفام بہ گلشن نہ رسید ∗ بلبل نہ سراید نسیمے نہ وزیدہ

گیسو بکشا، دام بنہ، ناز بفرما ∗ اے دوست کرم کن بہ غزالاں تمید

اس عصرانہ کے چند دن بعد میجر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی کی شادی میں جعفری صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ جسٹس خمیسانی صاحب جج ہائیکورٹ جو مرحوم کے بڑے قدر شناس ہیں، اُن کے ہمراہ تھے، اُس صحبت میں مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ تم سے سب سے پہلی ملاقات خلافت ہاؤس (بمبئی) میں ہوئی تھی۔ صبح کے ناشتہ میں مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا عرفان مرحوم کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔

یہ ۱۹۳۳ء کا قصہ ہے راقم الحروف نے سفرِ عراق سے واپسی کے بعد ایک مضمون روزنامہ "خلافت" کے لیے لکھا تھا۔ اس میں برطانیہ کی سیاست پر بڑی سخت گرفت کی تھی۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے مجھے ناشتہ پر بلایا تھا۔

میں سفر میں تھا اور لاہور سے صبح کی ٹرین سے کوئٹہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا کہ روزنامہ "مشرق" میں جناب رئیس احمد جعفری کے انتقال کی خبر پڑھی، ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑا اور ذرا سی دیر میں چلتا پھرتا جسم لاش بن کر رہ گیا ——— علامہ شبلی نعمانی کے لگ بھگ عمر پائی۔ تیس پینتیس سال کی مدت میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، قلم میں روانی، اسلوبِ نگارش دلکش! رئیس احمد جعفری کی موت ایک عظیم ادیب کی موت ہے، اردو تاریخ و ادب میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور آنے والی نسلیں اُن کی اور زیادہ قدر کریں گی۔

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۸ء)

زاہد شوکت علی

غالباً ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے ایک مشاعرے کے سلسلہ میں میرا بمبئی جانا ہو گیا، روزنامہ "خلافت" کا ٹیلی پرنٹر نیا نیا لگا تھا، اس کی افتتاحی تقریب میں مجھے بھی بُلایا گیا۔ پچاس ساٹھ مہمان ہوں گے، کھانا کھانے کے بعد شاعری ہوئی، اسی تقریب میں زاہد شوکت علی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد جب بھی بمبئی جانا ہوتا ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔

بمبئی میں مسلمانانِ پنجاب کی انجمن کے زیرِ اہتمام ہر سال نہایت شاندار پیمانے پر "یومِ اقبال" اس ترتیب کے ساتھ منایا جاتا، پہلے دن قوالی، دوسرے دن تقریریں اور تیسرے دن مشاعرہ۔ ایک سال مجلس مذاکرہ کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے فرمائی تھی، راقم الحروف کو ہر سال "یومِ اقبال" میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہندو مسلم فسادات نے اتنی شدت اور طوالت اختیار کی کہ حکومت کو شہر میں کرفیو لگانا پڑا، اسی کرفیو کے دوران شب میں ایک سیٹھ کے یہاں دعوت تھی۔ ایک کار میں مولانا فضل اللہ شاہ جہاں پوری، زاہد علی ——، راقم الحروف اور ایک صاحب کوئی اور، روانہ ہوئے اس دعوت میں جانے کے لیے کرفیو پاس پہلے سے حاصل کر لیا گیا تھا، کرفیو کے اوقات میں اور وہ بھی رات کے وقت موٹر کار کو دیکھ کر پولیس کانسٹیبل نے سیٹی بجائی اور کار رکو ہاتھ کے اشارے سے روکا، اس پر زاہد شوکت علی مرحوم نے کانسٹیبل کو اور مرار جی ڈیسائی[1] کا نام لے کر دہ بے نقط ملاحیاں سنائیں کہ میں تو ڈرنے لگا کہیں ہم سب گرفتار نہ ہو جائیں —— مولانا شوکت علی جیسا ہمہمہ اور طنطنہ!

الولد سرٌ لابیہٖ

---

[1] یہ مہاشے اُن دنوں صوبہ بمبئی کے ہوم منسٹر تھے

۱۹۵۴ء میں جب اس گنہگار کو زیارت حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی تو زاہد صاحب سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ بوہروں کی شاندار اور آرام دہ اقامت گاہ میں ٹھہرے تھے۔ حسن اتفاق مدینہ منورہ کی اصطفا منزل میں ہم دونوں کا کئی دن ساتھ رہا، پھر جدہ میں ہندوستان کے سفیر قدوائی صاحب کے یہاں دو تین بار کھانا کھایا اور چائے پی، مولانا کرم علی ملیح آبادی بھی ان دعوتوں میں شریک رہے۔ زاہد صاحب جب مکہ میں تھے تو اُن کا بار بار جدہ جانا ہوتا رہتا تھا، سلطان سعود مرحوم اُن دنوں جدہ ہی میں مقیم تھے، زاہد علی مرحوم کو سفر خرچ کے لیے سلطان کی طرف سے پانچ ہزار ریال دیئے گئے۔

زاہد علی مرحوم جب پہلی بار کراچی تشریف لائے تو اپنے ہم زلف شعیب قریشی مرحوم کے یہاں ٹھہرے، اُن کی آمد کی اطلاع پاکر میں ملنے کے لیے گیا بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے، بمبئی کے دوستوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، دو مل کر گئے اور چار آ گئے۔

آخری بار ۱۹۵۹ء میں اُن سے بمبئی میں ملاقات ہوئی، خلافت ہاؤس میں پاکستان سے آئے ہوئے شاعروں کے اعزاز میں خاصہ پُرتکلف عشائیہ دیا گیا، مولانا شوکت علی مرحوم کی طرح زاہد صاحب بھی کھانے کے شوقین اور پُرخوراک تھے، انہی دنوں اُن پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے کھانے میں پرہیز کی ہدایت کی تھی مگر دعوت میں اس کا عام چرچا تھا کہ زاہد صاحب نے آئس کریم کی کم سے کم چھ سات طشتریاں کھا کر دم لیا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم جب پہلی بار راونڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تو زاہد علی اُن کے ہمراہ تھے۔ اُن کی شہرت اور عزت انہیں نسبتوں سے تھی کہ وہ مولانا محمد علی کے بھتیجے اور داماد اور بابائے خلافت مولانا شوکت علی کے صاحبزادے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد بھی مرحوم کی شخصیت کے سبب خلافت ہاؤس مسلمانان بمبئی کی عقیدت کا مرکز بنا رہا۔

ہندو راج میں زاہد علی مرحوم نے خودداری اور رکھ رکھاؤ آمیزی کا ثبوت دیا۔ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے نہ انہوں نے ہولی کھیلی، نہ دیوالی پر چراغاں کیا اور نہ ذاکر حسین مرحوم کی طرح کسی گرو اور مہاتما کے چرنوں کو چھوا، وہ پٹیل جیسے جابر اور متعصب

ہندو حاکموں سے بھی آنکھیں ملا کر بات کر سکتے تھے۔

رنگ تو مولانا شوکت علی کی طرح گورا نہ تھا، مگر ناک نقشہ، چال ڈھال، وضع قطع اور بات چیت میں باپ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ نماز روزے کے پابند اور اللہ کے دین اور ملتِ اسلامیہ کی ترقی اور غلبہ کے آرزومند!

مولانا شوکت علی کے بعد زاہد علی اور پھر زاہد مرحوم کے صاحبزادے طارق، جو کراچی کی کسی فرم میں ملازم ہیں —— "شہرت اور وجاہت کا پایہ نیچا ہی ہوتا چلا گیا —" دنیا کی کوئی خوبی اور بڑائی کسی خاندان کی ہمیشہ کے لیے میراث نہیں بن سکتی، دنیا اونچ نیچ اور الٹ پھیر کی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے —— (تلك الايام نداولها بين الناس)۔ غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۹ء)

مولانا زکی کیفی

یہ بات یاد نہیں رہی کہ مولانا زکی کیفی سے پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی یا کراچی میں! مگر پہلی بار ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے قدیم شناسا اور دیرینہ رفیق ملتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں دیوبند میں بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا، عوام کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی بہت بڑی تعداد اس مشاعرے میں شریک تھی، قاری زاہر قاسمی بڑے اصرار کے ساتھ مجھے دہلی سے دیوبند لے گئے، شمس زبیری صاحب بھی اُن کے ہمراہ تھے، ایسے تنگ وقت پر یہ دونوں حضرات مجھے لینے کے لیے آئے کہ دلی اسٹیشن پر ہم پہنچے ہیں تو دیوبند جانے والی ٹرین چھوٹ چکی تھی اور ہم تینوں چلتی ہوئی گاڑی میں سوار ہوئے۔ زکی کیفی اس مشاعرے میں شاعر نہیں سامع کی حیثیت سے شریک ہوئے، وہ اس مشاعرے کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، میری نظموں میں "جمنا کے کنارے" اور "ماتما کی لاش" کا، میرے پڑھنے کے انداز کا، لباس، صورت شکل اور وضع قطع کا اور مسکرا مسکرا کر کہتے کہ میں تو آج تک اسی انداز و ادا کا مارا ہوا ہوں۔

مرحوم سے پہلی ملاقات کے بعد ملنے ملانے کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ یہ ملاقاتیں رسمی نہیں حقیقی دوستی، مخلصانہ تعلقات اور برادرانہ روابط میں تبدیل ہوگئیں! اکل و شرب سے لے کر لباس، مکان، آرائش، ذوقِ جمال، دین و اخلاق اور شعر و سخن کے مسائل و معاملات میں بڑی حد تک ہم رنگی اور وحدتِ فکر و خیال! مولانا مودودی کی "خلافت و ملوکیت" پر البتہ زکی کیفی مرحوم سے بحث ہو جاتی، مگر بحث و گفتگو کے بعد پھر وہی ہنسی خوشی کی باتیں اور یارانے کی فضا!

مرحوم دیوبند کے مسلک کے فدائی اور شیدائی! راقم الحروف کی یہی رائے ہے کہ دیوبند کے ذریعہ خیر ہی کی اشاعت ہوئی ہے اور دیوبند نے دین کی بڑی خدمت

انجام دی ہے! مگر بعض مسائل میں اختلافی بحث بھی چھڑ جاتی لیکن بحث و مباحثہ میں تیزیِ مزاج کی شدت کو زکی کیفی گوارا کر لیتے، نزاع و جدال کی نوبت نہ آنے پاتی۔ ہر مسئلہ میں صدفی صد اتفاق تو باپ بیٹے، بھائی، استاد شاگرد اور پیر و مرید میں بھی نہیں ہوتا!

اس بات کو تقریباً سولہ سترہ برس ہو رہے ہیں ایک صاحب جو آج کل پاکستان میں بہت بڑے منصب پر فائز ہیں اُن سے میں نے زکی صاحب کو یہ کہہ کر ملایا کہ "یہ اللہ کے فضل سے جوانِ صالح ہیں" —— پھر اُن صاحب کے حالات، مسلک اور ذوق و مشرب میں تبدیلی آگئی، مرحوم مجھ سے طنزاً کہا کرتے تھے کہ "آپ کے جوانِ صالح کا کیا ہوا۔"

جب سے ان سے یارانہ ہوا جب بھی لاہور جانا ہوتا، تو مولانا زکی کیفی مرحوم کے یہاں میرا قیام رہتا، اُن کے یہاں گھر کی طرح آرام ملتا، وہ میری ہر طرح کی آسائش کا خیال رکھتے۔ اصرار کر کے مجھ سے پوچھتے کہ کھانے میں کیا چیز پکائی جائے۔ ادارۂ اسلامیات میں لوگ مجھ سے ملنے کے لیے آتے تو ان کی چائے سے تواضع کرتے، زکی مرحوم کے ساتھ شہر میں جانا آنا رہتا، تو میرے ہاتھ میں نوٹ نکلے ہوئے رہ جاتے، سواری کا کرایہ وہ خود دیتے! وہ کشادہ دست اور کشادہ دل تھے اور قناعت پسند بھی! مالدار بننے اور روپیہ پیسہ جوڑنے کی انہیں ہوس نہ تھی، بس یہ چاہتے تھے کہ اوسط درجہ کی شریفانہ زندگی بسر ہو جائے اور اس کے اسباب اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے مہیا فرما دیئے تھے۔ اُن کی کوئی ضرورت رُکتی نہ تھی! دل کے دورے کے بعد پان کھانا ترک کر دیا تھا مگر جس زمانے میں پان کھاتے تھے تو پانوں کا خرچ مہینہ میں دو سو روپیہ سے کیا کم ہوگا؟ بڑھیا پانوں کا اہتمام، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پان اپنے ہاتھ سے لگاتے ایک پان میں زردے کی دو دو چٹکیاں! اس کے برخلاف پان کے معاملہ میں میرا یہ مزاج کہ تمباکو کا ایک ذرہ بھی پان میں پڑ جائے تو ہچکیاں آنے لگتی ہیں اور بعض اوقات ہلکی سی کھانسی بھی! خواجہ حسن نظامی مرحوم، جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث، مولانا مفتی محمد شفیع ؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ان تمام حضرات نے "تمباکو خوری" کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچے میں لکھا تھا کہ جتنا میرے جسم کا وزن ہے، اس سے زیادہ وزن اور مقدار میں اب تک تمباکو کھا چکا ہوں!

لاہور کے جلسوں اور مشاعروں کے سوا مظفر آباد، راولپنڈی، پشاور، سرگودھا، لائل پور، جھنگ، کیمبل پور اور سوات وغیرہ مقامات سے واپس آتے ہوئے لاہور ضرور ٹھہرتا، اور اس قیام میں زکی کیفی سے ملنے اور اُن کے ساتھ چند دن ہنسی خوشی رہنے کی تمنا اور مسرت بھی شریک ہوتی وہ بڑے اچھے میزبان تھے، مجھے اپنے یہاں ٹھہرا کر اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی، بارہا اُن کے یہاں میرا قیام سات آٹھ دن سے بھی زائد ہی رہا۔ مرحوم نے ملتان روڈ پر بڑے سلیقہ کا آرام دہ مکان تعمیر کرایا۔ اس عمارت کا ایک کمرہ تو میرے ہی نام سے موسوم تھا! صبح کے ناشتہ میں دودھ کی ساری بالائی میرے سامنے رکھ دیتے! میں اُن سے کہتا کہ بھائی! تمہاری عالی ظرفی کا لوہا مانتا ہوں ورنہ کھانے پینے کے معاملے میں بندہ اتنا ایثار نہیں کرسکتا۔

کتابوں کی تجارت اُن کا ذریعہ معاش تھا اس کاروبار میں خاصی مہارت حاصل ہوگئی تھی مگر اکل حلال اور صدقِ مقال اُن کا شیوہ تھا۔ اسی آمدنی میں شاندار مکان بنایا، اولاد کو تعلیم دلوائی اُن کے بڑے فرزند محمود اشرف سلمہ حافظ قرآن ہیں، عالم دین ہیں اور ڈیڑھ برس سے مدینہ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر باپ کے مرنے کے بعد یہ سلسلہ شاید جاری نہ رہ سکے۔

دیوبند میں وہ شاعری کرتے ہوں گے مگر اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنا کوئی شعر نہیں سنایا، کئی برس تک شعر و سخن کے معاملے میں وہ شاعر نہیں سامع رہے، مگر پھر انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اس صنف میں اتنی ترقی کی کہ معروف و مشاق شاعروں کی صف میں اُن کا شمار ہونے لگا، بعض بڑے مشاعروں میں بھی انہوں نے خوب جم کر کلام سنایا اور ادبی نشستوں میں اُن کو شاعر کی حیثیت سے بلایا جاتا، اور اُن کے کلام کی خاصی پذیرائی ہوتی! نئی غزلیں مجھے سُنا کر میری رائے پوچھتے ہیں۔ دوستانہ تعلقات کی رو رعایت کے بغیر رائے دیتا، میرے کہنے پر بعض مصرعے بدل بھی دیتے اور بعض شعر بھی غزل سے نکال دیتے! کسی کسی شعر پر بحث بھی ہو جاتی! زندہ رہتے تو اُن کا کلام ضرور چھپتا اور اُس پر میں مقدمہ لکھتا! روزنامہ "وفاق" میں کئی برس سے قطعات لکھ رہے تھے جن کو پسند کیا جاتا! سن و سال کے اعتبار سے مجھے پہلے مرنا تھا بلکہ اب تک مر جانا چاہیئے تھا۔ زکی تو مجھ سے بہت چھوٹے تھے، اُن کی عمر پچاس کے لگ بھگ

ہو گی! ایک دَور اُن پر مالی پریشانی کا بھی آیا، کتابوں کی بکری ایک دم ٹھپ سی ہو گئی، مگر یہ زمانہ بھی انہوں نے ہنسی خوشی گزار دیا۔

شعر و سخن کی محفلوں میں مخلوط اجتماعات ہوتے ہیں، مولانا زکی کیفی ان محفلوں میں دیوبند کے مولوی اور مولانا کی حیثیت سے نہیں خالص شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور اُن کی ثقاہت اور دیوبندیت اِن محفلوں کو تباہ لیتی! اُن کی غزلوں میں عشق و محبت کے چٹخارے نرے خیالی تو نہ ہوں گے! ہو سکتا ہے اس تجزیہ میں خود میری اپنی کمزوری بھی شامل ہو۔ المرءُ یقیسُ علیٰ نفسہ!

نخشب جارچوی سے زکی کیفی میرے ہی واسطہ سے متعارف ہوئے، پھر اُن سے خاصہ یارانہ ہو گیا۔ ایک بار مشہور فلمی پروڈیوسر آغا گل نے اپنے اسٹوڈیو میں نخشب، زکی کیفی اور خاکسار کو چائے پر بلایا، مغرب کے بعد کسی فلم کی شوٹنگ بھی تھی، اصرار کیا کہ یہ منظر بھی دیکھتے جائیے! ہم تینوں شوٹنگ دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں حمید نظامی مرحوم اور آغا شورش کاشمیری بھی وہاں آ گئے، شورش صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا:

"ماہر صاحب! آپ کا یہی صحیح مقام ہے" جمنا کا کنارا "جیسی رنگین نظمیں کہنے والا، جماعت میں کہاں جا پھنسا۔"

زکی نے مجھ سے چپکے سے کہا جو ہو گیا سو ہو گیا، آپ کسی اضطراب یا گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیجئے، بس اسی میں خیریت ہے۔ دوسرے دن دس گیارہ بجے شورش صاحب ادارہ اسلامیات میں تشریف لائے اور رات کے واقعہ کا ہنس ہنس کر ذکر چھیڑا اور فرمایا کہ میں اس واقعہ پر نظم کہوں گا، میں نے عرض کیا کہ میں نے نظم شروع بھی کر دی۔

لطف لینے کا جہاں جذبہ بھی تھا کوشش بھی تھی
ہائے وہ محفل جہاں شورش بھی تھا شورش بھی تھی

آغا صاحب کے جانے کے بعد زکی تو بولے اب وہ اس سلسلہ میں ایک حرف بھی نہیں لکھیں گے!

زکی کیفی دیوبند میں پیدا ہوئے اور اسی ماحول میں نشوونما پائی مگر وہ عالمِ دین نہ بن سکے، اُن کی فارسی استعداد خاصی تھی، وہ جو فارسی شعر ہے ؎

میراثِ پدر خواہی، علمِ پدر آموز

تو اپنے والد محترم (مفتی محمد شفیع مدظلہ) کی شاعرانہ میراث اُن کے حصے میں آئی! دینی علوم دوسرے بھائیوں (مولانا محمد رفیع اور مولانا محمد تقی) کو ملے! مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، تین چار برس سے اُن کا دینی رنگ اور تیز ہوگیا تھا، نماز پنجگانہ کے علاوہ بھی نوافل کا ورد رہتا، قرآن کریم کی تلاوت بھی اُن کا معمول تھا۔ والدین کے انتہائی فرمانبردار اور سعادت مند بیٹے، ماں باپ کی بیماری کی خبر ملتی تو تمام کام کاج چھوڑ کر کراچی پہنچتے اور بیمار والدین کی خدمت اور تیمارداری میں زیادہ وقت گزرتا، گھنٹوں ان کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے۔

اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے بولے کہ دیوبند میں بعض ایسے یار دوستوں کی صحبت میسر آگئی تھی کہ ہم مہینہ دو مہینہ میں سینما دیکھنے کے لیے دلی جایا کرتے تھے اور تاش بھی کھیلتے تھے، والد صاحب کو میری یہ روش پسند نہ تھی، وہ مجھے بٹھا کر دو دو گھنٹے نصیحت فرماتے اور روتے جاتے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ زکی! اس گھر میں تو رہے گا یا پھر میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ والد قبلہ کی نصیحت اور تربیت کا یہ اثر تھا کہ میں اس چکر سے نکل گیا اور اللہ تعالیٰ نے بگڑنے سے بچا لیا!

راقم الحروف سے اُن کی آخری ملاقات پچھلے سال کے ماہ نومبر میں ہوئی۔ منڈی بہاؤ الدین کے مشاعرے سے واپس ہوتے ہوئے، انہیں کے یہاں ٹھہرا۔ اُن کے گھر کے لوگ کراچی گئے ہوئے تھے جس دن میں کراچی کو روانہ ہو رہا تھا، میں نے کہا آج دوپہر کو میرے ہاتھ کا پکا ہوا سادہ قورمہ بھی چکھ لیجیے، چنانچہ وہ سیر بھر گوشت اور مسالے خود بازار سے لے کر آئے، دہی گھی اور سب مسالے میں نے انہیں دکھا کر ملائے، پیاز اور لہسن کی کیفی ہی نے کاٹا، ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ میرے پکائے ہوئے گوشت کی بہت تعریف کی! کہا کہ کھانے کا مزہ آگیا۔

تین ساڑھے تین برس ہوئے جب اُن پر دل کا دورہ پڑا تھا، پھر وہ اچھے ہوگئے، مگر دل میں چبھن رہنے لگی، پان حبس کے بغیر آدھ گھنٹہ گزارنا بھی اُن کے لیے دشوار تھا، اُسے وہ چھوڑ چکے تھے، دوا اور پرہیز دونوں پر کاربند تھے، وہ زبان سے تو اپنے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے مگر اپنے دل کی حالت سے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ مشین شاید اب بہت دنوں چلنے والی نہیں ہے، اسی اندیشہ کے پیش نظر انہوں نے طویل وصیت نامہ

لکھا کہ اُن کے بعد ورثا اُس کے مطابق عمل کریں!

حکومت کی طرف سے حج کے لیے جو وفد گیا تھا، اُس کے ایک رُکن زکی کیفی بھی تھے، انہوں نے اس وفد میں شریک ہونے کے لیے سعی نہیں کی، روزنامہ" وفاق" کے مدیرِ اعلیٰ جناب مصطفےٰ صادق کی کوشش سے یہ سب کچھ انتظام ہوا، زکی کیفی مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع کو فون پر اس واقعہ کی اطلاع دی، مفتی صاحب نے فرمایا کہ تمہاری سعی کے بغیر زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہو رہی ہے تو تمہیں وفد میں جانا چاہیے۔

مصطفےٰ صادق صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ زکی کیفی مرحوم نے بڑی ہمت، مستعدی اور شوق و عقیدت کے ساتھ طواف و سعی کے تمام مناسک ادا کیے۔ اور زیادہ وقت اللہ کے ذکر ہی میں صرف کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کراچی تشریف لائے اور حجاز جاتے اور آتے ہوئے مجھ سے نہیں ملے، اگر ملتے تو میں سرکاری وفد کے سلسلہ میں ایک حرف بھی نہ کہتا، جماعت اسلامی کے مولانا نصر اللہ خاں عزیز بھی اسی وفد میں گئے تھے! لاہور جا کر وہ کئی دن ہشاش بشاش اور اچھے بھلے رہے پھر ایکا ایکی طبیعت خراب ہو گئی، دل ڈوب دینے کا وہ عالم کہ ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، انہیں آکسیجن بھی دی گئی مگر دنیا سے اُن کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا، اور موت جس سے کسی جاندار کو مفر نہیں اس کی چھٹی آ چکی تھی، بسترِ علالت پر ہلکی سی انگڑائی لی اور جاں بحق ہو گئے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مرحوم کی والدہ محترمہ کو بڑھاپے میں اپنے سب سے پیارے اور چہیتے بیٹے کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔ بھائیوں کے غم کا بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ ان سب کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

مرنے سے دو ڈھائی مہینے پہلے انہوں نے نعت کہی تھی، جس کا مطلع تھا:

اس لیے آرزو ہے جینے کی ۔۔۔ دیکھ لوں پھر زمیں مدینے کی

اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ آرزو پوری کر دی، مدینہ اور تاجدارِ مدینہ کے روضۂ مقدس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں، انہوں نے خود تمنا بھی تو کی تھی:

جس نے مجھ سے نظارے جلوۂ منوش روئے دوست ۔۔۔ میں کوئی محفل نہ دیکھوں اب تری محفل کے بعد

اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت و رحمت سے مرحوم کو نوازے (آمین)

(ماہنامہ "فاران"، مارچ ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

میں جن دنوں حیدرآباد دکن پہنچا ہوں، اُن دنوں ڈاکٹر زور آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ یورپ سے "ڈاکٹریٹ" لے کر واپس ہوئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ حیدرآباد جانے سے پہلے میں نے اُن کا بس "نام" سنا تھا، وہاں جاکر اُن کے "کام" سے بھی آشنائی ہوئی، رسالوں میں ان کے مضامین پڑھے، ادبی محفلوں میں اُن کے چرچے سُنے، جامعہ عثمانیہ کے نامور طلبہ میں شیخ محمد چاند مرحوم کے بعد ڈاکٹر زور ہی کا نام لیا جاتا تھا ——— اس کے بعد دعوتوں، جلسوں، پارٹیوں، مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ڈاکٹر زور سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اسے خوش ذوقی سمجھیے یا کمزوری سے تعبیر کیجیے، شاعر خوش شکل انسانوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے، ڈاکٹر زور کی شخصیت کے اس رُخ نے مجھے پہلی ملاقات ہی میں متاثر کیا، بات کرنے میں اُن کا سنجیدہ و شگفتہ تبسم بڑی کشش رکھتا تھا!

غالباً سنہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے، سنگاریڈی میں مشاعرہ تھا، ڈاکٹر زور اُس کے صدر تھے، میں نے اپنی غزل جو مشاعرہ سے دو تین دن پہلے کہی تھی خاص تاثر کے ساتھ سنائی، اس غزل کا ایک شعر یہ تھا: ؎

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے
شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑا دوں

ڈاکٹر صاحب مرحوم اچھے شعر پر داد دیتے مگر "بیساختہ اور والہانہ" نہیں، متانت و سنجیدگی کے ساتھ! "روحِ تنقید" کے مصنف کی دادو تحسین کا انداز سنجیدہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

حیدرآباد دکن میں جب ملکی اور غیر ملکی کی تحریک نے زور پکڑا تو شروع شروع میں اُس سے نواب بہادر یار جنگ مرحوم تک متاثر ہو گئے، مگر اُن کا یہ ذہول بہت جلد دور ہو گیا اور پھر وہ اسلامی اخوت کے نقیب بن گئے! ملکی اور غیر ملکی کی یہ تحریک وطنی عصبیت کو

ابھارتی رہی، اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک جا پہنچی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور خود انجمن ترقی اردو "غیر ملکی" ہونے کے سبب اس لپیٹ میں آ گئے! ڈاکٹر زور "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کے بانی اور رُوحِ رواں تھے، حیدرآبادی ادیبوں کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اپنے ملک کے ادارہ کی ترقی و توسیع پر پوری توجہ دینی چاہیئے! مگر مولوی عبدالحق کی شخصیت سچ مچ کوہِ گراں ثابت ہوئی، اور یہ اچھے وار اُن کا اور انجمن اردو کا کچھ بگاڑ نہ سکے!

جن دنوں حیدرآباد دکن میں یہ کش مکش برپا تھی۔ ڈاکٹر زور کی طرف سے میری طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا۔ مگر تقسیمِ ہند کے بعد ڈاکٹر زور مرحوم نے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی اور بقا کے لیے جو کوششیں کی ہیں اور جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس نے اس تکدر کو نہ صرف یہ کہ زائل کر دیا بلکہ اُن کی عزت اور محبت میرے دل میں ڈال دی، اور اُن کی ذات اور شخصیت سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔

"فاران" میں تبصرے کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی کتابیں آتیں تو کبھی کبھار ڈاکٹر زور مرحوم کا عنایت نامہ بھی آ جاتا یا پھر ڈاکٹر صاحب کے معتمد علیہ نائب اور دستِ راست خواجہ حمید الدین شاہد کے خطوں سے پیام و سلام کا سلسلہ جاری رہتا۔ ہندوستان کی "ساہتیہ اکیڈمی" نے جب اُردو شعراء کا تذکرہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو ڈاکٹر زور کو یہ کام سونپا گیا۔ انھوں نے شعراء کے اس تذکرے کے لیے میرا کلام اور حالاتِ زندگی بھیجنے کے لیے مجھے لکھا اور میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کر دی۔ یہ "تذکرہ" تو مجھے دیکھنے کو نہیں ملا مگر اس پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں، وہ میں نے پڑھی ہیں، بعض تنقیدیں جتنی معقول تھیں، اُس سے زیادہ سخت تھیں۔

ماہنامہ "شاعر" جو تقسیمِ ہند سے قبل ارضِ تاج سے طلوع ہوتا تھا۔ اب بمبئی سے نکلتا ہے جناب اعجاز صدیقی کو ہزار آفرین کہ وہ اپنی مسلسل بیماری اور طرح طرح کی پریشانیوں کے باوجود قصر الادب اور ماہنامہ "شاعر" کی روایتوں کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انہی کی دعوت بلکہ اصرار پر مجھے گزشتہ سال (۱۹۶۱ء) بمبئی جانا پڑا۔ شاعر کا سی سالہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، ادبی مذاکرہ بھی ہوا اور مشاعرہ بھی! مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر زور مرحوم نے فرمائی۔

بمبئی میں میرا قیام حکیم مرزا حیدر بیگ (مالک حیدری دواخانہ) کے یہاں تھا۔ ڈاکٹر زور اپنی محبت سے مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اُن کے

ہمراہ تھے۔ اُن سے مل کر ایسا محسوس ہوا جیسے حیدرآباد دکن کے تمدن وتہذیب اور مسلمانوں کی اقبال مندی کی تاریخ مجسّم ہو کر سامنے آگئی ہے، ہائے کتنی بہت سی چوٹیں اُبھر آئیں اور کتنے زخم ہرے ہو گئے!

حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب نے ڈاکٹر زور کو کھانے پر بلایا، اُسی دن جناب لطفی رضوانی اور اُن کے بعض احباب کے زیر اہتمام مہالکشمی کے قریب ایک بنگلہ میں مخصوص شعری نشست کا انتظام تھا، اور ساتھ ہی پُر تکلف عشائیہ بھی تھا! میرے لیے بڑی مشکل تھی دونوں دعوتوں میں شریک ہونا ضروری تھا۔ اس مشکل کو میں نے اس طرح حل کیا کہ یہاں نمکین کھانوں سے لطف اندوز ہوا اور حکیم صاحب کے یہاں میٹھا کھایا اور چائے پی! پھر ہم حکیم صاحب کے مکان سے مہالکشمی آگئے، ڈاکٹر زور مرحوم نے سامعین کی درخواست پر کرسیٔ صدارت کو شرف بخشا اور مشاعرہ کا آغاز ہو گیا۔ احباب نے میری ہی خاطر یہ سب کچھ اہتمام کیا تھا۔ اس لیے شعر خوانی کا زیادہ تر بار بھی مجھی کو اٹھانا پڑا، رات بھیگنے لگی، برآمدہ جہاں سامعین کی نشست تھی، ہرے بھرے پودوں اور سبزے کے بالکل مخالف محاذ میں تھا۔ ہوا رفتہ رفتہ اتنی خنک ہو گئی کہ ڈاکٹر زور کو تو ادنی دلائی اوڑھنی پڑی! موسم کی خنکی اور شعروں کی گرمی کا امتزاج بڑا ہی پُر لطف اور شوخ ہوتا ہے، ڈیڑھ دو بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوئی! ڈاکٹر زور مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

چند دن ہوئے میں اپنے مکان میں بیٹھا ہوا مضمون لکھ رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسور اٹھایا۔

جی ــــــــ میں آہستہ سے بولا۔

میں حمید الدین شاہد بول رہا ہوں ــــ آواز آئی

السلام علیکم! ــــــــ میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

آج کا اخبار "جنگ"، کیا آپ نے نہیں پڑھا۔ ڈاکٹر زور کا کشمیر میں انتقال ہو گیا ــــ خواجہ حمید الدین شاہد نے فرمایا۔ اور اس خبر کو سُن کر میں سکتہ میں رہ گیا۔ دل و دماغ کو سخت دھچکا لگا۔ ہندوستان میں اردو پر جو وقت آن پڑا ہے، اُس کی مظلومیت اور غریب الوطنی کی پرچھائیاں اُبھر کر سامنے آگئیں اور فضا میں دھند سی چھا گئی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نسباً رفاعی خانوادۂ تصوف سے تعلق رکھتے تھے، جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کے امتحان میں اس شان سے کامیابی حاصل کی کہ یونیورسٹی میں اول آئے، پھر انھوں نے یورپ جاکر لسانی تحقیقات اور صوتیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، جامعہ عثمانیہ میں انھوں نے تقریباً تیس سال تک شعبۂ اردو کے صدر ونگران کی حیثیت سے کام کیا اور طلبہ میں مقبول دہر دلعزیز رہے، وہ دو چار نہیں درجنوں کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان غزل گو (قلی قطب شاہ) کا تفصیلی تعارف انہی نے کرایا! ادارۂ ادبیات اردو نے ڈاکٹر زور کی سرپرستی اور نگرانی میں اردو زبان وادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اس کے سبب ڈاکٹر زور کا نام اردو کے محسنوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔

کوئی شک نہیں تقسیم ہند سے قبل بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو کے لیے جو کچھ کیا وہ ان کا لازوال کارنامہ ہے مگر پاکستان بننے کے بعد ان کی پیرانہ سالی کے سبب انجمن ترقی اردو پاکستان اور اردو کالج کو جس خارزار سے گزرنا پڑا۔ اس کے تذکرے سے بڑا دکھ ہوتا ہے! اس کے مقابلہ میں ڈاکٹر زور نے پندرہ سال کی اس مدت میں اردو زبان وادب کی بقا اور ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے، انھوں نے اردو کے ہر خدمت گزار اور محب کو سینہ سے لگایا اور سب کو جوڑے اور ملائے رکھا۔ کوئی خلفشار، اختلاف اور نفسا نفسی نہیں! ایوان اردو کی شاندار عمارت۔ ادبیات اردو کے کتب خانے، ماہنامہ "سب رس" کی فائلوں اور ادارہ کی شائع کی ہوئی کتابوں کو اردو کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ایک نظر دیکھا تو وہ مرعوب ہوکر رہ گیا! شمالی ہند میں ڈاکٹر زور نے اردو کی ساکھ کو گرنے نہیں دیا بلکہ اسے بہت اونچا کردیا!

سال سوا سال ہوا کہ ڈاکٹر زور مقبوضہ حکومت کشمیر کے محکمہ تعلیمات میں شعبۂ اردو کے صدر اور مشیر مقرر ہوئے تھے اور اس جنت ارضی کی ایک فصل بہار ہی دیکھنے پائے تھے کہ اردو زبان کا یہ مجاہد شاہ بلوط، دیودار اور چناروں کے سایہ میں ایسی نیند سویا کہ اب قیامت ہی کے دن آنکھ کھلے گی! اللہ تعالیٰ اس کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور آخرت میں شفاعت ومغفرت نصیب ہو! (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۲ء)

زیڈ۔ اے بخاری

بمبئی میں "انجمن پنجابیان" کی جانب سے ہر سال "یوم اقبال" بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ پہلے دن مذاکرہ ہوتا، دوسرے دن قوالی اور تیسرے دن آل انڈیا مشاعرہ! مسٹر ذوالفقار علی بخاری کو پہلے پہل اسی تقریب میں دیکھا، سرخ سپید رنگت، کشیدہ قامت، سلک کا پاجامہ اور سلک کا کرتہ جس کے حاشیوں پر سفید بیل ٹکی ہوئی، کرتے پر کشیدہ کی ہوئی صدری جس میں ریشمیں خوبصورت تکمے جھلملاتے تھے، سلیم شاہی کامدار جوتیاں جن میں سفید رنگ ٹکے تھے! اس حلیہ اور وضع قطع کے آدمی کو پوری محفل میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا ہی چاہیے تھا۔ بخاری صاحب بمبئی میں شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں تھے، یوم اقبال کے کسی مشاعرے میں انہوں نے شعر خوانی نہیں کی، ہاں! مشاعرے کے اسٹیج کی آرائش میں اُن کا عمل دخل رہتا۔

اُن دنوں وہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر تھے، ایک دن دوپہر کے کھانے پر شاعروں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی، اس کے بالائی حصہ میں ڈائرکٹر کی خاصی خوبصورت اور آرام دہ رہائش گاہ تھی، کھانے کے بعد شعر و شاعری ہوئی لیکن بخاری مرحوم نے اپنا کلام نہیں سنایا اور نہ شاعروں نے اُن سے کلام سنانے کی فرمائش کی! وہاں کی ملاقاتوں میں ایک خوش رو اور دیدہ زیب نوجوان بخاری صاحب کے جلو میں اکثر دیکھا گیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حبیب تنویر نام ہے، انگریزی تعلیم ایم۔ اے تک ہے ریڈیو کے کسی شعبہ سے متعلق ہیں۔

شروع شروع میں پوچھنے کی نوبت آئی کہ زیڈ اے بخاری کن لفظوں کا مخفف ہے، معلوم ہوا اصل نام ذوالفقار علی بخاری ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم ڈی تاثیر لکھے جاتے تھے اور اے۔ ڈی اظہر کا نام احمد دین تھا۔ صوبہ مدراس میں مسلمانوں کے اکثر و بیشتر ناموں کے ساتھ انگریزی حرفوں کے دم چھلے آج تک لگے ہوئے ہیں۔

ڈی۔ این فاروق، ایس کے احمد۔ جی۔ ایم اسمٰعیل، اور خود یو۔ پی میں بھی علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر رزاق بخش قادری۔ آر۔ بی قادری کہلاتے تھے۔ ابوطالب نقوی، اے بی نقوی، دہاج الدین عباسی۔ ڈبلیو عباسی، محمد بشیر احمد ایم۔ بی احمد۔ قائداعظم اپنے دستخطوں میں (M. A. Jinnah) اور گاندھی جی (M. K GANDHI) لکھتے تھے! ہاں بڑے لیڈروں میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور نواب محمد اسمٰعیل خاں نے اپنے ناموں میں انگریزی حرفوں کی تخفیف روا نہیں رکھی۔

ذکر تھا بخاری صاحب کا اور بات انگریزی حرفوں کے مخففات کی نکل آئی! تحریر و گفتگو میں کبھی کبھار ضرورتاً اصل موضوع سے ہٹ جانا بھی پڑ جاتا ہے مگر اس بے ربطی کا بھی اصل موضوع سے بہرحال ربط ہوتا ہے —— ہاں! بخاری صاحب نے ایک دن بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن میں حضرت جگر مراد آبادی اور راقم الحروف کو بلایا اور کہا آپ ٹیپ ریکارڈ پر اپنا کلام سنایئے اور پھر ٹیپ کو سنیئے، اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ شعر خوانی میں کہاں کہاں آپ چھوٹی غلطیاں کرتے ہیں! ٹیپ پر کلام سنانے اور پھر ٹیپ شدہ کلام کو فوراً سننے کا ہمارا پہلا موقع تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ "ساقی" کو میں نے اس طرح پڑھا کہ "سا" اور "قی" کے درمیان وقفہ پیدا ہوگیا اسی طرح "جائیں گے" کو ٹکڑے کر کے سُنایا (یعنی جا اور "ئیں گے" کے درمیان وقفہ) اُس دن کے بعد شعر خوانی میں بخاری صاحب کی اس فہمائش نے راقم الحروف کو خاصہ محتاط کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد بخاری صاحب سے راقم الحروف کی مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہر ملاقات کے بعد بے تکلفی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا، بے تکلفی کی پہل خود انہوں نے کی۔ بعض اوقات بھری محفل میں انگلیوں کے ٹھوکے دینے سے بھی نہ چوکتے! مشہور نغز گو شاعر نہال سیوہاروی کی یاد میں ایک مشاعرہ ہوا، یہ اب سے تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے، اُن کے صاحبزادے نے صدارت کے لیے راقم الحروف کو منتخب کیا، بخاری صاحب اُس مشاعرے میں تشریف لائے میں اُن کی خوش مزاجی کے تیور دُور ہی سے دیکھ کر اُن سے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا اور طرح دے رہا تھا، ایک بار اُن سے نگاہیں لڑ گئیں، چھوٹتے ہی بولے :

صَدَر صاحبؒ سلام

ان کے اس انداز کا لطف میرے سوا اور کون لے سکتا تھا۔ اس میں طنز، مزاح، بے تکلفی، ہلکی سی چوٹ ...... سبھی کچھ پنہاں تھا۔

ان کے عہد نظامت میں آٹھ دس برس ہر دو ہفتہ کے بعد کراچی ریڈیو اسٹیشن سے مشاعرہ نشر ہوتا تھا۔ مگر کسی ایک مشاعرے میں بھی مجھے نہیں بلایا گیا۔ میں نے بے تکلفی کے روابط کے باوجود بخاری صاحب سے کسی دعوت اور محفل میں مزاحاً بھی کوئی اشارہ تک نہیں کیا اور "فاران" میں ریڈیو کے پروگراموں پر کوئی تنقید نہیں کی کہ مبادا میری تنقید سے لوگ یہ اثر لیں کہ مشاعروں میں نہ بلائے جانے کا اس طرح انتقام لے رہا ہوں! عجیب بات ہے، بخاری صاحب کے اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جانے کے بعد تقریباً ڈھائی تین برس تک ریڈیو سے مجھے پروگرام ملتے رہے! فارسی کی مشہور ضرب المثل "نزدیکاں رابیش بود حیرانی" کا اس طرح ذاتی تجربہ ہوا۔

ایک صاحب تھے آغا سلیم بیگ، دلی کے رہنے والے، کھرے مغل، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے خاندان سے بھی اُن کی رشتہ داری تھی، اُن کی عمر کا زیادہ حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا۔ ہائی کورٹ میں برسوں آفس سپرنٹنڈنٹ رہے، ہینڈ ایکسپرٹ کی ڈگری انہوں نے یورپ سے حاصل کی تھی۔ اس فن (تحریر شناسی) کی بدولت بہت کچھ پیدا کیا، جمشید روڈ کے قریب اُن کا بنگلہ تھا وہاں ہر اتوار کی دوپہر کو احباب جمع ہوتے، یہ اب سے بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے، بخاری صاحب بھی اس محفل میں پابندی کے ساتھ آتے اور اپنی باتوں سے بزم کو باغ و بہار بنا دیتے۔ اس اجتماع میں شعر خوانی ہوتی، زبان و محاورات پر مذاکرہ زندگیوں کے گزشتہ واقعات بھی دہرائے جاتے۔ کسی کسی نشست میں دوپہر کے کھانے کا پروگرام بھی رہتا، بعض شرکاء اپنے گھروں سے کھانے پکوا کر لاتے، اس طرح یہ دستر خوان الوانِ نعمت کا مرقع بن جاتا۔ بخاری صاحب بھی کئی بار اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر اپنے ساتھ لائے جو خوش رنگ بھی تھا اور خوش ذائقہ بھی!

لہ صدر کی "د" پر بالقصد زبر پڑھا۔

پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں غالباً سید وقار عظیم صاحب کے یہاں ایک ادبی نشست میں بخاری صاحب کو پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا اور پہلا نقش ہی کارگر رہا۔ حیرت ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنے اس کمال کو چھپائے رہے! ذوالفقار علی بخاری اردو زبان کے باکمال غزل گو شاعر تھے۔ زبان پر بھرپور قدرت اور اظہار خیال کا پوری طرح سلیقہ! عرب اور یورپین شعراء کی طرح اُن کا بھی کوئی تخلص نہ تھا۔ بخاری صاحب کی غزل کا یہ مطلع، اُن کے آغازِ شاعری کا نقشِ حسین ہے۔

ناوک فگن کا حیلۂ تاخیر دیکھنا — یہ تیر دیکھنا کبھی وہ تیر دیکھنا

تین چار اشعار جو اس وقت یاد آ رہے ہیں:

ہیں طائرانِ چمن قید آشیانے میں — مگر یہ بات کہے کون، اس زمانے میں
کدھر اڑوں کہ فضا میں بھی جال پھیلے ہیں — میں پر سمیٹ کے بیٹھا ہوں آشیانے میں

اور کچھ دن کے لیے صبر کریں اہلِ کلیم — کبھی درویشوں کی باری کبھی سلطانوں کی
عشق کا بت کدہ ویران نظر آتا ہے — ایک کافر نہیں بستی میں مسلمانوں کی

اُن کی ایک غزل طویل بحر میں: ـــ ......ساقی رات گزرنے والی ہے خاصی مشہور ہوئی جس کی پیروڈی ظریف جبلپوری مرحوم نے کی تھی۔ مگر یہ بس مشاعرے کی غزل تھی جس پر خوب داد ملتی، ایک بار میں نے ایک طرحی غزل بخاری صاحب کی زبان سے سُنی جو اُن کی دوسری غزلوں سے بہت پست تھی، وہ غزل پھر انہوں نے نہیں سنائی، ممکن ہے بیاض سے خارج کر دی ہو! اُن کی غزلیں اکثر و بیشتر خوب سے خوب تر ہوتیں! مشاعروں میں انہیں داد بھی خوب ملتی اور کسی کسی مشاعرے میں تو ایسا ہوا کہ اُن کی شعر خوانی کے بعد پھر کسی شاعر کا رنگ ہی نہیں جما۔

بخاری صاحب نے ریڈیو کے محکمہ میں چھوٹی سی ملازمت سے ترقی کی اور اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے برسوں اس منصب جلیلہ پر فائز و متمکن رہے! ریڈیو میں سارا کھیل آواز کا ہے اور بخاری "فن آواز" میں اپنا آپ جواب تھے۔ آواز، لہجہ اور طرز ادا پر وہ قدرت کہ جسے "کرامت" کہیں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا! ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کی آواز میں مور کی آواز کی طرح جھنکار تھی! مگر بلبل و قمری کی مانند نرمی اور نغمگی نہ تھی۔ ان کے لہجے میں غضب کا جلال اور طمطراق پایا

جاتا تھا۔

ذوالفقار علی بخاری جیسا ریڈیو ڈائرکٹر کسی ملک اور حکومت کو کہاں میسر آسکتا ہے، آواز، شعر، زبان، موسیقی، ڈرامہ ...... ان فنون میں وہ کمال درجہ کا درک و بصیرت رکھتے تھے، دوسری خوبی یہ کہ محکمہ کے نظم و نسق پر اُنہیں پورا کنٹرول تھا، اور اپنے عہدے کی کرسی پر بیٹھ کر وہ صرف ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے برتاؤ کرتے اور ذاتی تعلقات کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتے، اُن کے عہد نظامت میں کسی ماتحت کو اُن کے قلم سے نقصان نہیں پہنچا، محکمہ ریڈیو کو انہوں نے مشین کے کل پرزوں کی طرح کس رکھا تھا! عالی ظرفی کا یہ عالم کہ جب تک ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل رہے اُن کی کوئی غزل ریڈیو سے نشر نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے ریڈیو کے کسی مشاعرے میں اپنا کلام سُنایا! اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد البتہ ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لینے لگے —— زبان و روزمرہ اور شعر و ادب میں دلی اور لکھنو کے قائل نہیں فدائی تھے۔ فنکاروں اور شاعروں کے صحیح قدر شناس چاہے وہ فنکار اور شاعر یو۔پی کا رہنے والا ہو یا پاک و ہند کے کسی دوسرے خطہ کا باشندہ ہو!

مجاز لکھنوی سے یہ لطیفہ منسوب ہے کہ وہ پطرس بخاری کو جو زیڈ اے بخاری کے بڑے بھائی تھے۔ "صحیح بخاری" اور بخاری صاحب کو "غلط بخاری" کہا کرتے تھے! بخاری صاحب یہ لطیفہ خوب لطف لے لے کر سناتے تھے کہ ایک بار کراچی ریڈیو اسٹیشن سے پروگراموں کے بعد ریڈیو کی گاڑی میں بندو خاں سارنگی نواز اپنی سارنگی لیے بیٹھا تھا اور اُسی میں کراچی کے مشہور واعظ کو بٹھایا گیا تو وہ حیران پا ہوگئے۔

طرح طرح کے مزیدار کھانے ہوں تو خاصے محتاط لوگ تھوڑے بہت غیر محتاط ہوجاتے ہیں مگر بخاری صاحب کی احتیاط کا دامن کشادہ نہ ہونے پایا وہ بہت ہی کم مقدار میں کھانا کھاتے، چاہے کھانے کتنے ہی لذیذ اور وافر کیوں نہ ہوں۔

ریڈیو سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کسی نہ کسی ادارے سے ضرور متعلق رہے اور روپیہ پیسہ کی کبھی تنگی نہیں رہی مگر اُن کے مشاغل رنگا رنگ تھے، اس لیے جو کچھ کماتے وہ خرچ ہوجاتا۔

نشست و برخاست، کھانے اور رہنے سہنے میں بڑے سلیقہ مند، ذوق جمال

شائستہ و شستہ! اُن کی عمر پچھتر کے لگ بھگ تھی، دو تین برس سے اُن پر خاصا بڑھاپا آگیا تھا، اٹھنے، بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں تکلف بلکہ خاصی دشواری پیش آتی۔ اس بات کو مہینہ سوا مہینہ ہو رہا ہے قیصر قیصری صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی میں بخاری صاحب نے آدھ گھنٹہ کے قریب تقریر کی مگر تقریر کے بعد جلسہ گاہ سے باہر آکر خون کی قے کر دی۔

موت کو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے، غسل خانے میں گر جانے سے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا مگر نقاہت جان لیوا ثابت ہوئی۔

محرم کی مجلسوں میں انیس کے مرثیے سیاہ شیروانی پہن کر پڑھتے، اُن کی مرثیہ خوانی کی بڑی دھوم تھی، بخاری صاحب کے مذہب کے بارے میں دو رائیں سننے میں آئیں۔ لیکن نمازِ جنازہ اور تکفین و تدفین نے اس اشتباہ کو دُور کر دیا۔ وہ سنی العقیدہ تھے۔ قبر پر سوگواروں کی بڑی تعداد موجود تھی جو اُن کی ہر دلعزیزی کی دلیل تھی، اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اپنی رحمت سے انہیں بخش دے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۷۵ء)

عبدالمجید سالک

اب سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال قبل مہر و سالک کا نام سُنا تھا کہ یہ دونوں اہلِ قلم مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے دستِ راست ہیں اور روزنامہ "زمیندار" کی ادارت انہی کے سپرد ہے! پھر چند سال کے بعد سُنا کہ کسی بات پر مولانا ظفر علیخاں سے ان دونوں صاحبوں کی اَن بَن ہوگئی، اور انہوں نے "زمیندار" کو خیرباد کہہ کر، خود اپنا ذاتی اخبار "انقلاب" نکالا اور بہت تھوڑی مدت میں اس نو طلوع جریدے نے مقبولیت حاصل کرلی!

اُس دَور میں ایک صحافی کی حیثیت سے جن چند اخبار نویسوں سے دُور کی شناسائی اور غائبانہ تعارف تھا، اُن میں زیادہ مشہور اور ممتاز سید جالب دہلوی، مولانا ظفر علیخاں غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، سید حبیب (مدیر روزنامہ سیاست) اور عارف ہسوی تھے!

تقسیمِ ہند سے قبل میرا قیام دلّی میں تھا۔ انہی دنوں پنجاب میٹرک کے نصاب کی کتاب نظر سے گزری جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے عیسائی عقیدے کو ایک واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اس عبارت کو پڑھ کر طبیعت مکدر ہوئی میں سوچنے لگا کہ پنجاب میں کس شخصیت کو اس سلسلہ میں لکھوں، غور و فکر کے بعد آخر نگاہِ انتخاب عبدالمجید سالک مرحوم پر جاکر ٹھہری کہ وہ اس کام کے لیے بہت موزوں ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں خط لکھا اور ان کا جواب ہاتھوں ہاتھ آگیا کہ آپ کی گرفت مناسب اور بجا ہے، میں محکمۂ تعلیمات کو اس خصوص میں توجہ دلاؤں گا! زندگی میں پہلی بار سالک صاحب سے میری خط و کتابت ہوئی تھی اور وہ بھی بس اتنی کہ میرے ایک لفافہ کے جواب میں انہوں نے کارڈ بھیج دیا، یہ سلسلہ پھر آگے نہ چل سکا۔

عبدالمجید سالک مرحوم سے پہلی بار ملاقات کراچی میں ہوئی، بڑی گرمجوشی اور تپاک

سے ملے، جیسے بہت دنوں کی شناسائی ہے! اس کے بعد برابر ملنا ہوتا رہا، دعوتوں اور جلسوں میں، مشاعروں اور پارٹیوں میں، سرِ راہ ریلوے پلیٹ فارم پر! کراچی میں ان کا سب سے زیادہ دوستانہ مجید لاہوری مرحوم سے تھا۔ اُن کے ساتھ اکثر و بیشتر موٹر رکشا میں آتے جاتے نظر آتے اور اشاروں ہی اشاروں میں علیک سلیک ہو جاتی، دو بار لائل پور کے مشاعرے سے واپسی میں لاہور تک اُن کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔

کراچی میں غالباً دو سال مرحوم کا قیام رہا۔ حکومت کے کسی خاص فنڈ سے اُن کو بھاری تنخواہ ملتی تھی، اس کے معاوضہ میں وہ نام بدل کر "ابورشید وجدانی" کے قلمی نام سے مراسلے اور مضامین لکھتے تھے، مسٹر غلام محمد متوفی گورنر جنرل پاکستان سے اُن کے خاصے مراسم تھے، غلام محمد صاحب ایک بار انجمن ترقی اُردو کے ایک اجلاس میں آئے تو سالک مرحوم اُن کے استقبال میں پیش پیش تھے۔ میں نے "فاران" میں اُن کی اس روش پر "نقاب پوش صحافی" کے عنوان سے خاصی گرفت کی، میری یہ تحریریں اُن کی نگاہ سے بھی گزریں مگر کسی ملاقات میں انہوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا، جب بھی ملے کشادہ پیشانی کے ساتھ ملے، ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کم از کم کھنچ کر تو ملتا۔

کراچی کے قیام کے دوران میں سالک مرحوم کی ماہانہ آمدنی سرکاری فنڈ، ریڈیو اور انگریزی کتابوں کے تراجم سے پندرہ سو روپیہ ماہوار سے کیا کم ہو گی، مگر میں نے انہیں موٹر ٹیکسی میں کبھی نہیں دیکھا، موٹر رکشا اُن کی پسندیدہ سواری تھی، وہ بڑے قاعدے قرینے کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، آمدنی سے مصارف ہر حال میں کم! اس لیے مالی پریشانی اُن کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی! اعتدال اور میانہ روی اُن کے کردار کی خصوصیت تھی!

عبدالمجید سالک مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن واقع ہوئے تھے، ہنس مکھ، بذلہ سنج، خوش مزاج، جہاں بیٹھتے، لطیفوں، چٹکلوں اور فقروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتے رہتے! باتوں باتوں میں علمی نکتے، شعر و سخن کی باریکیاں اور سیاست کے رموز بیان کرتے! اُردو اور فارسی ہی نہیں عربی کے قدیم شاعروں کے شعر سناتے اور زبان و ادب پر عالمانہ گفتگو فرماتے! انہوں نے پاک و ہند کی بڑی بڑی شخصیتوں کو دیکھا تھا، اُن کے ہم نشین رہے تھے، ہندوستان کی سیاسیات کے تمام مد و جزر اُن کی نگاہ سے

گزرے تھے اس لیے علمی افکار کے دامن میں وہ بہت سے قیمتی تجربات بھی رکھتے تھے!

اہلِ صحافت اور اخبار نویسوں کی تحریروں میں ادبیت کم ہی پائی جاتی ہے مگر سالکؔ کی تحریریں ادبیت سے لبریز ہوتی تھیں، طنز و مزاح میں اُن کا رنگ منفرد تھا، جہاں دوسرا طنز نگار نشتر چبھوتا، وہاں وہ چٹکیاں لیتے، سلجھا ہوا اندازِ بیان، دلکش اسلوبِ نگارش، منجھی ہوئی زبان، تحریر کے دروبست سے کمالِ مشاقی کا اظہار! ادب و شاعری کی ہر وادی میں اُن کا قلم پھول برساتا تھا، خاصے اچھے شاعر تھے مگر اُن کی شاعری دوسرے کمالات کے سامنے دب کر رہ گئی!

جناب عبدالمجید سالکؔ کی ذات علم و ادب کی بہت سی خصوصیات کی جامع تھی، شعر و ادب میں وہ ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے اور "ادبیت" کے مزاج شناس تھے، اُن کی تحریروں نے اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے اور اس قافلہ کو آگے بڑھایا ہے۔

کہنے کو تو ہر شاعر اور ادیب کی وفات پر رسماً یہی کہا جاتا ہے کہ "علم و ادب کو بڑا نقصان پہنچا" مگر عبدالمجید سالکؔ مرحوم کی موت واقعی شعر و تنقید اور علم و ادب کا بہت بڑا نقصان ہے، وہ ہمارے درمیان سے ایک خلا چھوڑ کر اُٹھے ہیں! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو شبنمِ رحمت سے خنک و پُر بہار رکھے اور آخرت کی منزل بھی اُن کے لیے آسان ہو جائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ۱۹۵۶ء)

سیّد سبط نبی نقوی

مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی خانوادہ "قادریہ بدایوں کے چشم وچراغ، مولانا فضل رسول بدایونی کے پوتے، اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالمقتدر مطیع الرسول کے جانشین اور صاحب سجادہ تھے۔ مولانا مرحوم کی پہلی شادی بدایوں کے معزز شریف عباسی خاندان میں ہوئی تھی، مولانا عبدالہادی عرف محمد میاں ہادی جو خوش گو شاعر ہیں اور حیدر آباد دکن میں برسوں عربی اور دینیات کے لیکچرار رہے ہیں اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی بلدہ حیدر آباد ہی میں اقامت گزیں ہیں۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں ان کی والدہ یعنی مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی کی پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد اُن کی دوسری شادی بدایوں کے محلہ سید واڑہ میں ہوئی، مولانا کے خسر کو میں نے دیکھا ہے ——— وہ ریاست گوالیار میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، ملازمت سے پنشن لینے کے بعد اپنے وطن (بدایوں) میں رہتے تھے۔ ملک الشعراء ذوق کے شاگرد مذاق میاں بدایونی جن کے تفضیلی عقائد تھے، سید واڑہ کے اسی خاندان کے مشہور بزرگ تھے۔ عنایت احمد پانی پینے سے پہلے" وائے بر تشنگی حسینؑ" بڑے پُرسوز انداز میں کہتے۔ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے سید آل علی، یو۔پی کے محکمہ تعلیمات میں مشرقی امتحانات کے شعبہ کے افسر اعلیٰ اور اپنی ذات سے نہایت ہی دیندار اور خیر پسند انسان تھے، ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، پورے خاندان کی کفالت کرتے، سید سبط نبی اور ڈاکٹر آل نبی نقوی کو انہی نے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

میں مہینوں مدرسہ قادریہ بدایوں میں مولانا عبدالقدیر بدایونی کا مہمان رہا ہوں، وہ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ سید سبط نبی اُن دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ چھٹیوں میں بدایوں آتے تو اُن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں سید سبط نبی مرحوم کی شادی بریلی میں ہوئی۔

میں بھی مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں اس شادی میں شریک ہوا، سید سبط نبی کے بڑے بہنوئی اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ہم زلف پروفیسر عبدالمجید قریشی بھی اس شادی میں شریک تھے، بہت ہی مختصر سی برات تھی، شادی کا اہتمام انتہائی سادہ، جہیز اور کھلانے پر گاؤں کی شادیوں کا گمان ہوتا تھا۔ سید سبط نبی ان دنوں یا تو ایم اے پاس کر چکے تھے یا آخری سال میں تھے۔

حکومت حیدرآباد سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کے دو پشتوں کے تعلقات تھے، ان کے دادا مولانا فضل رسول بدایونی ۱۸۵۷ء سے پہلے نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کے دورِ حکومت میں دکن تشریف لے گئے تھے، وہاں ان کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ نواب خواجہ حفیظ اللہ خاں جاگیردار جیسی شخصیتیں ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئیں۔ حکومت نے بھی اس خانوادے کا دوسو سوا دوسو ماہوار موروثی وظیفہ مقرر کر کے اہلِ علم اور صاحبانِ طریقت کی قدر شناسی کا ثبوت دیا۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی سال کے سال حیدرآباد تشریف لے جاتے اور کئی کئی مہینے وہاں قیام کرتے، انہوں نے مدرسہ قادریہ بدایوں کی امداد کے لیے کوشش کی تھی، اس سلسلے میں مدرسہ قادریہ کے معائنہ کے لیے فرمانِ شاہی ہوا اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور حکومت آصفیہ تشریف لائے، مولانا عبدالقدیر بدایونی کے برادرِ نسبتی سید سبط نبی نے نواب صدر یار جنگ کے استقبال کے سلسلہ میں بڑی جدوجہد کی، انہوں نے مولانا سے کہا کہ میں نے ایسا انتظام کیا ہے کہ شہر بدایوں کے ہر مسلمان کے گھر پر ہمارا والنٹیر دستک دے کر کہے گا کہ "نواب صدر یار جنگ کے استقبال کے لیے اسٹیشن چلو!"

نواب صدر یار جنگ تشریف لائے ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا، مدرسہ قادریہ کے متصل "قادری منزل" میں قیام فرمایا۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس واقعہ کے دو تین برس بعد مدرسہ قادریہ اور اس کے کتب خانہ کے لیے حکومت آصفیہ نے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس ارزانی کے زمانہ میں یہ رقم آج کے ہزاروں کے برابر تھی۔

۱۹۳۴ء میں جب مولانا عبدالقادر بدایونی کی معیت میں راقم الحروف

کا بغداد شریف جانا ہوا تو پونا سے سید سبط نبی مولانا مرحوم سے ملنے کے لیے بمبئی آئے، وہ ان دنوں محکمہ موسمیات (پونا) میں ملازم تھے۔ اس کے بعد کا زمانہ فترت کا زمانہ ہے۔ ۱۹۴۸ء میں سید سبط نبی سے کراچی میں ملاقات ہوئی، ایر پورٹ کے قریب ایک بنگلہ میں اُن کا قیام تھا اور اب وہ ریجنل ڈائرکٹر تھے۔ سید صاحب مرحوم کی ملازمت کا آغاز غیر منقسم ہندوستان کے اسی محکمہ میں ڈیڑھ سو روپیہ کی تنخواہ سے ہوا تھا، پھر اپنی قابلیت، ذہانت، فرض شناسی اور دیانت کی بدولت محکمہ موسمیات پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہو گئے۔ اُن کی نظامت کا زمانہ محکمہ موسمیات کا عہد زریں تھا۔ موسموں کی پیش گوئیوں (FORE CAST) کے سلسلہ میں وہ خود بڑی محنت کرتے۔ اس فن میں مطالعہ و تجربہ کی بدولت انہیں غیر معمولی مہارت حاصل ہو گئی تھی، بیرونی ملکوں میں محکمہ موسمیات کی بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتیں تو سید سبط نبی مرحوم کو مدعو کیا جاتا اور ان کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اپنے فن کے وہ شہرت یافتہ نامور ماہر تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومت عراق نے اُن کی خدمات بہت بڑے مشاہرے پر حاصل کرلیں اور وہاں کئی برس نیک نامی کے ساتھ انہوں نے اپنی ذہانت اور مہارت کے جوہر دکھائے۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں " رویتِ ہلال " کے مسئلہ نے بڑی نازک کشمکش پیدا کردی تھی، دو بار دو دو عیدیں ہوئیں ایک سرکاری عید اور دوسری عوامی! عوام علماء کے ساتھ تھے، اور عوام ہی کی فتح ہوئی، اس سلسلہ میں بعض علماء کو قید و بند کی مصیبت بھی اٹھانا پڑی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سرکاری طور پر ریڈیو سے عید الفطر کے چاند دکھائی دینے کا اعلان نشر کیا گیا مگر رویت ہلال کمیٹی کو عینی شاہد نہیں مل سکے، علماء نے مساجد میں اعلان کرا دیا کہ کل عید نہیں ہوگی۔ روزہ رکھا جائے گا۔ سید سبط نبی مرحوم ان دنوں محکمہ موسمیات کے ڈائرکٹر جنرل تھے انہوں نے راقم الحروف سے شکایت کے انداز میں کہا کہ میں اپنے محکمہ کے دو آدمیوں کو جنہوں نے مختلف مقامات سے چاند دیکھا تھا جنیک لائن لے کر گیا، میں نے مولانا تھانوی کی خدمت میں عرض کیا کہ رویت ہلال کے مسئلہ میں حکومت پاکستان کے موقف کا میں حامی نہیں ہوں، میں اس کو درست نہیں سمجھتا کہ شمسی حساب سے عید

کی تاریخ مقرر کی جائے، جس طرح شیعہ بوہروں کا دستور ہے، چاند کے لیے عینی شاہدوں کی شہادت ضروری سمجھتا ہوں اسی لیے میں دو گواہوں کو لے کر آیا ہوں ——— مولانا احتشام الحق تھانوی نے فرمایا اب یہ شہادتیں بعد از وقت ہیں رویتِ ہلال کمیٹی اپنا اعلان کر چکی ——— حالانکہ شریعت کی رُو سے رات ہی نہیں دوسرے دن بھی شہادتیں لی جا سکتی ہیں۔

سید سبط نبی سے جلسوں اور دعوتوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں، ان کے چند مضامین بھی رسالوں میں نظر سے گزرے، جن میں تبحر علمی کے ساتھ زبان وادب کا لطف بھی پایا گیا۔ رسالہ "عصمت" میں اُن کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں موجودہ حکومت کے ترقیاتی کارناموں کو سراہا گیا، ظاہر ہے اس قصیدہ خوانی میں مسٹر بھٹو کا ذکر لازمی تھا۔ چند دن کے بعد ایک پارٹی میں سید سبط نبی سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا آپ کو دنیا کی کس ترقی کی تمنا ہے؟ ——— میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سید سبط نبی مرحوم بڑے پکے مذہبی شخص تھے، دین سے انہیں بڑا شغف تھا، ان کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہو گی دیکھنے میں تندرست لگتے تھے، ہاں! گراں گوشی میں برسوں سے مبتلا تھے۔ کان میں آلہ لگا رہتا ——— ! اخباروں میں ایکا ایکی اُن کے انتقال کی خبر پڑھی۔ غفرلہٗ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۶ء)

مولوی سبطین احمد بدایونی

بدایوں میں میرا بار ہا آنا جانا ہوا ہے اور میں کئی کئی مہینہ مدرسہ قادریہ بدایوں میں ٹھہرا ہوں، مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مولوی سبطین احمد بدایونی مرحوم سے میری کہیں ملاقات ہوئی تھی، ہاں پہلی بار کراچی میں جب اُن سے نیاز حاصل ہوا تو خیال آیا کہ یہ چہرہ میرا دیکھا ہوا ہے!

مولوی ضیاء احمد بدایونی (ایم۔اے) سابق استاذ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو اب کئی سال سے دہلی یونیورسٹی میں غالبًا اردو لغت کی تدوین کا کام کر رہے ہیں، انہوں نے اپنے احباب اور بعض مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ چھپوایا اور "فاران" میں تبصرے کے لیے یہ مجموعہ ارسال فرمایا۔ اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ اور زبان و ادب کے اعتبار سے شاہکار خط سبطین احمد بدایونی کے تھے، میں نے ان خطوں کو بار بار پڑھا اور اس کتاب پر "فاران" میں تبصرہ کیا تو مرحوم کے طرزِ انشا کی تعریف کی۔ اُن کی تحریر دل پر نقش ہو کر رہ گئی!

میں نے مشاہیر اور بڑی بڑی شخصیتوں سے ملنے میں اپنی طرف سے پہل شاذ و نادر ہی کی ہے ـــــ مگر سبطین احمد مرحوم کے خطوں نے راقم الحروف کو اتنا متاثر کیا کہ ان سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا، مشہور شاعر اور پاکستان ریڈیو کے اردو آرگن "آہنگ" کے ایڈیٹر جناب محشر بدایونی جو مرحوم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اُن کی معیت اور رہنمائی میں مولوی سبطین احمد بدایونی کے مکان واقع ناظم آباد تک پیدل چل کر پہنچا، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں مرحوم تشریف لے آئے، مصافحہ کے بعد معانقہ کیا اور بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ اس ہیچمدان کی پذیرائی کی! پھر نمکین و شیریں لوازم کے ساتھ چائے سے تواضع فرمائی۔

اس ملاقات کے بعد دو بار سبطین احمد بدایونی مرحوم غریب خانہ پر بھی تشریف

لائے اور میں بھی اُن کے یہاں حاضر ہوا۔ دل چاہتا تھا کہ اُن سے بار بار نیاز حاصل ہونے کے مواقع میسر آتے رہیں مگر میں اسے اپنی بدقسمتی ہی کہوں گا کہ مرحوم سے بہت کم ملاقات رہی۔!!

مولوی سبطین احمد بدایونی مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بی، اے بی ٹی تھے انہوں نے برسوں بدایوں کے مسلم ہائی اسکول میں ٹیچری کے فرائض انجام دئیے، جب یہ اسکول انٹر کالج ہو گیا تو مرحوم غالباً آخری زمانے میں وائس پرنسپل ہو گئے۔

اُن کا مطالعہ وسیع تھا اردو اور انگریزی کے بلند پایہ انشاء پرداز تھے، چند سال سے کراچی کے ادارہ "دارالتصنیف" سے وابستہ تھے، علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی (جلد اوّل) کا انگریزی میں ترجمہ کیا! اُن کی پوری زندگی مطالعہ درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں بسر ہوئی! مگر بدایوں کے صاحب طرز انشاپرداز میر محفوظ علی مرحوم کی طرح اپنے کو چھپائے رکھا، بلکہ یوں کہیے گمنام رہنے دیا! نام و نمود سے ہمیشہ بیزار رہے۔ ادب و انشاء کی دنیا میں مشہور ہونے کی تمنا ہی نہیں کی! علامہ عبداللہ العمادی مرحوم کے بعد میں نے سبطین احمد بدایونی میں صاحب علم و فضل ہوتے ہوئے انتہا درجہ کا انکسار پایا! مجھ ہیچمداں سے وہ اس طرح ملتے جیسے وہ کچھ نہیں ہیں، میں ہی سب کچھ ہوں، اُن کے اس انکسار و تواضع کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں کٹ جاتا تھا کہ ایک کوہِ گراں ایک ذرہ کی اتنی قدر افزائی کر رہا ہے۔ محشر بدایونی صاحب نے مجھ سے کہا کہ:

"سبطین صاحب فرماتے تھے ——— مولانا نے نہ جانے مجھ میں کیا دیکھ لیا ہے، جو مجھے اتنا کچھ سمجھتے ہیں........"

بات چیت میں انتہائی سنجیدہ، وضع قطع اور نشست و برخاست میں نستعلیق۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قول و عمل کے اعتبار سے دیندار ہی نہیں صاحب تقویٰ بھی، انھیں دیکھ کر مجھے اپنی بے عملی پر ندامت ہوتی تھی۔ عمر ۷۵ برس کے لگ بھگ تھی، قویٰ اچھے تھے، مگر جب وقت آ گیا تو جان جان آفریں کو سونپ دی۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۷۱ء)

سجّاد ظہیر

مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۱۹۴۱ء میں سجاد ظہیر سے سب سے پہلی ملاقات تو بمبئی میں ہوئی مگر اُن کے والد سر وزیر حسن مرحوم کو ۱۹۳۷ء میں سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدر اعظم حکومت آصفیہ کے دربار میں دیکھا۔ شام کا وقت تھا گرمی کا موسم، چائے کے بجائے شربت کا دَور چل رہا تھا، مہاراجہ کشن پرشاد کو وہ "سرکار" کہہ کر خطاب کرتے تھے! اُن دنوں یہ خبر بھی بلدہ حیدر آباد میں گشت کر رہی تھی کہ سر وزیر حسن عدالتِ عالیہ کے میر مجلس (چیف جسٹس) ہونے والے ہیں! مگر یہ خبر "افواہ" سے آگے نہ بڑھ سکی۔

غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے سجاد ظہیر صاحب نے راقم الحروف کو عصرانہ میں بلایا، وہ اُن دنوں بمبئی کی پرانی چوپاٹی سے آگے والکیسر کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان بنگلہ نما تھا، مگر فرنیچر بہت سادہ! چائے اور اُس کے لوازمات کے بعد شعر خوانی ہوئی۔ مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

راقم الحروف آج سے ۳۵ سال قبل مشاعروں میں "مزدور" پر نظم سنایا کرتا تھا۔ جس کا ایک شعر تھا:

اب کسی کے سامنے مزدور جھک سکتا نہیں
آنے والا انقلاب آئے گا رُک سکتا نہیں

اس نظم پر بڑی داد ملتی۔ مزدوروں، کسانوں اور اہلِ محنت سے ہمدردی اسلام کے نظامِ معیشت کے عین مطابق ہے۔ اسلام مظلوموں کا حامی ہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں ہمدرد اور ظالموں کا خواہ وہ مسلمان ہوں مخالف ہے! مگر کمیونسٹ شاعروں اور ادیبوں کا نقطۂ نگاہ اور مقصد مزدوروں کی ہمدردی کے پردے میں کمیونزم اور لادینیت کی تبلیغ اور اشتراکی انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنا تھا۔ اسی ادب کا نام انہوں نے "ترقی پسند ادب" رکھا! شاعروں اور ادیبوں میں تنہا میں نے ہر اسٹیج سے کھل کر ان لادینی اور اشتراکی رجحانات

کی مخالفت کا آغاز کیا۔

۱۹۴۵ء بمبئی میں خاکسار ہی کی کوششوں سے "حلقۂ فکر و نظر"[۱] قائم ہوا، اور اس کے افتتاحی اجلاس میں "ادب میں ترقی پسندی" کے موضوع پر میں نے پونے دو گھنٹہ کے قریب خوب جم کر تقریر کی۔ راجہ صاحب محمود آباد اس جلسہ کے صدر تھے۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو میں لکھا کہ ایک راجہ (یعنی راجہ صاحب محمود آباد) اور ایک شاعر (یعنی ماہر القادری) اور ایک حکیم (یعنی حکیم حیدر بیگ، جن کے یہاں بمبئی میں راقم الحروف کا قیام رہتا تھا) ہمارے مخالف ہیں۔۔۔۔!

۱۹۴۶ء کے وسط کا غالباً واقعہ ہے کہ بمبئی میں حضرت جگر مرحوم اور میں حکیم حیدر بیگ دہلوی کے یہاں مہمان تھے۔ سجاد ظہیر صاحب نے اُن کو اپنے یہاں ایک شعری نشست میں بلایا، جگر مرحوم نے مجھ سے کہا "ماہر! تمہیں ان لوگوں نے مدعو نہیں کیا، کمیونسٹ تو میں بھی نہیں ہوں۔۔۔۔" میں نے عرض کیا کہ آپ بیشک کمیونسٹ نہیں مگر کمیونزم کی تردید میں کچھ نہیں فرماتے، اس لیے کمیونسٹ آپ کو گوارا کر لیتے ہیں، میں نام نہاد ترقی پسند ادب کی مخالفت کرتا ہوں کیونکہ یہ ادب! ور لادینیت کا آئینہ دار ہے! انہی دنوں رضیہ (بیگم سجاد ظہیر) سے ایک پارٹی میں ملاقات ہو گئی تو وہ کہنے لگیں:

"ماہر صاحب! آپ تو ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں" میں نے جواب دیا کہ میں کسی کے پیچھے لٹھ لیے نہیں پھرتا بلکہ معقول و سنجیدہ دلائل کے ساتھ شعر و ادب میں اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہوں۔

سجاد ظہیر ایک بار حضرت جگر سے ملنے کے لیے حکیم حیدر بیگ مرحوم کے فلیٹ میں تشریف لائے۔ میں بھی حکیم صاحب کا مہمان تھا۔ سجاد ظہیر صاحب کے بچوں کو دیکھ کر حکیم صاحب کہنے لگے کہ میری بچیاں اور بچے (CONVENT) میں پڑھتے ہیں۔ آپ کے بچے ان سے انگریزی میں بات چیت کریں۔ سجاد ظہیر صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ "میرے بچے انگریزی نہیں اردو بولتے ہیں۔"

---

[۱] دلی میں اس کی شاخ قائم ہوئی، رئیس القلم رئیس امروہوی اس کے صدر اور حکیم محمد تقی جو باہنامہ "مشہور" کے ناشر و مالک تھے، خازن تھے۔ "حلقۂ فکر و نظر" کے مہینہ میں دو بار اجلاس ہوا کرتے تھے

اس جواب کو سن کر حکیم صاحب پر عالم سکوت طاری ہو گیا! جگر صاحب اور میں ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ میزبان کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں!

۱۹۶۵ء میں "دہلی کلاتھ مل کے" پاک و ہند مشاعرے میں میرا جانا ہوا تو ڈنر میں سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی خاصی گرمجوشی کے ساتھ گلے ملے اور بولے کہ میں جن دنوں پاکستان میں (UNDER GROUND) تھا تو میں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی اور میں سعید منزل سے گزر رہا تھا، آپ کو میں نے فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے دیکھا، دل میں آیا کہ آپ سے گفتگو کروں مگر پھر سوچا کہ کہیں تم میرا نام لیتے ہوئے جوش میں آکر چلّا نہ پڑو......!

جو لوگ نسلاً مسلمان تھے اور پھر کمیونسٹ ہو گئے اُن کے مذہب اور دین و ایمان کا مسئلہ صاف ہے پراسرار بھی ہے اور پیچیدہ بھی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی مذہبیت تو اس حد تک (؟) پہنچی ہوئی تھی کہ ہر مہینہ کسی نہ کسی بزرگ کے عرس میں شریک ہوتے۔ اولیاء اللہ سے استغاثہ اور استمداد کے بھی وہ قائل تھے، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند مگر انگریز دشمنی اور عناد و مخالفت میں روس اور کمیونزم کی طرف مائل تھے یا یوں کہیے روسی حکومت اور کمیونسٹوں کے لیے اُن کے دل میں نرم گوشہ پایا جاتا تھا! ڈاکٹر کنور اشرف کمیونسٹ کیا کمیونسٹوں کے لیڈر تھے، اُن کا بیٹا مرا تو قبر میں اس کے سینہ پر اسٹالن کی تصویر برکت کے لیے رکھی اور اشتراکی جھنڈے کا نشان بھی۔

جناب فیض احمد فیضؔ کے بارے میں یہ سننے میں آیا کہ وہ روزے رکھتے ہیں! اس کا پتہ نہیں کہ وہ صحت اور معدے کی درستی کے لیے ایسا کرتے ہیں یا دین کا ایک رکن سمجھ کر روزے کی مشقت برداشت فرماتے ہیں......

بمبئی میں ایک مزدور شاعر تھا چھریرا بدن، سر کے بال الجھے ہوئے، رنگ ایک دم آبنوسی! یہ شخص کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم کارکن بھی تھا اور پوربی زبان میں شاعری کرتا تھا، ایک دن ہم چند شعراء کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے "داں" میں جا رہے تھے۔ یہ شخص بھی ساتھ تھا، دورانِ گفتگو میں مذہب کا ذکر آیا تو وہ خاصے تند و تیز لہجے میں بولا:۔ "میں تو کمیونسٹ ہوں، مسلمان نہیں ہوں۔"

کراچی کے ایک فلسفی ادیب جو شیعہ خانوادے کے فرد ہیں مگر فلسفہ کے سمندر میں

شنادری اور غوطہ زنی کرتے کرتے وہ تشکیک اور بے یقینی کے کنارے جا پہنچے ہیں
اُن کا رجحان سوشلزم کی جانب ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم میں کوئی بنیادی فرق
نہیں ہے، صاحب موصوف سے جب بھی دین کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انہیں دین
سے بیزار ہی پایا! مگر مجالس عزا میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی بھی اپنے کو شیعہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم
میں کارل مارکس کو زمین کا "اوّلین پیغمبر" کہا ہے۔ وہ دین و شریعت کیا اللہ تعالیٰ
تک کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور اہل بیت کے مدح خواں
اور عقیدتمند ہیں، حالانکہ اللہ اور رسول کے انکار کے بعد ان عقیدتوں کا کوئی وزن اور
قیمت نہیں۔ اصل چیز ایمان باللہ اور ایمان بالرسولؐ ہے اور باقی تمام عقیدتیں ذیلی اور
ضمنی ہیں! بہار کے مشہور شاعر جمیل مظہری نے جو نسلاً شیعہ ہیں اپنے الحاد اور کفر کا
اعلان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں حضرت حسینؓ کا پرستار ہوں یا مذہب کا یہ عجیب
روپ ہے!

سجاد ظہیر کسی وفد کے سلسلہ میں ماسکو گئے ہوئے تھے وہیں اُن کا انتقال ہو گیا
وہ بھی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے مگر کمیونزم کے بہت بڑے مبلغ اور اس گروہ
کے لیڈر تھے، بہرحال اُن کی ادبی خدمات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اردو زبان کے
وہ مشاق اور منجھے ہوئے ادیب تھے، اور اُن کی تحریروں میں خاصی جاذبیت اور
ادبی تفکر پایا جاتا تھا۔ کئی برس ہوئے بھارت کے کسی رسالہ میں اُن کی ایک
تصنیف کا اشتہار پڑھا کہ سجاد ظہیر صاحب نے حافظ شیرازی کی شاعری پر کتاب
لکھی ہے! اُن کے مر جانے سے بزم اردو میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا اردو سے
محبت کرنے والوں کو ملال ہے! لکھنوی اور مشرقی تمدن کی جھلک سجاد ظہیر کی زندگی میں
پائی جاتی تھی۔ میں نے انہیں کبھی کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مہرہ
بھی جاذب نظر تھا۔ اب جو نسل اٹھ رہی ہے وہ مغرب کے تمدن و ثقافت
کی اندھی مقلد ہے۔

سجاد ظہیر پاکستان کے شدید مخالف تھے، وہ تو پاکستان اسی مشن
پر بھیجے گئے تھے کہ پاکستان کی نوزائیدہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں۔ انہوں نے

یہ کام عملاً کر کے دکھا بھی دیا مگر یہ سازش[1] بر وقت پکڑی گئی۔

کوئی کمیونسٹ اسلام اور پاکستان کا ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ بعض اوقات پاکستان کے ہمدرد بھی یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کسے خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

کمیونسٹوں نے سجاد ظہیر کی موت کی اس اہمیت کو محسوس کیا ہوگا کہ اشتراکیوں کے "کعبہ" (ماسکو) میں اُن کا انتقال ہوا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مگر

ہم موت مانگتے ہیں زمینِ حجاز میں

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۷۳ء)

---

[1] راولپنڈی سازش کیس میں اہل قلم کمیونسٹوں میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر شامل تھے، سجاد ظہیر گرفتار نہ ہو سکے۔ وہ خفیہ طریقے سے بھارت چلے گئے۔

خان سردار علی خاں

یاد پڑتا ہے سب سے پہلے خان سردار علی خاں مرحوم سے کراچی میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اسے بھی ۲۲ سال ہو رہے ہیں۔ لکری گراؤنڈ میں جماعتِ اسلامی کا سالانہ اجلاس نظم و ضبط کے اعتبار سے مثالی اجتماع تھا۔ اسلامی نمائش دیکھنے کے لیے تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔ باقاعدہ مشاعرے کا تو کوئی پروگرام نہ تھا مگر ایک شب میں شعر خوانی بھی رہی۔ اس شعری اجتماع میں سب سے زیادہ دلچسپی لینے والے خان سردار علی خاں تھے۔ پھر اُن سے لاہور، کراچی اور پشاور کے اجتماعات میں نیاز حاصل ہوتا رہا۔ محبت و شفقت کے انداز میں اُن کا مصافحہ اور اس کے بعد معانقہ دینی اخوت کے جذبات میں برقی رَو دوڑا دیتا۔

ایوب خاں صاحب کے دورِ صدارت میں حکومت کے زیرِ اہتمام دانشوروں کا اجتماع راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ بریگیڈیر گلزار احمد اس اجتماع کے (غالباً) منتظم اور روحِ رواں تھے۔ عیسائی، بدھ، ہندو، قادیانی اور مسلمانوں کے منتخب نمائندے مذاکرے میں شریک ہوئے۔ مسٹر غلام احمد پرویز کو پہلی بار اسی اجتماع میں دیکھا! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ارشادات اس اجتماع کی متاع گرانقدر تھے۔ شاعروں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری اور راقم الحروف کو مدعو کیا گیا۔ اس نیم سرکاری اجتماع کے بعد جماعتِ اسلامی پشاور کی دعوت پر راقم الحروف مولانا مودودی مدظلہٗ کی معیت میں پشاور گیا، اور وہاں جماعتِ اسلامی کے عظیم الشان جلسہ میں نظم پڑھی۔ پھر دوسرے دن موٹر کاروں کے ذریعہ منگورہ (ریاست سوات) کے لیے رفقاء روانہ ہوئے۔ دوپہر کا کھانا ڈاکٹر زین العابدین کے یہاں کھایا۔ ریاست سوات کی سختی اور قدغن کے باوجود مولانا مودودی کو دیکھنے کے لیے قرب و جوار کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے مخلص اور سرفروش کارکن تاج الملوک مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھی، تاج الملوک مرحوم

کے پسماندگان اور اعزا کی تعزیت کے لیے ہی مولانا مودودی صاحب نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ریاست سوات کے احباب نے تفریح و پذیرائی اور خیر مقدم کے جو پروگرام بنائے تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں صرف تعزیت کے لیے آیا ہوں۔ راقم الحروف سیر سپاٹے کا رسیا اور تفریحی و قدرتی مناظر کا انتہائی شوقین ہے مولانا کے اس موقف پر زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر سیر و تفریح کی حسرتوں پر اوس پڑ گئی۔

اس سفر میں خان سردار علی خاں مرحوم کا ساتھ رہا پھر سیدو شریف کے نواح سے گزرتے ہوئے عصر کے وقت اُن کی زمینداری مستقر (ڈیرے) پہنچے اور وہاں ایک رات اور دوسرے دن ظہر تک قیام کیا۔ میلوں تک گنے کے کھیت، سبزے کی فراوانی، ہرے بھرے درخت اُن کے جھرمٹ میں خان سردار علی کا ڈیرہ؛ مہمانوں کے قیام کے لیے صوفوں، قالینوں، اور مسہریوں سے آراستہ مہمان خانہ؛ مردانہ بیٹھک سے خاصے فاصلے پر بلند و بالا زنانہ حویلی ان کے گھرانے میں پردے کی شدید پابندی تھی۔ مسجد گیسٹ ہاؤس اور زنانہ حویلی کے درمیان ہزاروں گز کا لمبا چوڑا صحن، پانچوں وقت باجماعت نماز کا اہتمام، کارندے، پیادے اور کمیرے بھی جماعت میں شریک ہوتے۔ خان سردار علی خاں کی خیر پسندی نے اپنے ڈیرے میں اخلاق و شرافت اور خیر و برکت کی فضا پیدا کر دی تھی اور اس ماحول کو دینی ماحول بنا دیا تھا۔ حویلی سے باہر خس پوش سائبان تھا جس کے چاروں طرف اونچے تخت اور پلنگ بچھے ہوئے، خان مرحوم کا لوگوں سے ملنا جلنا اسی سائبان میں رہتا، امارت کے ساتھ درویشی اور سادگی کا اجتماع بھی خوب تھا۔

معلوم ہوا کہ خان عبدالغفار خاں کی زمینداری بھی اس علاقے سے متصل ہے مگر اپنا اپنا ذوق اور یافت ہے کہ ایک "سرحدی گاندھی" کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور دوسرا خان جماعت اسلامی کا امیر ہے۔

خان سردار علی خاں فرطِ تواضع سے بچھے جاتے تھے۔ مولانا مودودی کو اپنے مکان میں فروکش دیکھ کر اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شب میں عشاء کی نماز کے بعد خان مرحوم نے راقم الحروف سے اتنی نظمیں اور غزلیں سنیں ——— کہ آدھی رات ہو گئی۔ مولانا مدظلہ بھی قریب ہی پلنگ پر آرام فرما تھے۔ مولانا یوں بھی بے خوابی کے مریض ہیں، پھر جہاں شاعر موج میں آکر اپنا کلام ترنم سے سنا رہا ہو وہاں کسی کو نیند آتی

بھی ہو تو اُسے لوٹنا اور اُچیٹ جانا پڑتا ہے۔

خان سردار علی خاں صورت وضع قطع اور لباس سے خالص پٹھان نظر آتے تھے۔ کھڑا ناک نقشہ کھلتا ہوا گورا رنگ، اُنچا کرتہ شرعی پاجامہ! خوب صورت گھنی ڈاڑھی! کاندھے پر چادر! اُن کے چہرے میں بڑی کشش تھی، نیکی و تقوے اور اخلاق و شرافت کی کشش، وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے، اتنی پاکیزہ مسکراہٹ کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ جماعت اسلامی کے انتہائی فدائی تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا حکیم محمد اشرف جیسے بڑے لوگ جماعت اسلامی سے کنارہ کش ہوئے تو اس سانحہ نے جماعت اسلامی کے ساتھ خان سردار علی خاں کی وفاداری کو محکم تر کر دیا۔ جماعت اسلامی کو وہ حق پسند جماعت اور پاکستان کے لیے رحمت سمجھتے تھے اس لیے جماعت کے بارے میں وہ کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے۔ وہ ٹھوک بجا کر پرکھ کر اور خوب سوچ سمجھ کر جماعت میں شریک ہوئے تھے انہیں خود اپنی ذات کا تجربہ تھا کہ جماعت اسلامی کی وابستگی نے اُن کے اندر کتنی نمایاں دینی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد جیسے مفرورین کا عبرت انگیز حشر بھی اُن کے سامنے تھا۔ جماعت اسلامی کی بدخواہی اور دشمنی جو خدمت دین سمجھتے ہیں اور جماعت کو مصائب و مشکلات میں مبتلا دیکھ کر ان "خدام القرآن" کو دلی خوشی ہوتی ہے۔

خان سردار علی خاں نے اپنا وقت اور دل و دماغ کی توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ دولت بھی اقامت دین میں بڑی فیاضی اور خوشدلی کے ساتھ صرف کی جہاں تک دنیا کی خوش حالی اور آسودگی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں سب کچھ دے رکھا تھا مگر اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو غالب کرنے کے لیے خان مرحوم نے مشقتیں اور مصیبتیں اٹھائیں کئی بار گرفتار ہوئے، حوالات اور جیل خانوں کی آزمائشوں سے بھی انہیں گزرنا پڑا۔ اس طرح اپنے آرام اور عیش و راحت کو تج کر انہوں نے تحریک اسلامی کی رفاقت کا حق ادا کیا۔

خان سردار علی خاں مرحوم کی جدوجہد نے سرحد میں بدخواہوں کی مخالفت کے باوجود جماعت اسلامی کے کام کو آگے بڑھایا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جماعت کی اخلاقی ساکھ کو قائم رکھا! درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ خان مرحوم کی شخصیت جماعت اسلامی کا اچھا تعارف تھی۔

خان مرحوم نے امارت و دولت کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ مگر جماعت اسلامی

سے وابستہ ہونے کے بعد اُن کا مزاج فقیرانہ اور طبیعت درویشانہ ہو گئی تھی۔ دُنیا اور دین کے توازن نے اُن کے مزاج میں خوشگوار اعتدال پیدا کر دیا تھا۔ دنیا سے وہ بے نیاز نہ تھے۔ زراعت اور زمینداری کی لاکھوں کی آمدنی اُن کے حسنِ انتظام کی شہادت دیتی تھی مگر آخرت کا تصور اُن کے فکر و عمل پر غالب تھا۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے میں مخلص و مستعد! دل میں خدا کا خوف آنکھوں میں شرم و مروت اور دماغ میں اقامتِ دین کا سودا سمایا ہوا۔ شب و روز کی شدید مصروفیات کے باوجود تہجد کی نماز تک نہ چھٹنے پاتی۔

خان سردار علی خاں اچھے بھلے تھے چند ماہ ہوئے اُن کے سر میں تکلیف ہو گئی تھی جو بعد میں ایک گومڑی کی شکل میں ابھر آئی۔ اس کے علاج کے لیے راولپنڈی ہسپتال میں اپریشن ہوا اور پھر اُنہیں ہوش ہی نہیں آیا، آپریشن تھیٹر میں ہی دم نکل گیا۔ دفن اپنے گاؤں (سیرے) میں ہوئے، جنازے میں اتنا بڑا ہجوم اُس علاقے میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ سوگواروں کا ایک سمندر جنازے کے ساتھ حرکت میں تھا، اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو شبنم رحمت سے ٹھنڈی رکھے اور آخرت میں شفاعت و مغفرت کی سعادت انہیں میسر آئے (آمین)

(ماہنامہ فاران، اپریل ۱۹۷۳ء)

سلام مچھلی شہری

اب سے تقریباً ۳۵ سال قبل لکھنؤ سے ایک ماہنامہ "اضطراب" نکلتا تھا، نسیم سندیلوی اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں سلام مچھلی شہری کا کلام نظر سے گزرا کلام کے تیور پیش گوئی کر رہے تھے کہ شاعرانہ مستقبل شاندار ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں راقم الحروف آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدر آباد دکن سے کان پور آیا اور وہاں سے لکھنؤ! نسیم سندیلوی نے شام کو امین الدولہ پارک کے قریب ایک ہوٹل نما کیبن پر چائے پلائی اور یہ بھی کہا کہ آج کل لکھنؤ میں مرغی کے انڈوں کے ساتھ کچھوے کے انڈے بھی ملا دیتے ہیں مگر اس دکان میں مرغی کے انڈے ملتے ہیں۔ یہ سننے کے بعد جب تک لکھنؤ میں رہا انڈوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ چائے کے بعد فٹ پاتھ پر سلام مچھلی شہری سے تعارف ہوا، اس وقت اُن کی عمر بیس برس کی ہوگی، پیروں میں ٹوٹے ہوئے چپل، لنک لاٹ کا ملگجا کرتہ اور پاجامہ، دیکھنے میں کم رو مگر آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ جو مشہور لطیفہ ہے کہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا تھا۔ ایک راہگیر نے از رہ ہمدردی کہا کہ بھئی! تم دھوپ میں کیوں کھڑے ہو، سائے میں کیوں نہیں آجاتے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میرے دھوپ میں کھڑے رہنے سے آپ کو آخر کیا تکلیف ہے اور اگر مجھ سے ہمدردی ہے تو چار آنے مجھے عنایت فرما دیجیے — سلام مچھلی شہری کا بھی یہی حال نظر آیا! پھر چار پانچ سال کے بعد اُن کو بہتر لباس میں دیکھا! سنہ ۱۹۶۰ء میں ماہنامہ "شاعر" کی سلور جوبلی منائی گئی تھی، میں مدراس کے مشاعرے سے فارغ ہو کر بمبئی آیا۔ جشن شاعر کے مشاعرے میں سلام مچھلی شہری نظر آئے، اب تو رنگ ہی کچھ اور تھا، اُن کا چھریرا بدن گٹھیلا ہو گیا تھا، جس پر قیمتی سوٹ خاصا پھبتا تھا، شراب کے نشے میں دھت! اُن کے پڑھنے کی باری آئی تو مائک پر آ کر تقریر کر ڈالی، جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی ؎

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

شعر پڑھتے ہوئے کبھی فراق گورکھپوری سے طنز آمیز تخاطب، کبھی علی سردار جعفری پر پھبتی، کبھی مجروح سلطان پوری پر چوٹ! سلام کی شاعری میں اتنی قوت تھی اور اُن کی شخصیت کا یہ اثر تھا کہ اتنے مشہور شعراء سلام کے طنز و مزاح اور پھبتیوں کو پی گئے۔

کوئی شک نہیں سلام مچھلی شہری کی شاعری میں انفرادیت پائی جاتی تھی، خاص طور پر اُن کے قطعے تیر و نشتر ہوتے تھے!

۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ سے قبل دلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں جانا ہوا تو بزم اردو کی طرف سے اردو بازار کے بالا خانے پر جناب تابش دہلوی اور راقم الحروف کے لیے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پنڈت من موہن تلکار زشتی اس اعزازی تقریب کے کنوینر تھے۔ اس میں سلام مچھلی شہری بن بلائے آدھمکے۔ منہ سے شراب کی بھبک آرہی تھی اور جو منہ میں آرہا تھا بک رہے تھے۔ یہ تک کہہ دیا کہ باہر سے آنے والوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ جاسوس بھی شاعروں اور ادیبوں کے بھیس میں چلے آتے ہیں سب کو اُن کی باتیں ناگوار گزریں اور جلد ہی انہیں وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد اُس تقریب کی فضا پرسکون اور معتدل ہوئی اور شعر خوانی کا سماں بندھ گیا!

سلام اپنی شاعری میں انسانی عظمت کے مبلغ تھے مگر چپت کبری اشتراکیت، لادینیت اور ہندوستانی قومیت کے ترجمان تھے اور اپنے کو بھارت ماتا کا بڈھا مان سپوت سمجھتے تھے۔

ماہ فروری میں سلام مچھلی شہری کے انتقال کی خبر ملی، اُن کے عقائد اور مشاغل کچھ بھی رہے ہوں مگر اُن کی شاعرانہ حیثیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ نظریات اور مشاغل و عقائد کے اعتبار سے اُن کو کیا لکھا جائے، اس کا فیصلہ دشوار ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ مرنے سے پہلے کیا حالات اور معتقدات تھے۔ نام اور خاندانی نسبت کے لحاظ سے وہ بہرحال "مرحوم" ہیں۔ والعلم عند اللہ!

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۴ء)

علامہ سید سلیمان ندوی

بدوِ شعور ہی سے جن اہلِ قلم اور اربابِ علم کا میں نے نام سُنا ہے، اور جن کی تصانیف اور مضامین کا میں نے اثر قبول کیا ہے، سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اُنہی میں شامل ہیں ـــــ اب سے کوئی اٹھارہ بیس سال پہلے کی بات ہے جب میرا کلام رسالہ "معارف" میں چھپا کرتا تھا، سید صاحب مرحوم اُس کے چونکہ مُدیر تھے اس لیے میں اپنا کلام اُنہی کی خدمت میں بھیجتا تھا اور وہ کارڈ پر دو چار سطروں میں خط کی رسید روانہ فرمادیا کرتے تھے، اتنے بڑے آدمی کے قلم کی چند سطریں بھی میرے لیے بہت کچھ تھیں، اور میں حضرت سید صاحب کے مکتوبِ گرامی کو بار بار پڑھا کرتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میری ایک غزل مجلّہ "معارف" میں اس طرح چھپی کہ اُس کے چند مصرعے بدلے ہوئے تھے، میں نے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں اپنی شاعری کو اصلاح سے بے نیاز نہیں سمجھتا بلکہ میں تو اربابِ ذوق کے مفید مشورے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا کرتا ہوں، لیکن آپ کے رسالہ میں جو میری غزل شائع ہوئی ہے اور اُس کے جن مصرعوں پر اصلاح دی گئی ہے، تو اُس "اصلاح" نے میرے اصل شعروں کے تھوڑے بہت حُسن کو بھی غارت کر دیا ہے۔ ـــــ سید صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ .... صاحب اس حک و اصلاح کے ذمہ دار ہیں، میں نے انہیں تاکید کر دی ہے، اب ایسا نہ ہوگا۔

ایک بار حضرت سید صاحب (نوراللہ مرقدہٗ) نے مجھے "سید ماہر القادری" لکھا، میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں "سید" نہیں بلکہ "سادات کرام" کا نیاز مند اور غاشیہ بردار ہوں، مگر آپ بھی معذور ہیں .... کیونکہ "المرء یقیس علی نفسہٖ" .... !

غالباً اسی میرے معروضہ کے جواب میں سید صاحب مرحوم نے تحریر فرمایا کہ جن

احباب سے اشتیاق کے باوجود ملاقات نہ ہوسکی، اُن میں آپ بھی شامل ہیں .... مگر روزِ ازل کی ملاقات تو ثابت ہے ـــــ میں نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ ہیچمداں کے بارے میں اپنے کرم سے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اُس نے میری آبرو بڑھائی ہے۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

اب رہی "روزِ ازل" کی ملاقات تو افسوس ہے کہ اُس کی یاد ذہنوں میں محفوظ نہیں رہی۔

حافظہ پر بہت کچھ زور ڈالنے کے بعد بھی سنہ کا ٹھیک طور پر تعین نہیں کرسکتا .... غالباً ۱۹۳۷ء میں حکومتِ حیدرآباد دکن کی طرف سے ایک علمی اور تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، بلدۂ حیدرآباد کے "باغِ عام" کا ہال جہاں اب وہاں کی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے، کانفرنس مذکور کے لیے مخصوص تھا، اور ہندوستان کے ہر صوبے کے نمائندے اس میں شریک ہوئے تھے، میں جب "باغِ عام" پہنچا تو سیّد صاحب مرحوم کانفرنس ہال سے نکل کر مسجد کی طرف آرہے تھے اور بہت سے اہلِ علم اُن کے ساتھ ساتھ تھے، سیّد صاحب کے پہچاننے میں مجھے ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوئی، اُن کے عمامے کے پیچ، اُن کا نورانی چہرہ، اور اُن کی باوقار رفتار بتا رہی تھی کہ "سیرۃ النبیؐ" کا مصنف یہی ہے، عصر کی نماز سیّد صاحب مرحوم کے ساتھ ہی ادا کی، مگر تعارف اور ملاقات کا وہاں کوئی موقعہ ہی نہ تھا، بہت سے مشتاق اور عقیدت مند سیّد صاحب کے اردگرد تھے! مجھے اس کی مسرت تھی کہ جس کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے میں پڑھ چکا ہوں اُس عظیم شخصیت کو آج دیکھ بھی لیا۔

اس واقعہ کے کوئی چار سال بعد حیدرآباد دکن کی مشہور علمی درس گاہ "نظام کالج" کے شعبۂ فارسی کی طرف سے ایک ادبی جلسہ کا انتظام کیا گیا، نواب ظہیر یار جنگ بہادر (صدر المہام) جلسہ کے صدر تھے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم ان دنوں حیدرآباد تشریف لائے ہوئے تھے، اُن کی تشریف آوری سے "نظام کالج" والوں نے بروقت فائدہ اٹھایا اور سیّد صاحب مرحوم کو جلسہ میں شرکت کے لیے راضی کرلیا۔ سیّد صاحب مرحوم نے عمر خیّام کی زندگی اور شاعری پر ایک بسیط تقریر فرمائی، میں نے اسی جلسہ میں ایک فارسی غزل سُنائی!

زمانہ بڑا گریز پا واقع ہوا ہے، بس ذرا پلک جھپکی اور جگ بیت گئے ____
میں ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد چھوڑ کر دلی چلا آیا، یہ دور ہندوستان میں بڑی سیاسی معرکہ آرائیوں کا دور تھا، یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہوگیا اور اس کے بعد جو خونریز ہنگامے ہوئے وہ تاریخ کے اوراق پر ہی نہیں بلکہ مادرِ گیتی کی پیشانی پر اپنا خونیں نقش چھوڑ گئے، ہندوستان کے مسلمان آگ اور خون کے جس خوفناک طوفان سے گزرے ہیں، وہ داستان بڑی ہی دردناک ہے۔

وطن میں جب حالات انتہائی خطرناک ہوگئے تو مجھے بھی پاکستان آنا پڑا اور یہاں آئے ہوئے بھی چھ سال ہوگئے، اپریل ۱۹۴۹ء میں "فاران" کا پہلا پرچہ نکلا، اس زمانہ میں علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا قیام بھوپال میں تھا، میں نے مضمون کی درخواست کی، سید صاحب مرحوم نے پیرانہ سالی کی معذرت کے ساتھ محبت آمیز جواب دیا، پھر اس کے تقریباً تین سال بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ خود سید صاحب کراچی چلے آئے، اور چلے کیا آئے یہاں آکر بس گئے!

اب تک سید صاحب مرحوم سے خط و کتابت کے ذریعہ شناسائی تھی یا ایک دو بار بہت ہی مختصر سی ملاقات ہوئی تھی، حصولِ نیاز کی سعادت حقیقت میں یہاں کراچی میں حاصل ہوئی، ڈار منزل (سید صاحب کی قیام گاہ) عموماً میں عصر کے وقت جایا کرتا تھا، سید صاحب مرحوم جب کراچی تشریف لائے ہیں، اور میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں تو بڑے تپاک اور انتہائی شفقت کے ساتھ ملے، اس کے غالباً تیسری ملاقات میں ایک چھوٹی سی کاپی نکالی، یہ اُن کی بیاض تھی، بیاض کھول کر اپنی دو تین غزلیں مجھے سنائیں۔

سید صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں میری حاضری فیض و استفادہ کی غرض سے ہوتی تھی، ایک بار میں نے دریافت کیا کہ میں صبح کو نمازِ فجر کے بعد قرآن شریف پڑھ کر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی رُوحِ مقدس اور دوسرے بزرگوں اور اپنے عزیزوں کی ارواح کو ثواب پہنچایا کرتا ہوں، کیا سُنّتِ نبوی یا آثارِ صحابہ میں اس کے لیے کوئی نظیر ملتی ہے؟ اس پر سید صاحب مرحوم نے مسکرا کر فرمایا کہ میں بھی یہی کرتا ہوں مگر اس کے لیے کوئی سند مجھے نہیں ملی، یوں سمجھو کہ یہ ثواب "بینک" میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

"جماعت اسلامی" کے سلسلہ میں دو تین بار کافی طویل بحث چھڑ گئی، اور میں نے سخت گفتگو کی، میں مدافعتِ حق کے جوش میں یہ تک بھول گیا کہ کتنی بڑی شخصیت سے ہم کلام ہوں، مگر سید صاحب مرحوم نے میری کڑی تنقید کا بُرا نہیں مانا، یہ اُن کی وسعتِ ظرف، عالی حوصلگی اور اپنے خوردوں اور نیازمندوں کے ساتھ عفو و درگزر کی دلیل تھی۔

ایک بار "وحدت الوجود" پر وہ مجھے بعض بنیادی نکات سمجھانے لگے، میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، مگر پھر ایسے لطائف درمیان میں آگئے کہ مجھ سے خاموش نہ رہا گیا، میں نے کئی بار اعتراض کیا اس پر سید صاحب مرحوم بولے :-

"تم نے کہیں عشق بھی کیا ہے ...... ؟"

میں شرما کر چپ ہو گیا ..... حالانکہ :-

کس زبانِ چشم خوباں را نہ می داند چو من
روزگارے ایں غزالاں را شبانی کردہ ام

سید صاحب مرحوم اپنے زہد و ورع اور علمی جلالت کے باوجود شگفتہ مزاج بھی تھے، اسلامیہ کالج (کراچی) میں ایک ادبی اجتماع تھا، اور عصرانہ کا بھی انتظام تھا، چائے پینے کے لیے جب ہال میں پہنچے تو وہاں کالج کی طالبات بھی تھیں، سید صاحب مرحوم نے یہ رنگ دیکھ کر مجھ سے فرمایا :

"اس زمانہ میں عورت کسی جگہ پیچھا نہیں چھوڑتی"

سید صاحب نے اپنی کتاب "حیات امام مالکؒ" غالباً سب سے پہلے "فاران" میں تبصرے کے لیے مجھے عطا فرمائی تھی، میں نے اُس پر تبصرہ کیا اور دو تین لفظوں پر گرفت بھی کی —— اس کے بعد اُنھوں نے اپنی دوسری تصنیف عنایت فرماتے ہوئے کہا :-

"اس پر بھی تبصرہ کرو، اور زبان کی غلطیاں نکالو ....."

ایک بار حضرت سید صاحب کے چھوٹے صاحبزادے سید سلمان سلمہٗ نے میری تنقید پر اعتراض کیا تو سید صاحب نے انہیں ٹوکا اور مجھ بے علم کی حمایت فرمائی۔

حکیم نصیر الدین صاحب ندوی کے یہاں دوپہر کی دعوت تھی۔ نظامی دواخانہ کے ایک کمرے میں مہمانوں کی نشست کا انتظام تھا، سید صاحب حکومتِ سعودیہ کے سفیر

کے قریب بیٹھے تھے اور سفیر موصوف سے باتیں کر رہے تھے، اسی دوران میں میری طرف اشارہ کر کے فرمایا :-

"یہ شاعر ہی نہیں ناقد بھی ہیں اور ان کی تنقید اکثر صائب ہوتی ہے !"

میں "فاران" لے کر حاضر ہوتا، تو رسالہ میرے ہاتھ سے لیتے ہی پڑھنا شروع کر دیتے، مطالعہ کی رفتار بہت تیز تھی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ مرحوم کی وفات پر میرا مضمون پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا :-

"میرے بعد تم میرے اس رنگ (وفیات) کو قائم رکھو گے ...."

اپنے خوردوں اور نیازمندوں کی حوصلہ افزائی کے لیے سید صاحب مرحوم کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر وسعت عطا فرمائی تھی !

سید صاحب مرحوم جن دنوں صاحب فراش تھے، میں بھی اُسی زمانہ میں بیمار تھا، اُن کے داماد سید ابوعاصم صاحب ایڈووکیٹ جب مجھے دیکھنے کے لیے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ سید صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجیے، مجھ میں ذرا بھی طاقت ہوتی تو ضرور حاضر ہوتا، چند دن کے بعد سید صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، میں اپنی شدید علالت اور نقاہت کے سبب سید صاحب مرحوم کے جنازے میں شرکت کی سعادت سے محروم رہا ____ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم نے دس بیس سال نہیں، پچاس سال تک دین اور علم وادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، علامہ شبلی نعمانی کے سجادۂ علم و فضل کو انھی نے سنبھالا اور اپنے اُستاد کی جانشینی کا حق ادا کر دیا، شبلی نعمانی نے لائق شاگرد کو مرتے دم وصیت کی تھی کہ سیرۃ النبیؐ کے کام کو پورا کرنا اور سید صاحب مرحوم نے اس عظیم الشان کام کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ وہ دین واخلاق اور تاریخ وادب کا قابلِ فخر کارنامہ بن گیا اور اس طرح اُستاد اور شاگرد دونوں نے اپنی آخرت کے لیے نیکی اور ثواب کا ذخیرہ فراہم کر لیا (رحمہا اللہ تعالےٰ وجزاہما اللہ خیرالجزاء)

سیرۃ النبیؐ کے مجلدات کے علاوہ "ارض القرآن" "سیرت عائشہؓ" اور "خطبات مدراس" سید صاحب مرحوم کی معرکہ آرا تصانیف ہیں، دوسری چھوٹی چھوٹی کتابیں اور علمی اور

تاریخی مضامین بھی بڑے کام کی چیزیں ہیں! کمیونزم کے بارے میں سید صاحب مرحوم کا یہ جملہ یقیناً ضرب المثل بن کر رہے گا کہ "یہ (کمیونزم) وقتِ واحد میں بادشاہ کو تخت سے اور خدا کو عرش سے اُتار دینا چاہتا ہے۔"

سید صاحب مرحوم کو اپنے اُستاد سے شعر و سخن کا جو ذوق ورثہ میں ملا تھا، اسی ذوق نے "عمر خیام" پر اُن سے کتاب لکھوادی، اس قدر تحقیق اور تفصیل کے ساتھ کسی ایرانی ادیب اور تنقید نگار نے بھی خیام پر غالباً کوئی کتاب نہیں لکھی۔

مجلہ "معارف" کو جو وقار، مرتبت اور اُونچے علمی حلقوں میں قبولیت حاصل ہوئی، وہ سب کچھ سید صاحب مرحوم کی کامیاب ادارت کا ظہور تھا۔ حیاتِ شبلی بھی سید صاحب کی بلند پایہ تصنیف ہے اور فنِ سیرت نگاری (بیوگرافی) پر معیاری کتاب ہے۔ سید صاحب قدس سرہٗ عربی زبان کے بڑے اچھے انشا پرداز تھے، انگریزی بھی بقدرِ ضرورت اُن کو آتی تھی، ارض القرآن کی تصنیف کے سلسلہ میں تھوڑی سی عبرانی بھی سیکھ لی تھی، اور فارسی دانی کا یہ عالم تھا کہ علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام کی غلطیوں پر گرفت کی اور اُن کے بعض مشوروں کو اقبالؒ نے قبول کر لیا، علامہ اقبالؒ نے سید صاحب مرحوم کو ایک بار لکھا تھا کہ میری مثنوی پر نیکلسن کی رائے آچکی ہے مگر میں آپ کی رائے کا منتظر ہوں!

سید صاحبؒ نے اپنے تلامذہ کی جو جماعت چھوڑی ہے اُن میں سے بعض شاگرد اپنی جگہ خود زندہ دبستان ہیں اور علمی دُنیا میں بڑی شہرت رکھتے ہیں! سید صاحب کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک علمی حادثہ ہی نہیں دینی سانحہ بھی ہے۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر خلافت کے جس وفد کو لے کر انگلستان گئے تھے، سید صاحب بھی اُس کے ایک رُکن تھے، اس سلسلہ میں اُنھیں یورپ کی سیاحت کا بھی موقع مل گیا، ایک ادیب، مؤرخ اور محقق کے لیے اس قسم کا سیر و سفر بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے اور فکر و نظر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر زمانہ میں یعنی وفات سے چند سال قبل حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں سید صاحب مرحوم داخل ہو گئے تھے "ندویت"

اور "خانقاہیت" کا یہ امتزاج بھی دیدنی تھا!!

یہ شہرت، یہ فضل وکمال، اس قدر علمی وقار، ہر طرح کی آسودگی نصیب اور عزت و آرام کی زندگی میسر! مگر موت آئی تو ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ مل سکی! ہم جو زندہ ہیں انہیں بھی ایک نہ ایک دن اسی منزل سے گزرنا ہے۔ آؤ اپنے لیے دعا کریں کہ بار الٰہا! ایمان پر خاتمہ نصیب ہو اور رسول اللہؐ کی شفاعت اور تیری رحمت و مغفرت کی اُمید لے کر تیرے حضور حاضر ہوں تو اس اُمید کی لاج رکھ لیجیو!

الٰہ العالمین! اپنے بندے اور اسلام کے مخلص خدمت گزار "سلیمان ندوی" کو اپنی رحمت کا قرب اور اپنے فضل و کرم کا جوار عطا فرما، اُن کی قبر پر تیری رحمت کے سدا پھول برستے رہیں اور آخرت میں بلند درجے ملیں! (آمین)

(ماہنامہ فاران" فروری ۱۹۵۴ء)

مولوی سمیع اللہ قاسمی

۱۹۴۰ء میں مولوی سمیع اللہ قاسمی مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور پہلی ملاقات ہی میں بے تکلفی سی ہو گئی، اُن کے لباس، وضع قطع اور رہن سہن میں شہریت کم اور "قصباتیت" زیادہ تھی، یہ چیز خاص طور سے مجھ دیہقانی کے لیے وجہ کشش تھی، میں نے گاؤں میں پرورش پائی تھی، اس لیے دیہات اور قصبات کی معاشرت سے نہ صرف دلچسپی اور لگاؤ بلکہ محبت ہے —— اس کے بعد جب بھی میرا دلی جانا ہوتا، مولوی سمیع اللہ سے ملنے کے لیے ضرور جاتا، ان دنوں میں حیدر آباد میں رہتا تھا، سال کے سال وطن کا پھیرا ہوتا، اور مشاعروں کی شرکت یا عزیزوں کی ملاقات کے عنوان و تقریب سے دلی بھی آنا ہوتا رہتا، پھر میں ۱۹۴۴ء میں مستقل طور پر دلی آ گیا اور روزانہ مولوی سمیع اللہ مرحوم سے ملاقات ہونے لگی، شام جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، اردو بازار اور ایڈورڈ پارک میں گزرتی تھی، صابر دہلوی مرحوم کا ساتھ رہتا۔

مولوی سمیع اللہ کا تعلق دیوبند کے مکتبۂ فکر سے تھا، ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہہ علامہ مفتی کفایت اللہ مرحوم اُن کے خسر تھے، اس نسبت سے وہ کٹر کانگریسی تھے، سر سے پیر تک کھدر میں ملبوس، کانگریس کے مداح اور مسلم لیگ کے سخت ناقد! — قائداعظم محمد علی جناح پر وہ "میٹرک پاس لیڈر" کی طنز کیا کرتے تھے، مگر سیاسی مسلک کے اس اختلاف کے باوجود مسلم لیگیوں کا بھی اُن کے یہاں آنا جانا رہتا۔

مولوی سمیع اللہ مرحوم کتابوں کا کاروبار کرتے تھے، کتب خانہ عزیزیہ دینی کتابوں کے لیے مشہور تھا، اُن کی تجارت محدود تھی، طبیعت قناعت پسند پائی تھی، وہ چٹنی سے جَو کی روٹی کھا کر بھی خوش اور مطمئن رہتے، کتب خانہ عزیزیہ میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا جمگھٹا رہتا، چائے کا دَور چل رہا ہے، قلفیاں کھائی جا رہی ہیں، کبابوں سے مہمانوں کی تواضع ہو رہی ہے، اس پر لطیفے، قہقہے، شعر خوانی اور سیاسی بحث مباحثہ! مولوی

سمیع اللہ مرحوم کی دکان کیا تھی، اچھا خاصہ کاسموپولیٹن کلب تھا! شہر کے بعض خوبرو نوجوان بھی وہاں دکھائی دیتے، اور یہ چیز خود اپنی جگہ تفریح، دلچسپی، چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کا موضوع تھی!

باہر سے شعراء آتے تو اپنا سامان کتب خانہ عزیزیہ میں چھوڑ جاتے، بعض اوقات کئی کئی شاعروں کے بستر اور ٹرنک اُن کی دُکان اور مہمان خانے میں دیکھے گئے، ایسا بھی ہوتا کہ شاعروں، ادیبوں اور مولویوں کی پوری ٹیم کو چائے پلائی جاتی چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کے لوازمات بھی! اور پھر کسی ایک مہمان سے ارشاد فرمایا کہ "یہ پارٹی آپ کی طرف سے تھی، ہوٹل کا ملازم لڑکا وہ آرہا ہے، آپ چائے بسکٹ کے دام اُسے دے دیجئے۔"

اُن کی دکان پر گاہکوں سے زیادہ ملنے والے آتے تھے، ان آنے والوں میں ہر درجہ کے لوگ شامل تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی جیسے مشہور و مقبول شاعر بھی اور اختر پھپھونڈوی جیسا گمنام شخص بھی، آصف علی اور سوبھاش چندر بوس جیسے اکابر مشاہیر کو بھی کتب خانہ عزیزیہ میں بیٹھا ہوا دیکھا گیا! اُن کے جاننے والوں اور دوست احباب کی کوئی شمار نہ تھی، سب کی دلدہی کرتے اور ہر کسی سے محبت و تواضع سے پیش آتے۔

۱۹۴۷ء میں دلی میں جو آشوبِ قیامت برپا ہوا تو میرے ہم زلف (عبدالکریم خاں) نے دو سو کے قریب میری کتابیں مولوی سمیع اللہ کے یہاں رکھ دی تھیں۔ ان میں بعض قیمتی کتابیں بھی تھیں جو اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، پاکستان آنے کے بعد مولوی سمیع اللہ کو میں نے خط بھی لکھا کہ جو کتابیں فروخت نہیں ہو سکیں، وہ فلاں صاحب کو دے دی جائیں مگر یہ معاملہ :۔

حسابِ دوستاں در دل

کا رنگ اختیار کر گیا۔

مولانا سمیع اللہ قاسمی بڑے جوشیلے، نڈر اور بے باک شخص تھے، جس بات پر حق سمجھ کر جم جاتے، اُس جگہ سے انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا تھا۔ مصر میں اخوان المسلمین کے اکابر کو جب پھانسی دی گئی تو مولوی صاحب مرحوم نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا، یہ احتجاج حکومتِ ہند کی پالیسی کے خلاف تھا اس لیے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

۱۹۶۴ء میں جب میں دلی کے مشاعرے میں گیا، تو اُن سے سترہ برس بعد ملاقات ہوئی، دیکھتے ہی لپٹ گئے، میں وہاں ہوٹل میں ٹھہرا تھا مگر اُن کی دکان ہی "ڈرائنگ روم" بنی رہی، اب وہ خاصے بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ گٹھیا کے سبب چلنا پھرنا دوبھر تھا، لکڑی ٹیک کر بڑے تکلف کے ساتھ چلتے مگر آواز میں وہی پہلا جیسا جلال تھا، دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کتابوں کا کاروبار ترقی پر ہے۔

ڈیڑھ مہینہ ہوا ہوگا، دلی کے ایک خط سے مولوی سمیع اللہ قاسمی کے انتقال کی خبر ملی، اس مزاج و طبیعت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اُن کے اٹھ جانے سے دلی کے اردو بازار کی رونق جاتی رہی اور دوستی، ملنساری اور تواضع و میزبانی کی روایات کا ایک روشن باب ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرنے والے کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۹ء)

سید احمد میرٹھی

۱۹۴۱ء میں سید احمد میرٹھی سے میرٹھ میں سب سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ میرٹھ میں راقم الحروف کے آنے کی خبر سن کر انہوں نے نخشب جارچوی مرحوم کی وساطت سے اپنے یہاں شام کی چائے پر مجھے مدعو کیا۔ چائے خوش ذائقہ اور اس کے لوازم پر تکلف تھے، پھر شعر و شاعری...... سید احمد مرحوم نے اپنا کلام سنایا۔

اُن کے صاحبزادے سید وصی احمد تقسیم ہند کے کئی برس بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی آ گئے تھے۔ سید احمد میرٹھی کئی بار کراچی تشریف لائے نخشب جارچوی زندہ تھے اُن کے یہاں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دعوتیں رہتیں! سید صاحب نے بھی اپنے صاحبزادے کے یہاں شاعروں کو مدعو کیا۔ اس سانحہ کو پانچ چھ برس کے قریب ہوئے ہوں گے کہ اُن کے اکلوتے فرزند کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ جانکاہ تھا مگر وہ اس کوہِ غم کو سہہ گئے۔ وصی احمد نے کئی بیٹیاں اور بیٹے چھوڑے۔ سید احمد میرٹھی کا سب سے بڑا پوتا امریکہ میں ہزاروں روپیہ کے مشاہرے پر کارگزار ہے۔ کراچی میں اوسط درجہ کا ذاتی مکان ہے۔ موٹر ہے، اوسط درجے کا فرنیچر ہے ——— غرض گھر والوں کو ہر طرح کی فراغت حاصل ہے! سید صاحب کئی مہینہ سے کراچی میں مقیم تھے دوبار ویزا کی توسیع بھی ہو چکی تھی اپنی پوتیوں کی بیاہ شادی کی فکر کر رہے تھے۔ میرٹھ میں چھ سات لاکھ کی جائداد رہ گئی وہاں کے مکانات کرایہ وغیرہ کی آمدنی ڈھائی ہزار ماہوار سے کیا کم ہو گی، اُن کا خیال تھا کہ بھارت جا کر پھر جو پاکستان آؤں گا تو پھر پاکستانی بن جاؤں گا۔ ہندستان میں انہیں روپیہ پیسہ اور جائداد کے ضروری انتظامات بھی تو کرنے تھے، مگر اُن کے یہ سب ارادے اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، ایک دن اتوار کی صبح کو مجھے فون کیا کہ "بزم صبا" میں چلنے کا ارادہ ہے، کیا تم بھی وہاں آ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ ضرور حاضر ہوں گا! وہ حسبِ وعدہ تشریف لائے، چائے پی اور لوازمات بھی چکھے، خوب چہک کر اپنی غزل

سنائی، اُسی رات کو شب میں گھبراہٹ سی محسوس کی، پنکھا بند کیا، دوا کی گولی کھائی اُس کے بعد پلنگ پر جو لیٹے ہیں تو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

راقم الحروف ۱۹۶۵ء میں جب دہلی کے مشاعرے میں گیا تھا تو میرٹھ بھی جانا ہوا۔ تسکین قریشی مرحوم میرے میزبان تھے۔ ایک دن دوپہر کا کھانا سید احمد مرحوم کے یہاں رہا، اب حالات بدل چکے تھے اُن کا مکان کیا تھا محل سرائے تھا مگر اس میں پہلے کی طرح نوکروں اور باندیوں کی چہل پہل نہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی اقبال مندی رخصت ہو چکی تھی۔ یہ مظلومیت اور ادبار کا دَور تھا۔ سید صاحب کی شاندار حویلی کی ویرانی اور شکستگی کے آثار دیکھ کر افسوس ہوا۔

سید احمد کے والد میرٹھ کے سب سے بڑے رئیس تھے، شاعری میں وہ میر انیس کے فرزند میر نفیس کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے اپنے چہیتے بیٹے (سید احمد) کی شادی کا امیرانہ تزک و احتشام کے ساتھ اہتمام کیا۔ نواب حامد علی خاں والی رامپور اپنے پورے خدم و حشم کے ساتھ اس شادی میں شریک ہوئے۔ سید احمد کے والد سے نواب صاحب کا یارانہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ شادی میں رقص و سرود کے تمام مصارف میرے ذمہ رہیں گے۔ دوسری نامی گرامی طوائفوں[1]، نقالوں، ڈوم ڈھاڑیوں اور بین باجہ بجانے والوں کے علاوہ گوہر جان کو بھی بلایا گیا جو اس زمانے میں مجرے کا ایک ہزار روپیہ لیتی تھی ــــ اسی شہرۂ آفاق مغنیہ کے لیے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

آج خوش بخت نہیں کوئی بھی گوہر کے سوا سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

ایسے دھوم دھڑکے اور نوابوں اور راجاؤں کے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ اس نواح میں کسی زمیندار اور دولت مند کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

سید احمد میرٹھی ضلع میرٹھ کے معزز رئیس تھے، کئی برس صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ لکھنؤ اور نینی تال جاتے تو وزراء کے یہاں مہمان رہتے۔ خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے۔ جن دنوں شکار کا شوق تھا تو نشانہ بازی میں خاص مہارت رکھتے تھے، مذہباً شیعہ تھے۔ ایک طوائف سے متعہ بھی کیا تھا! اُن کی شاندار حویلی دیلی بازار میں واقع ہے جو

---

[1] ہندوستان کے مسلمانوں کی اسی اخلاقی حالت کو مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے "مسدس" میں بڑے درد و غم کے ساتھ بیان کیا ہے۔

طوائفوں کا محلہ ہے۔ ارباب نشاط سید صاحب کے نیاز مند تھے۔

سید احمد میرٹھی مرحوم خوش گو شاعر تھے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، اور مرثیہ ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ مرثیہ پڑھنا بھی ایک فن ہے اور اس فن میں وہ طاق تھے۔ میر انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج کو انہوں نے مرثیہ پڑھتے بارہا دیکھا تھا۔ بس انہی کی نقل اتارتے تھے بلکہ کچھ انداز اور بیانیہ حرکات GESTURES خود اُن کی ایجاد تھیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین جو آج کل پنجاب میں محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر ہیں۔ انہوں نے رضویہ کالونی کے امام باڑے میں میر نفیس کا مرثیہ پڑھا جس کی دھوم مچ گئی۔ نخشب جارچوی کے یہاں جب سب دوست جمع تھے تو سید صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صفدر نے اس شعر:

قدم اٹھائے ہوئے نیچے چڑھائے ہوئے
چلے چلو انہیں کوفے تلک بھگائے ہوئے

کے بتانے میں کوتاہی کی۔ پھر انہوں نے اس شعر کو پڑھتے ہوئے ہاتھ اور تیوروں کے اشارے سے اس منظر کی تصویر کھینچ دی، فرماتے تھے مرثیہ خوانی اور اس کا "بتانا" بڑا نازک فن ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے OVERACTING کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنا کلام ابھی تک نہیں چھپوایا؟ بولے میں میرٹھ سے آتے ہوئے لاہور میں ڈاکٹر صفدر حسین کو اپنے کلام کا مسودہ دے آیا ہوں۔ انہیں کے اہتمام سے کتاب چھپے گی، نہ جانے مرحوم کا مجموعہ کلام کتابت و طباعت کی کس منزل میں ہے۔

سید صاحب اب کی بار کراچی تشریف لائے تو فون پر بولے، "ماہر! کراچی میں سب سے پہلے تمہیں فون کر رہا ہوں!" پھر مزاح و ظرافت کی باتیں کیں۔ میرا نام منظور حسین ہے گاؤں کے لوگ مجھے "منجور" کہتے تھے، سید صاحب بھی محبت اور بے تکلفی کے انداز میں اسی نام سے مجھے پکارتے! وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اوراد و وظائف بھی پڑھتے تھے۔ عمر اسی سے ایک دو برس زائد ہو گی مگر طبیعت جوانوں کی طرح شگفتہ تھی، اُن کے مرنے سے لطفِ صحبت جاتا رہا —— اللہ تعالیٰ اُن کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۶ء)

حضرت سیماب اکبرآبادی

حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم سے جے پور میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یہ ۱۹۳۴ء[1] کا واقعہ ہے جب جے پور میں بہت بڑے پیمانہ پر آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا، ملک کے قریب قریب تمام شعرا جمع تھے، اس انداز کے مشاعرے پھر دو چار ہی دیکھنے میں آئے، سر تیج بہادر سپرو کے داماد مسٹر امرناتھ اٹل مشاعرے کے صدر تھے اور انہی کی سرپرستی مشاعرے کی کامیابی کی ضامن تھی۔

حیدرآباد دکن سے فانی بدایونی، امجد حیدرآبادی، آزاد[2] حیدرآبادی اور راقم الحروف اس مشاعرے میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے اور آئے کیا تھے سر اکبر حیدری مرحوم نے ہمیں بھیجا تھا، حضرت فانی کے علاوہ باقی تمام شاعروں نے "یادگار" میں قیام کیا، حضرت سیماب مرحوم کا بھی یہیں قیام تھا۔ مشاعرے کی طرحی غزلوں میں سب سے زیادہ کامیاب مطلع سیماب مرحوم ہی کا تھا ؎

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دوسری شب میں نظمیں پڑھی گئیں، میں نے "صبح بہاراں" اسی مشاعرے کے لیے کہی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ میں نے نظم جس وقت پڑھی ہے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو

---

[1] اس مضمون میں جو تاریخی سنین درج کیے گئے ہیں، اُن میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، میرے پاس ان واقعات کی کوئی ڈائری لکھی ہوئی نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ حافظہ میں محفوظ ہے اور اسی سے کام لے رہا ہوں' (م۔ق)

[2] حکیم آزاد انصاری نہیں یہ آزاد حیدرآباد دکن کے ایک شاعر تھے جو اکبر الہ آبادی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔

رہا تھا۔

اس مشاعرے کے دوسرے سال حضرت سیماب مرحوم سے ریاست ٹونک میں ملاقات ہوئی، نواب سعادت علی خاں مرحوم والیٔ ٹونک کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی، وہ کہتے تھے کہ میں مضطر خیر آبادی کا شاگرد ہوں اور یہ اشعار نواب صاحب مرحوم ہی سے منسوب ہیں

ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں
یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں
اُنہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں
مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

شعرا کا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا اور ریاست کی طرف سے میزبانی کا انتظام تھا، کئی دن قیام رہا اور حضرت سیماب مرحوم سے ملنے، بات چیت کرنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، نواب صاحب ٹونک کے یہاں ایک مشہور شاعر کے تملق اور چاپلوسی کا عجیب منظر دیکھنے میں آیا جس کا میں یہاں تذکرہ مناسب نہیں سمجھتا۔

اُس کے بعد متعدد مقامات پر مشاعروں، کانفرنسوں، دعوتوں اور ادبی صحبتوں میں حضرت سیماب مرحوم سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ میں اظہارِ رائے میں فطری طور پر بے باک واقع ہوا ہوں، حق بات زبان پر آتی ہے تو پھر رکتی نہیں، اب سے کوئی سات سال پہلے کی بات ہے، صابر صاحب دہلوی کی لڑکی کی شادی تھی، حضرت سیماب بھی اُس تقریب میں شریک تھے، فلم کمپنیوں کا ذکر چھڑ گیا، حضرت سیماب نے فرمایا کہ فلم انڈسٹری میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے، میں نے ایک اسٹوری مرتب کی ہے اور اُس کے مکالمے اور گانے بھی خود ہی لکھے ہیں، اور اس سلسلے میں فلمی گانوں کی دھنوں (TUNES) کا بھی ذکر آیا، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا مولانا! فلمی لائن سے تعلق آپ کو زیبا نہیں یہ آپ کے رُتبہ سے فروتر ہے، میں خود اس لغویت میں مبتلا رہ چکا ہوں اور اُس حماقت پر آج تک متاسف ہوں —— حضرت سیماب نے میری بات کا بُرا نہیں مانا بلکہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

حیدر آباد دکن سے جے پور جاتے ہوئے ایک بار میں حضرت سیماب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک دن کے لیے ٹھہر ا بھی تھا، بڑی تواضع سے پیش آئے، صبح کے وقت ان کا معمول تھا کہ نماز پڑھ کر انڈے اور شہد کا ناشتہ کرتے اور تھوڑی دُور ٹہلنے کے لیے نکل جاتے پھر

میں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قصرالادب میں تکیہ کے سہارے تخت پر جھکے ہوئے بیٹھے ہیں، شاگردوں کی غزلیں اور نظمیں پھیلی ہوئی ہیں اور اصلاح دیتے چلے جاتے ہیں۔

جناب اعجاز صدیقی نے پہلے سے سیٹ ریزرو کرا دی تھی، حضرت سیماب مرحوم اور میں جے پور تک ہم سفر رہے، سیماب صاحب کا اور میرا یہ پہلا اور آخری سفر تھا، یہاں تک کہ انھوں نے سفرِ آخرت اختیار کر لیا اور میں اس کی تیاری میں مصروف ہوں۔

پاکستان میں آنے کے بعد حضرت سیماب مرحوم سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، آخری مشاعرہ اُن کے ساتھ مئی سنہ ۱۹۵۰ء میں پڑھا۔ راولپنڈی کے ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا، مجھ سے فرمانے لگے "آپ نے راولپنڈی آنے کی مجھے اطلاع نہیں دی، میں بھی آپ کے ساتھ ہی آتا" میں نے عرض کیا اب آپ کا کیا پروگرام ہے، فرمایا "لاہور ایک ضرورت سے جانا ہے" میں نے کہا "میں کوہ مری اور پشاور جاؤں گا، دو مسافروں کے پروگرام میں جب اتنا اختلاف ہو تو وہ ہم سفر کیسے ہو سکتے ہیں۔۔۔"

حضرت سیماب مرحوم پر فالج کے دو حملے ہوئے، پہلے حملہ کے بعد وہ اچھے ہو گئے مگر دوسرا حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ آواز تک متاثر ہو گئی تھی، اُلجھ اُلجھ کر باتیں کرتے تھے، مگر اُن کا دماغ آخر وقت تک کام کرتا رہا۔ اس بیماری کے دوران میں بھی انھوں نے غزلیں کہی ہیں ـــــ یہ شعر اسی زمانہ کی یادگار ہے !

چلو ملتان یا لاہور، سیماب
کراچی کی ہوا نے مار ڈالا

اور شاعر کا کہنا سچ ثابت ہوا، کراچی کی آب و ہوا نے سچ مچ اُسے مار کر چھوڑا، یہاں تک کہ جس کے شانے شعر و ادب کے بارِ گراں کو اُٹھائے ہوئے تھے اس کے جنازہ کو مجھ سخت جان نے کاندھا دیا۔

حضرت سیماب مرحوم نے نظم و نثر کی چھوٹی بڑی کم و بیش ایک سو کتابیں یادگار چھوڑیں، نثر بھی خوب لکھتے تھے، مشاعروں کے صدارتی خطبے پڑھنے کی چیز ہیں سیماب کی ذات اپنی جگہ شعر و سخن کی ایک یونیورسٹی تھی، داغ کے بعد اتنے بہت سے شاگرد شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئے ہوں ـــــ اُردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے "ادارۂ تصنیف و اصلاح" قائم کیا جہاں اُجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں

غزلیں اور سہرے لکھے جاتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک اشتہار میں "دیوان" کی اجرت پانسو روپے درج تھی، حضرت سیماب کی شاعرانہ توتیں دوسروں پر کافی صرف ہوئیں کاش وہ تمام کی تمام انہی کے کام آتیں۔

پُرگوئی اور زودگوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر شعر لکھتے جاتے، وہ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیا کرتے تھے، اُن کا دماغ کثرتِ شعرگوئی کے سبب "شعر سازی" کی صحیح ایک مشین بن گیا تھا، ایک بار رسالہ "شاعر" سارے کا سارا منظوم شائع کیا۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی نظم میں چھاپے گئے، مثنوی مولانا روم کے ساتوں دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا قرآن پاک کے ترجمہ کو نظم کا جامہ پہنایا، ہزاروں غزلیں، نظمیں، رباعیاں اور قطعے کہے، اپنے لیے جو کچھ کہا اور جو دوسروں کو کہہ دیا اس کی تعداد دو ڈھائی لاکھ شعروں سے کیا کم ہوگی؟

حاجی محمد اصطفا خاں صاحب لکھنوی نے گزشتہ سال چند شعرا کو کھانے پر بلایا تھا، مہینہ کے مہینہ ایک مخصوص شعری اجتماع کے لیے مشورت کرنی مقصود تھی، بعض حضرات نے یہ رائے دی کہ طرحی مشاعرہ ہونا چاہیئے، حضرت سیماب کو خاص طور پر اصرار بلکہ شدید اصرار تھا کہ صرف طرحی غزلیں پڑھی جائیں، میں نے کہا میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں، طرح کی پابندی ٹھیک نہیں یوں کہنے کو شعر ہر وقت کہے جا سکتے ہیں مگر حقیقی شاعری کے لیے طبیعت میں "آمد" ضروری ہے اور "آمد" اختیاری چیز نہیں ہے شاعری وہی ہے کہ شعر خود شاعر پر طاری ہو نہ ہو کہ شاعر اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرے، "آورد" کی شاعری ایک قسم کی "صنعت" اور "کاریگری" ہے —— دو تین صاحبوں نے میری تائید بھی کی، مگر حضرت سیماب اپنی رائے میں پختہ رہے اور یہی کہتے رہے کہ "طرح" ضروری جانی چاہیئے

حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم نے تقریباً پندرہ سال سے "بادہ و مینا" کے استعاروں کو ترک کر دیا تھا۔ غالب کی یہ رائے تھی:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مگر سیماب نے "بادہ و ساغر" کے بغیر ہی "مشاہدۂ حق" پر گفتگو کر کے دنیا کو دکھا دی۔

حضرت سیماب مرحوم نے نیاز فتحپوری مدیر "نگار" کے "مالہ وماعلیہ" کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، مگر اُن کے انتقال کے سبب یہ کام ادھورا رہ گیا، مرحوم کے شاگردوں میں جناب الم مظفر نگری اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں کاش! وہ اس طرف توجہ کر سکیں۔　　(ماہنامہ فاران اپریل ۱۹۵۱ء)

شاہد احمد دہلوی

میری شاعری اور مضمون نگاری کا آغاز اخباروں سے ہوا۔ اس کے بعد ماہنامہ عالمگیر (لاہور) اور ماہنامہ "پیشوا" (دہلی) میں میرے مضامین شائع ہونے لگے، یہ میری ادبی زندگی کا دَورِ مراہقت تھا۔ پھر سن ۱۹۳۱ء کے بعد ماہنامہ "ساقی" میں میرے کلام اور مضامین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، تو برسوں یہ رسم اور وضع جاری رہی، یہ میرے "بلوغ فکر" کا آغاز تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک دو بار میری نظمیں بعض دوسرے پرچوں میں نہ چھپ سکیں۔ میں نے "ساقی" میں اشاعت کے لیے بھیجیں تو وہ چھپ گئیں۔ شاہد احمد دہلوی سے یہی مضمون نگاری ذریعۂ تعارف تھا، مرزا یاس یگانہ لکھنوی کے رباعیوں کے مجموعہ — ترانہ — پر میرا تقریباً تیس صفحے کا تنقیدی مضمون "ساقی" میں شائع ہوا۔ شاہد صاحب نے میرے کسی مضمون میں ذرا سا بھی ردو بدل نہیں فرمایا۔ میں جو کچھ لکھ کر بھیجتا وہ لفظ بلفظ اسی طرح چھپ جاتا۔ اس چیز نے راقم الحروف میں خود اعتمادی پیدا کردی۔

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور میں حیدرآباد دکن کے دفتر معتمدی فوج میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب دفتر کے دروازے سے داخل ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر چونکا، میرے استفسار سے پہلے وہ خود ہی بول اٹھے: "میں شاہد احمد دہلوی ہوں۔"

میں تعظیم وخیر مقدم کے لیے کھڑا ہو گیا مصافحہ بلکہ معانقہ ہوا فرمانے لگے۔
"میں پہلے نظامت ٹپہ (پوسٹ ماسٹر جنرل کے آفس) پہنچا وہاں معلوم ہوا کہ آپ کی اس دفتر میں بدلی ہو گئی ہے ......"

شاہد مرحوم کی اس محبت اور خلوصِ نوازش نے مجھے بدحواس سا کر دیا تھا کہ وہ اتنی شدید بارش میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے! میں نے چپراسی کو اشارہ کیا اور

تھوڑی سی دیر میں دو پلیٹ بالائی دو کلیجے اور چائے کی دو پیالیاں ہوٹل سے آگئیں۔ اس تواضع پر میری خاموشی زبانِ حال سے عرض کر رہی تھی ؎ چہ کنند بے نوا ہمیں دارد

مشہور ادیب سیّد وزیر حسن صاحب کے یہاں شاہد صاحب نے قیام فرمایا بازدید کے لیے میں وہاں گیا۔ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی! خط و کتابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں سینکڑوں خط لکھے ہوں گے۔

غالباً ۱۹۳۵ء میں اُن کا کرم نامہ آیا جس طرح مشاعروں میں غزل کہنے کے لیے طرحی مصرعے شاعروں کو دیئے جاتے۔ اسی انداز پر شاہد صاحب نے افسانہ کا ایک پلاٹ بھیجا اور دعوت دی کہ "آپ اس پر افسانہ لکھیں"! میں نے جواب دیا کہ مجھے افسانہ نگاری کی زیادہ مشق نہیں ہے، آپ نے جن مشاق اور مشہور افسانہ نگاروں کو اس "طرحی افسانہ" کے لیے منتخب کیا ہے، ان میں آپ کی نگاہِ انتخاب ہیچداں پر کس طرح پڑی ؟ شاہد احمد مرحوم نے جواب میں لکھا کہ آپ افسانہ لکھ سکتے ہیں، آپ کو افسانہ لکھنا ہوگا۔ چنانچہ ان کی فرمائش اور اصرار پر میں نے افسانہ لکھا اور اُس دَور کے مشاہیر افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ساتھ میرا افسانہ بھی "ساقی" میں شائع ہوا۔

اسی زمانہ (سنہ ۱۹۳۶ء) کا ایک واقعہ ہے کہ جن دنوں حیدرآباد دکن میں میرا قیام تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنی سائیکل پر چادر گھاٹ کے پُل کے قریب سے گزر رہا تھا، حیران خیر آبادی مرحوم سائیکل کے پیچھے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے، پولیس کے سپاہی نے ایک سائیکل پر دو آدمیوں کو سوار دیکھ کر ہاتھ کا اشارہ کیا میں نے سائیکل روک لی۔ اس نے کہا کہ تم دونوں کو تھانے چلنا ہوگا۔ میں نے کہا بھئی! جیسی چاہے قسم لے لو، ہمیں اس قانون کی خبر نہ تھی کہ دو آدمیوں کا ایک سائیکل پر سوار ہونا جرم ہے۔ کانسٹیبل نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو کیا خود راقم الحروف کو اس وقت مجموعہ تعزیرات کی پہلی دفعہ کا کہاں علم تھا۔ (Ignorance of Law is no excuse) (قانون سے لاعلمی حجت نہیں ہے)

میں نے اور حیران مرحوم نے سپاہی کی بہت کچھ خوشامد کی، مگر اس کا دل کسی طرح نہ پسیجا، ہاں! اس کی مٹھی گرم کر دیتے تو اس مخمصے سے ہمیں نجات مل جاتی مگر ہم دونوں

شاعر قلاش تھے، دونوں کی جیبوں میں بہت سے بہت چند آنے ہوں گے! ــــــ خیر صاحب! وہ سپاہی ہم دونوں کو لیے ہوئے، چنچل گوڑہ کے پولیس اسٹیشن پہنچا، سب انسپکٹر صاحب کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا، انھوں نے حکم دیا کہ چالان مرتب کیا جائے، تھانہ کے دیوان نے ایک چھپا ہوا فارم پر کیا ہم دونوں کے نام، ولدیت، عمر اور پتے لکھے گئے۔ یہ چالان جب امین صاحب پولیس سب انسپکٹر کے سامنے لایا گیا، تو وہ چونک کر بولے:

"ایں...... آپ ماہر القادری ہیں۔"

میں نے لجاجت آمیز انداز میں کہا ـــــ "جی ہاں!......"

میرے منہ سے "ہاں" سن کر انھوں نے وہ چالان چاک کر دیا، اور فرمانے لگے: "آپ نے آتے ہی اپنا نام کیوں نہیں بتا دیا۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔ انہوں نے گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جوڑ دیا، بولے:

"میرا نام مبشر ہے، میں شاہد احمد دہلوی کا بھائی ہوں۔ آپ کے مضامین "ساقی" میں پڑھتا رہتا ہوں ......اور......"

شاہد احمد دہلوی اور ان کے رسالہ "ساقی" کے اس تعارف نے بڑی کرامت دکھائی، ورنہ اس جرم میں "جرمانہ" دے کر پیچھا چھوٹتا، اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات عدالت کی حاضری اور پیشی کا معاملہ تھا۔

سنہ ۴۲ء اور سنہ ۴۳ء کے بعد "ساقی" سے قلمی تعلق قطع سا ہو گیا، اس کا سبب خود مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا اور جہاں تک شاہد احمد کی ذات کا تعلق ہے ان سے دلی میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی مگر ؎

سبک سرین کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں ہو

پاکستان بننے کے بعد وہ بھی کراچی چلے آئے اور راقم الحروف نے بھی اسی شہر کا رخ کیا! یہاں "انجمن ادبی رسائل" کی بدولت مرحوم سے جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ اب سے چھ سات سال قبل لاہور میں اس انجمن کا سالانہ اجلاس تھا، اس میں شریک ہونے کے لیے ہم ممبروں کی پوری ٹیم نے ریل کے ایک ہی ڈبہ میں سفر کیا، اور

ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے، اس طرح کئی دن شاہد احمد مرحوم کا ساتھ رہا۔

کراچی کے "ساقی" میں میرے دو تین مضامین اور ایک دو غزلیں شائع ہوئیں۔ "جوش نمبر" کے مضمون کے لیے انھوں نے ٹیلیفون پر خود تقاضا کیا۔ دو چار مہینہ کے بعد کسی نہ کسی تقریب میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا، خاصے تپاک سے ملتے، کبھی کبھار ہنسی دل لگی کا کوئی ہلکا پھلکا فقرہ بھی اُن کی زبان سے سننے میں آتا، ان کی کاٹھی اچھی تھی، چہرے سے وہ ساٹھ سال کے نہیں لگتے تھے، دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ اچھے ہو گئے، چلنے پھرنے لگے، مگر ۲۷ اور ۲۸ مئی کی درمیانی شب میں کھانا کھانے کے بعد ریڈیو سنا، پھر وہ گھٹن اور بے آرامی محسوس کرنے لگے، اسی دوران میں کھانسی آئی تھوڑی سی دیر میں حالت غیر ہو گئی —— اور پھر دُنیوی زندگی کا ڈراپ سین! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

اُن کے دادا ڈپٹی نذیر احمد ریاست حیدرآباد دکن میں صوبیدار تھے اور اخراجات کے معاملے میں بڑے محتاط اور جزرس! انھوں نے بہت کچھ دولت چھوڑی، اُن کے بعد اُن کے اکلوتے بیٹے اور شاہد مرحوم کے والد بشیر الدین احمد برسوں حیدرآباد میں اوّل تعلقدار (کلکٹر) رہے۔ دو پشتوں کا اندوختہ اور ہزاروں کی سکنی جائداد اس خاندان کو ورثہ میں ملی۔ شاہد صاحب نے دہلی میں بڑی بے فکری کی زندگی گزاری! مکانوں کا اتنا کرایہ مل جاتا تھا جو اُن کے اخراجات کے لیے کافی تھا۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود ان کا خیال تک ملازمت کی طرف نہیں گیا، آزاد رہ کر زبان وادب کی خدمت انجام دی، کتنے بہت سے مشہور ادیب، افسانہ نگار، اور اہلِ قلم ہیں جن کو رسالہ "ساقی" نے چمکایا اور اسی افق سے اُن کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی بڑی بے سروسامانی کے عالم میں آئے۔ یہ انھی کی ہمت اور دل گردہ تھا کہ اس قدر ناسازگار حالات میں "ساقی" یہاں سے نکالا، اور اس کے ساتھ معیار کو گرنے نہیں دیا۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم کو زبان وادب کے ساتھ موسیقی سے بھی غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ برسوں اس فن میں ریاض کیا۔ جہاں تک خالص فن کا تعلق ہے راگ راگنی کو اُن کی برابر جاننے والے پاکستان اور ہندوستان میں مشکل ہی سے چند لوگ

نکلیں گے، یہی فن جو انھوں نے پیشہ کے طور پر نہیں، شوقیہ سیکھا تھا، پاکستان میں ان کی روزی کا خاصہ ذریعہ بن گیا۔ ریڈیو پاکستان میں وہ شعبہ موسیقی کے ہدایت کار تھے چار سو یا پانسو ماہوار اس کا معاوضہ ملتا تھا۔ تھائی لینڈ میں اُن کو ایک ماہرِ فن کی حیثیت ہی سے بلایا گیا۔ فنی معلومات کے ساتھ آواز میں سوز گلے میں نور اور لہجہ میں دلکشی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ عبدالکریم خاں اور بڑے غلام علی خاں جیسے نامور موسیقاروں کی صف میں اُن کا شمار ہوتا۔

تقسیم ہند سے قبل شاہد احمد مرحوم کے "ترجمے" تو ضرور شائع ہوئے ہیں مگر اُردو مضامین شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں اُن کی انشاء پردازی کے جوہر تو پاکستان میں آکر کھلے، ان کے قلم سے بڑی جاندار اور باوقار تحریریں نکلی ہیں جن میں زبان کا رچاؤ، محاوروں کی برجستگی، بیان و اظہار کا حسن اور نفسیاتِ کردار کی عکاسی پائی جاتی ہے!
ان کی ادبی شہرت اور شخصیت سے حکومت پاکستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، ان کو صدر ایوارڈ ملا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ زندہ رہتے تو اور زیادہ قدر افزائی ہوتی مگر وہ جسے ـــــ "بے فکری" اور آسائش کہتے ہیں انھیں میسر نہ آسکی! اتنا مشہور ادیب کراچی کی سڑکوں پر بس کے انتظار میں پہروں کھڑا رہتا۔ ذاتی مکان بنوا لیا تھا مگر وہ بس گزر بسر کے قابل تھا، اُن کا بچپن خاصے ناز و نعم میں بسر ہوا، تقسیم ہند سے قبل دلی کی زندگی کا زمانہ بھی خوشحالی اور بے فکری میں گزرا مگر پاکستان آ کر کے بعد آذوقہ حیات کے لیے انہیں خاصی جد و جہد کرنا پڑی۔ کثیر العیال بھی تھے لیکن ان کی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے عزیزوں اور دوستوں تک کو اُن کے حالات کی خبر نہ ہوتی۔ حالات سازگار ہوتے تو اُن کی بیگم صاحبہ کو کالج میں معلمی کی مشقت کاہے کو اٹھانی پڑتی۔
شعر کے معاملہ میں شاہد احمد دہلوی کا ذوق پکے راگ سے ملتا جلتا تھا اس لیے ساقی کا حصہ نظم، نثر کے مقابلہ میں کمزور رہا۔ لباس خالص مشرقی پہنتے، میں نے انہیں کبھی کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا، جلسوں میں جہاں جگہ مل بیٹھ جاتے نمایاں ہونے اور پیش پیش رہنے کی کوشش نہ کرتے، چہرے پر شگفتگی سے زیادہ فکرمندی کے آثار دکھائی دیتے تھے، وہ فطرتاً کم آمیز بھی تھے! ـــــ ان کے جنازے میں اہلِ قلم اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی، سب سوگوار اور غمزدہ تھے مگر اس کو کیا کیجیے کہ

سحر کاری تری اے عالمِ فانی دیکھی گھر تک آئے اثر گورِ غریباں نہ رہا

ـــــــــ (ماہنامہ فاران، جون ۱۹۶۷ء)

شادؔ عارفی

شادؔ عارفی سے اُن کی غزلوں اور نظموں کے واسطہ سے غائبانہ تعارف تو برسوں سے تھا مگر اُن سے ملاقات (غالباً) سنہ۱۹۲۲ء میں رام پور میں ہوئی۔ اس کے بعد اپنے ایک عزیز سے ملنے اور مشاعروں کے سلسلہ میں رام پور بارہا جانا ہوا، ایک بار ایک مہینہ سے بھی زیادہ دن تک قیام رہا! رام پور کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شادؔ عارفی کو نہیں دیکھا، جب بھی دریافت کیا معلوم ہوا وہ شکار کھیلنے گئے ہیں!

رام پور کا ذکر چھڑا ہے تو وہاں کے ایک مشاعرے کا مختصر حال بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، رام پور میں سال کے سال بڑی دھوم کی نمائش ہوتی تھی اور دوسری تفریحات اور دلچسپیوں کے پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل تھا، ۱۹۴۵ء میں مجھے بھی نمائش کے مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا، حضرت جگر مرادآبادی مرحوم بھی ..... اس بزم سخن کو رونق اور عزت بخش رہے تھے، پنڈال کے سامنے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا، معلوم ہوا کہ اس میں ہرہائی نس بیگم صاحبہ نواب رام پور تشریف فرما ہیں۔ میں نے ایک غزل پڑھی اس کے بعد دوسری غزل کا مطالبہ ہوا اور پھر یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا، میں پڑھ چکا تو ایک صاحب تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ آپ اپنی غزل لکھ دیں، ہرہائی نس کی فرمائش ہے (پوری طرح یاد نہیں رہا کہ "فرمائش" کہا تھا یا ارشاد یا حکم) میں نے غزل لکھ دی جس کے چند شعر تھے ــــــــــ

رحمت کو اُن کی جوش میں لانے کی دیر ہے
یعنی سرِ نیاز جھکانے کی دیر ہے

پروانے آہی جائیں گے کچھ کر یہ جبرِ عشق
محفل میں فقط شمع جلانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطربِ بہار
سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

میری لکھی ہوئی غزل لے جانے کے بعد وہ صاحب پھر آئے اور کہنے لگے ہرہائی نس

نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس غزل کا مقطع آپ نے نہیں لکھا میں نے کہا کہ مقطع مجھے یاد نہیں رہا، اپنی اس غزل کا مقطع مجھے یاد تھا مگر ایک ریاست میں جہاں کے فرماں روا کی بیگم صاحبہ تنہا خیمہ میں تشریف فرما ہوں وہاں غزل کا ایسا مقطع ——

چلمن کی بندشوں میں وہ شاید نہ رُک سکیں

ماہرؔ کے صرف شعر سنانے کی دیر ہے

پڑھنا اور پھر اسے لکھ کر خود مہارانی صاحبہ کو دینا نامناسب اور احتیاط کے خلاف تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ پہلی ملاقات کے بعد شاد عارفی سے ایک بار اور بھی ملنا ہوا مگر یہ دونوں ملاقاتیں سرسری سی رہیں، اب سے ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے کہ ان کا خط میرے نام آیا، جس میں رام پور کے کسی ادارے یا لائبریری کے لیے سفارش کی تھی کہ "فاران" اعزازی طور پر جاری کر دیا جائے، چنانچہ اُن کے ارشاد کی تعمیل کر دی گئی، پھر انہوں نے ایک ہندو شاعر کا مجموعہ کلام تبصرے کے لیے بھجوایا۔ اس کے بعد اپنی ایک غزل عنایت کی، میں نے غزل کی رسید بھیجتے ہوئے لکھا کہ اس نوازش بے طلب کا شکر گزار ہوں، اُن کی یہ غزل "فاران" میں چھپ گئی، تو شاد عارفی مرحوم نے تین غزلیں اور بھیجیں ان کا انتخاب "فاران" میں شائع ہوا، اس پر وہ کبیدہ خاطر ہو گئے اور میری ایک نظم پر جو ماہنامہ "جام نو" (کراچی) میں چھپی تھی، ایک تنقیدی مضمون لکھ کر بھیجا، مسٹر مظہر خیری ایڈیٹر "جام نو" نے شاد صاحب کے اس مضمون کا ایک دعوت میں ذکر کیا میں نے کہا آپ وہ مضمون مجھے دے دیں میں اسے پڑھ کر اپنے معروضات پیش کردوں گا، آپ پھر وہ تنقید اور میرا جواب دونوں چیزیں اپنے رسالہ میں شائع کردیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔

شاد عارفی سے مل کر اُن کی وضع قطع اور چہرہ مہرہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ معاشرے اور ماحول سے اُنہیں خاصی تلخیاں ناخوشگواریاں اور چوٹیں ملی ہیں اس لیے سوسائٹی سے بیزاری کی کیفیت ان میں پیدا ہو گئی ہے اور اُن کا یہ حال ہے ——

از دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست

یہی چیز ان کی شاعری میں بھی جھلکتی ہے۔

شاد عارفی نے نظم اور غزل میں کوئی شک نہیں اپنا منفرد آہنگ پیدا کیا، اُن کی بعض

نظموں میں گرد وپیش اور گھریلو ماحول کی بڑے سلیقہ کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔ اُن کی شاعری روایتی نہیں بلکہ اُن کے حالات و واردات کی بہت کچھ ترجمان معلوم ہوتی ہے کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دلی جذبات کی آگ جوں کی توں شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہے! افسوس ہے زمانہ نے ان کی قدر نہیں کی، شاعرانہ شہرت سے بھی اُن کو کوئی مادّی فائدہ نہیں پہنچا، اُن کے مرجانے سے کوئی شک نہیں شعروادب کی فضا میں خلا پیدا ہو گیا، شاد عارفی کے افکار نے اردو شاعری کو جو کچھ دیا ہے، اربابِ نقد و نظر کو اس کا اعتراف اور اظہار کرنا چاہیے۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۶۴ء)

شاہد صدیقی

مولانا حمید الدین قمر فاروقی، جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے دیوبند میں ہم جماعت اور ہم سبق رہ چکے ہیں، اور آج کل حیدرآباد دکن میں جمعیۃ العلماء کے صدر ہیں۔ انھوں نے اردو فارسی اور عربی کے امتحانات کی تیاری کے لیے "ادارہ شرقیہ" قائم کیا تھا جس نے دکن میں برسوں مشرقی علوم کی خدمت انجام دی ہے، اس ادارے میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے، جن دنوں پتھر گٹی کے بنی خانہ میں ادارۂ شرقیہ قائم تھا تو وہاں شب میں مشاعرہ ہوا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے، چند شعراء اپنا کلام سنا چکے تو شاہد صدیقی اکبرآبادی کا نام اس تعارف کے ساتھ پکارا گیا کہ ابھی حال ہی میں اکبرآباد آگرہ سے تشریف لائے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر بہت سے بہت بیس سال کی ہوگی، ململجی شیروانی پہنے تھے جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے چہرہ مہرہ نہ وجیہہ تھا اور نہ حسین! وہ اسٹیج پر آئے تو سننے والوں نے ان کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا، مگر جب انھوں نے رباعی پڑھی، تو لوگ چونک پڑے۔ انھوں نے سامعین کے اصرار پر متعدد رباعیاں اور غزلیں سنائیں! حیدرآباد دکن میں یہ ان کا پہلا تعارف تھا! اس کے بعد وہ مشاعروں، دعوتوں اور ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔

حیدرآباد دکن سے ہفتہ وار اخبار "الاعظم" نکلتا تھا، کچھ دنوں بعد اس کی ادارت شاہد صدیقی سے متعلق ہو گئی۔ سستے کا زمانہ تھا تھوڑی سی تنخواہ میں بھی کام چل جاتا تھا۔ فراغت میسر نہ سہی، آدمی ننگا بھوکا نہ رہتا تھا۔

وہ جو علامہ اقبال نے "جگنو" کی تعریف میں کہا ہے کہ ؎

غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تو دکن کی سرزمین نے نہ جانے کتنے گمنام غربت زدوں کو چمکا دیا اور نامور بنا دیا،

شاہد صدیقی مرحوم کو بھی دکن ہی میں شہرت ملی، انھوں نے بھی سرزمین دکن کے ساتھ دوستی، وفاداری اور احسان مندی کا حق ادا کر دیا کہ اُسی زمین کا پیوند ہو کر رہ گئے! اور جہاں امیرؔ، داغؔ، جلیلؔ اور فانیؔ محوِ خواب ہیں، اُسی خطہ میں وہ بھی قیامت کی نیند سو گئے۔

بلدہ حیدرآباد میں شاہد صدیقی سے یوں تو ملنا جلنا رہتا ہی تھا، مگر زیادہ بے تکلفی، اُس زمانے میں ہوئی، جب نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں آنا جانا ہوا، نواب معظم جاہ کے یہاں مجھے بلانے کے لیے پہلے دن شاہد صدیقی ہی آئے تھے اور اُن کے ہمراہ آفتاب علی تھے جو معظم جاہ کے دربار کے خاص آدمی تھے۔ اس دربار سے شاہد صدیقی کا تعلق ٹوٹتا اور جڑتا رہتا، کبھی معتوب، کبھی محبوب! سعدی شیرازی نے تجربہ کے بعد ہی فرمایا ہے ——— "آواز کودکاں وطبع پادشاہاں اعتبار ندارد۔"

زمانہ گزرتا گیا، شاہد صدیقی کی شاعری کی شہرت ہوتی گئی، کلام میں ترقی اور مسلسل ترقی، یہاں تک کہ شعر وادب کی دنیا میں اُن کی ایک حیثیت قائم ہو گئی، جس کا دوست دشمن ہر کوئی معترف تھا۔

پاکستان میں وہ صرف ایک بار آئے، یہاں اُن کی خاصی پذیرائی ہوئی مگر زندگی کا رنگ مجازؔ لکھنوی جیسا تھا، رات کا وقت ہے اور وہ سڑکوں پر مست و سرشار پھیر رہے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ امتیاز اور محبوبیت تو جگرؔ مرادآبادی مرحوم ہی کو حاصل تھی کہ لوگوں نے برسوں اُن کی رندی و سرشاری کو گوارا کیا ہے، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جگرؔ اس چکر سے ہمیشہ کے لیے نکل گئے۔

کراچی میں شاہد صدیقی کا قیام اور زیادہ تر اٹھنا بیٹھنا حسرتؔ ترمذی[1] کے فلیٹ میں رہتا، جو اُن دنوں پاکستانی حکومت میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے! ہم تینوں کبھی کبھار شطرنج بھی کھیلتے، اور خوب مزے مزے کی باتیں رہتیں۔

اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق کہیے کہ چار سال کے عرصے میں شاہد صدیقی سے تین بار

---

[1] بڑے اچھے غزل گو ہیں مگر کراچی میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے دو شعر ؎

رہائی کی تمنا کرنے والا ۔۔۔ اسیرِ آشیاں ہے اور کیا ہے

کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں ۔۔۔ اے شامِ بیکسی مری محفل تو دیکھنا

بمبئی کے مشاعروں میں ملاقات رہی، ایک دن میں نخشب جارچوی کے یہاں اس حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ بال بکھرے ہوئے تھے، اور کرتہ اور پاجامہ خوب شکن آلود، شاہد صدیقی مجھ سے بولے کہ اسی ہیئت کے ساتھ تمہاری تصویر کھنچوائی جائے گی، میں نے انکار کیا، باتوں باتوں میں ٹالنا چاہا، مگر وہ بضد ہوئے۔ آخر کار ہم تینوں کا گروپ فوٹو کھنچا اور عجیب اتفاق ہے کہ میں نے کوئی تصویر اور فوٹو گروپ سینت کر نہیں رکھا، مگر شاہد صدیقی کی دی ہوئی یہ نشانی میرے پاس نہ جانے کیسے رہ گئی؟

اُن سے آخری بار ملاقات فروری ۱۹۶۱ء میں ہوئی، بمبئی میں "جشن شاعر" کے سلسلے میں "پاک و ہند مشاعرہ" اور ادبی مذاکرہ بھی تھی، مذاکرہ میں جن ادیبوں کو مقالے پڑھنے تھے، اُن میں میرا نام نہ تھا، مگر شاہد صدیقی کی تحریک پر میں نے تقریر کی اور کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں، اُن کے ادبی نظریوں کا تجزیہ کیا، اس پر علی سردار جعفری[1] نے فرمایا:

"...... جس طرح آپ نے مسلمانوں کے بہتر (۷۲) فرقوں کو گوارا کر لیا ہے، اس طرح ہم کمیونسٹوں کو بھی گوارا کر لیجیے —!"

"جشن شاعر" کے دوسرے یا تیسرے دن میں کرافٹ مارکیٹ کے سامنے کھڑا تھا، دور سے مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی آتے ہوئے نظر آئے، آمنا سامنا ہوا، کچھ وہ بڑھے کچھ میں بڑھا، میں نے کہا کہ چلو سامنے کے ریسٹوران میں چلئے یا کافی پئیں گے! چائے پیتے ہوئے میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ کیا پروگرام ہے، بولے جھانسی میں مشاعرہ ہے، وہاں جانا ہے، میں نے مخدوم محی الدین سے کہا کہ تمہارا نام "محی الدین" ہے، تمہیں تو دین اسلام کی خدمت کرنی چاہیے! مخدوم محی الدین ہنس کر بولے:-

"ہم اسلام ہی کی خدمت کر رہے ہیں۔"

شاہد صدیقی مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اب سے بیس پچیس دن پہلے اُن کے انتقال کی خبر اخبار "جنگ" میں پڑھی تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا! بہادر یار جنگ اسکول (کراچی) میں تین چار دن کے بعد تعزیتی جلسہ ہوا، حمیدالدین شاہد

---

[1] مشہور کمیونسٹ لیڈر اور شاعر

اور ابراہیم جلیس نے شاہد کی شاعری اور اُن کی شخصیت پر مقالے پڑھے۔ دو تین تقریریں بھی ہوئیں، نظر حیدر آبادی نے نظم سنائی، میں نے آخر میں صدارتی تقریر میں اپنے تاثرات پیش کیے ——— سامعین پر سکوتِ غم کا عالم چھایا ہوا تھا، شاہد مرحوم کے بڑے بھائی صابر القادری جلسہ کے آغاز سے لے کر ختم ہونے تک روتے رہے۔ بھائی قوتِ بازو ہوتا ہے، اور اپنے بازو کے ٹوٹ جانے کا کس کو غم نہیں ہوتا۔

حضرت جگر مراد آبادی، جو اپنے دور میں غزل کے امام تھے، شاہد کی غزل گوئی کے معترف اور ثناخواں تھے! افسوس! وہ اپنی شہرت کے شباب کی بہاریں پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمیشہ کے لیے اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں — اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۲ء)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

ذرا سی کنکری پانی میں ڈوبتی ہے تو سطحِ آب میں بھنور سا پڑ جاتا ہے، ہلکے پھلکے تنکے ہوا میں منتشر ہوتے ہیں تو فضا بے چین ہو جاتی ہے ——— علم و عمل کا آفتاب جب غروب ہو تو افق روشن و تابناک کیسے رہ سکتی ہے اُسے دھندلا اور تاریک ہو جانا ہی چاہیے، مبالغہ نہیں حقیقت! اور واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت دُنیائے اسلام کے افق پر سورج بن کر چمک رہی تھی جس کے ڈوبتے ہی افق پر اندھیرا سا چھا گیا، جہاں روشنی تھی وہاں تاریکی دیکھی اور محسوس کی گئی ——— المیہ، حُزنیہ، ٹریجڈی، جب آنکھیں خشک ہوتی ہیں اور دل غم کی شبنم افشانی کرتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ سورج ڈوب گیا، فضا تاریک ہو گئی اور علم و حکمت کا چراغ بجھ گیا ——— مگر اب کہتا ہوں اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ سورج چمک رہا ہے، چراغ جل رہا ہے، شمع روشن ہے اور اُجالا پھیلا ہوا ہے، "شبیر احمد" گوشت پوست کے ایک مجسمہ اور ایک پیکر کا نہیں ایک اصولِ حیات، ایک زاویۂ فکر اور ایک پیامِ زندگی کا نام تھا جسدِ خاکی ہمارے درمیان سے اٹھا لیا گیا کہ یہ قانونِ فطرت ہے مگر جلنے والے کا پیام زندہ اور پایندہ ہے، زندگی کی شاہراہ میں اس کے نقشِ پا صاف نظر آ رہے ہیں اُس کے فکر و عمل کی شمع بدستور روشن ہے ——— یہ پیام، یہ شاہراہ یہ شمع .....کیا تھی ——— "اسلام" اور یہ وہ شمع ہے جسے افراد کیا قوموں کی موت کے سانحے بھی گُل نہیں کر سکتے، یہ چراغ جو صبحِ ازل میں روشن ہوا تھا شامِ ابد تک جلتا رہے گا۔

آج کی دنیا میں عالموں کی کمی نہیں ہے، کالجوں، درسگاہوں، دارالعلوموں اور یونیورسٹیوں نے "علاماؤں" اور "ڈاکٹروں" کی جنسِ گرانمایہ کو بہت ارزاں کر دیا ہے مگر ان میں کتنے ہیں جو ڈگریوں اور لقب و خطاب کی اضافتوں کے ساتھ علمی بصیرت

بھی رکھتے ہیں، اور پھر اُن کا عمل اُن کے علم سے ہم آہنگ بھی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی سعادت سے نوازا تھا اور یہ سعادت ان کے کردار اور زندگی کی زبان سے بولتی سنی گئی۔

شیخ الاسلام علم و فضیلت کے اُس بلند مقام پر فائز تھے جہاں امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی عباؤں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، انہوں نے کم و بیش چالیس سال بوریے پر بیٹھ کر علم دین کا درس دیا اور سینکڑوں تشنگان علم و ادب کو نہ صرف سیراب کیا بلکہ اس قابل بنا دیا کہ وہ خود دوسروں کی پیاس بجھا سکیں۔ قرآن مقدس کے ترجمہ پر شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حواشی اور فوائد پڑھ کر علامہ ابن کثیر کی قرآنی بصیرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ صحیح مسلم شریف کی شرح (عربی) میں امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے فہم حدیث کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور "العقل والنقل" سے امام غزالیؒ کی اسلامی فلسفیانہ فکر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ——— علامہ مرحوم نے نہایت قوی حافظہ پایا تھا، اس پیرانہ سالی میں بھی تمام علوم مستحضر تھے کوئی علمی تذکرہ چھڑ جاتا تو گفتگو میں کتابوں کا حوالہ دیتے جاتے، اس تمام علم و فضل کے باوجود طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔ جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز جگہ پر بیٹھتے تو فرطِ تواضع سے گردن جھکا لیتے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا اندازِ تقریر بے حد دل نشین اور اثر انگیز تھا، "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت اُن کی تقریر میں ہر سننے والے کو محسوس ہوتی، سادہ سادہ باتیں، بناوٹ، تکلف اور آورد سے دُور! داد و ستائش حاصل کرنے کے لیے سامعین کے جذبات سے وہ نہ کھیلتے، شروع سے آخر تک تقریر میں وقار و متانت کا سلسلہ قائم رہتا، اکبر الٰہ آبادی کے اشعار نہایت سلیقہ کے ساتھ استعمال فرماتے، اور اُن کی باریکیوں اور حکیمانہ نکتوں کی شرح بھی کرتے جاتے، علامہ کی تقریریں اگر منضبط کر لی جاتیں تو علم و ادب کا یہ بہت بڑا سرمایہ ہوتا ——— حکومت آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم کے اعزاز میں موتمر عالم اسلامی نے نہایت شاندار پارٹی کا اہتمام کیا، حضرت علامہ سے بھی حاضرین نے تقریر کے لیے کہا، آپ نے کھڑے ہو کر مختصر سی تقریر کی ——— مگر نہایت جامع اور کارآمد۔ فرمایا:-

"ہم کشمیر کی گتھی کو پُر امن طریقہ پر سلجھانا چاہتے ہیں مگر یہ بھی یاد رہے کہ جب گرہ کسی طرح کھل ہی نہیں پاتی تو پھر اُسے کاٹ دینا پڑتا ہے۔"

آرام باغ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے یہ جملے اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:

"اگر حکومت مجھ پر زر و جواہر کی بارش کر دے تو بھی میں کسی خلاف اسلام فعل میں اُس کی ذرہ برابر تائید نہ کروں گا اور اگر پبلک میرا منہ کالا کرکے اور گدھے پر چڑھا کر شہر کی گلیوں میں میری تشہیر کرے تو اُس وقت بھی حق و صداقت کی راہ سے نہ ہٹوں گا ــــ"

علامہ مرحوم کے رہنے سہنے کا انداز سادہ اور تکلفات سے دُور تھا، معمولی لباس پہنتے، ان کی سج دھج میں کوئی امتیازی شان نہ پائی جاتی تھی، طبیعت متواضع تھی، فراستِ مومن بھی اللہ نے اُن کو بخشی تھی اور ساتھ ہی حرم کعبہ کے کبوتر کی طرح بھولے بھالے بھی تھے، اس بھولے پن سے بعض اہلِ غرض جا و بیجا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے، ان کی ذات سے لوگوں کو دین ہی کا نہیں دُنیا کا فائدہ بھی پہنچتا رہا، کوئی اپنی پریشانی ظاہر کرتا تو اس کی داستانِ غم سُن کر ہر ممکن امداد کے لیے تیار ہو جاتے ــــ اپنے ذاتی معاملات اور ضرورتوں کے لیے محتاط اور انتہائی غیور و خود دار مگر دوسروں کی امداد و اعانت کے واسطے کشادہ دست، یہاں تک کہ عہدیداروں کے یہاں جا کر سفارش کرنے سے بھی گریز نہ فرماتے۔

بہاولپور کا سفر علامہ مرحوم کا آخری سفر تھا، بہاولپور تشریف لے جانے سے دو تین دن پہلے میں علامہ عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت امیر مینائی کے پوتے تسنیم مینائی میرے ساتھ تھے، صبح کے کوئی نو بجے ہوں گے، حسب دستور بڑے تپاک اور محبت کے ساتھ ملے، تسنیم صاحب سے نواب اختیار جنگ بہادر مرحوم (سابق ناظم امورِ مذہبی حکومت دکن) کے بعض اعزا کا حال پوچھتے رہے، اور مجھ سے دریافت فرمایا ــــ "آپ کے رسالے "فاران" کا کیا حال ہے؟" میں نے دبے دبے لفظوں میں سرسری کیفیت بیان کی، قدرے متاثر ہو کر بولے ــــ "آج کل تو تصویروں والے پرچوں کی مانگ ہے۔" بات کرتے میں زبان لڑکھڑاتی رہی، فالج

کا اثر زبان اور تیوروں سے نمایاں تھا، مگر ہونٹوں پر بار بار مسکراہٹ بکھر بکھر جاتی چہرہ شاداب تھا لیکن اس شادابی کے چہرے کے سے پژمردگی بھی جھانک رہی تھی۔

علامہ عثمانیؒ سے مجھ گنہگار کی یہ آخری ملاقات تھی، جو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی، آہ! چلتے وقت گرمجوشی کے ساتھ وہ مصافحہ! جیسے کوئی کسی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہا ہو، اُس وقت اس کا سان گمان بھی نہ تھا، مگر اب سوچتا ہوں تو وہ سماں ایک ہونے والے واقعہ کی پیش گوئی کی صورت میں نظر آتا ہے ـــــ جسے چند دن پہلے چلتا پھرتا اور بولتا چالتا دیکھا تھا پھر اُس کے جنازے کو ہزاروں آدمیوں کے ہجوم میں دیکھا، تابوت کو کاندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد قبولِ عام، عقیدت، وابستگی اور ہر دلعزیزی کو اور بڑھا دیا، اسی نسبت سے آخرت میں بھی درجات میں ترقی اور بلندی نصیب ہوگی، اور شہیدوں کی طرح قربِ حق کے باغوں اور آبشاروں سے رزق دیا جائے گا اور سیراب کیا جائے گا۔

شیخ الاسلام مرحوم جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی اسیری سے بہت ملول اور متاثر تھے، مولانا مودودیؒ کی گرفتاری پر علامہ عثمانیؒ نے اخبارات کو بیان بھی دیا تھا، مولانا مودودیؒ کے دینی کارناموں کے وہ بہت مداح تھے، علامہ مرحوم، جناب مودودیؒ کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے تاکہ دینِ حق کی وہ کھل کر خدمت کر سکیں، اور "(سچائی کی) تلوار[۱] نیام میں نہ رہے۔" ـــــ شیخ الاسلام کی یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

اگر حکومت پاکستان اپنے فرائض کو پہچانے اور مولانا مودودیؒ اور اُن کے رفقاء کو رہا کر دے تو اس کا یہ فعل یقیناً شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کی روح کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

علامہ عثمانی کی دینی اور قومی خدمات جلیل القدر ہیں، پاکستان کی تعمیر میں وہ قائد اعظم مرحوم کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو "قرارداد مقاصد" کی منظوری کا جو شرف اور سعادت حاصل ہوئی علامہ مرحوم کے فکر و عمل کی بہت کچھ کارفرمائی تھی، پاکستان کو قرآن و سنت کی بنیاد اور منہاج پر "اسلامی حکومت" بنانا علامہ عثمانی

---

[۱] علامہ عثمانی کے اخباری بیان کے الفاظ۔

کا مقصدِ حیات تھا۔ وہ اسی مقصد کے لیے جی رہے تھے کہ اتنے میں جان آفریں کے یہاں سے بلاوا آن پہنچا "اے میرے نیک بندے۔ اپنا کام دوسروں کو سونپ کر ہمارے یہاں چلا آ۔"

اب یہ ہم سب کا فرض ہے کہ علامہ مرحوم کے مقصد کے حصول کے لیے جو حقیقت میں اسلام کا مقصد ہے جدوجہد کریں، حکومتِ پاکستان کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر اللہ کے مطیع اور فرماں بردار بندے بن جائیں، ارباب حکومت کے اعمال پر ہمیں نکتہ چینی کرنے کا یقیناً حق حاصل ہے لیکن ہمیں دوسروں کے دامنوں کے دھبے دیکھنے سے پہلے اپنے گریبانوں پر بھی تو ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسیحا نفسی کے دعوے دار خود ہی بیماری میں مبتلا ہوں۔

بعض لوگ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام ارباب حکومت کو ٹوکتے رہتے تھے اور اُن کی ذات سیاست اور مذہب کے درمیان "مرکزِ ثقل" کی حیثیت رکھتی تھی، اُن کے بعد ڈھیل اور بے پروائی پیدا ہو جائے گی —— ہماری تمنا ہے کہ اہل اقتدار لوگوں کے اس اندیشہ کو اپنے عمل سے غلط ثابت کریں اور بتا دیں کہ شیخ الاسلام کے سانحہ وفات نے اُن کے دلوں میں خدا کا خوف اور ذمہ داری کا احساس پہلے سے بہت زیادہ کر دیا اور حکومت پاکستان کو دنیا کے اس اندھیرے میں "شمع ہدایت" بن کر جلوہ آرا ہونا ہے یہاں تک کہ لندن اور واشنگٹن کے فلک بوس قصر اور ماسکو کے ایوان حکومت سچائی کے نور سے جگمگانے لگیں اور پریشان حال مخلوق کو امن و عافیت کی زندگی میسر آ سکے۔ اسلام اور صرف اسلام ہی کی وحدت دنیا کے انتشار اور پراگندگی کو دُور کر سکتی ہے۔

شیخ الاسلامؒ اس دنیا سے چلے گئے، فنا جوہرِ جان "نفس" کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔ اُس کی دست بُرد سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ ہم جو آج جی رہے ہیں ہم پر بھی یہی گھڑی آنے والی ہے، شہرتیں، ناموریاں اور مال و زر کے انبار سب اسی دنیا میں رہ جاتے ہیں، ساتھ جو چیز جاتی ہے وہ صرف "اعمال" ہیں! یہی زادِ راہ اور توشۂ منزل ہے آؤ اس منزل کے لیے کچھ کر رکھیں۔ والعاقبۃ للمتقین۔

(ماہنامہ فاران، جنوری ۱۹۵۰ء)

حضرت شفاؔ گوالیاری

محمد علیٰ صاحب صدیقی (لیاقت آباد، کراچی) نے اپنے خط میں لکھا ہے :
" انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اطلاع بہم پہنچائی جا رہی ہے کہ بھوپال میں حضرت شفاؔ گوالیاری ۲۲ر جولائی ۱۹۶۸ء کو رحلت فرما گئے ۔"
مرحوم کو آپ سے دلی تعلق تھا وہ آپ کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے
میں نے وہ تمام تبصرے پڑھے ہیں جو آپ وقتاً فوقتاً اُن کے کلام پر فرماتے رہے ہیں ...."

جس دن یہ مکتوب غم ملا ہے اسی دن انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار اخبار " ہماری زبان" میں شفاؔ گوالیاری مرحوم کے انتقال پُر ملال کی خبر پڑھی۔

مرحوم حضرت سیمابؔ اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح ممتاز شاگرد تھے اور اب خود استادی کے منصب پر فائز تھے، اُن کے کلام کے چار مجموعے (آیات شفا، شاخ زیتون، نبض حیات اور پرچم اردو) شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں مجموعہ " زخم گل" مرتب ہو چکا ہے مگر طبع نہیں ہو سکا۔

دو ڈھائی سال ہوئے سلطان پور کے رسالہ " شمع ادب" نے " شفا نمبر" خاصے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ شفاؔ مرحوم تحت لفظ پڑھتے تھے مگر مشاعروں میں رنگ جما دیتے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ " فاران" ستمبر ۱۹۶۸ء)

سیّد شفقت کاظمی

افسوس ہے کہ واقعات کے سنین و شہور ٹھیک طرح یاد نہیں رہتے، حافظہ بیچارہ بھی کس کس واقعہ کی تاریخوں کو یاد رکھے، پھر عمر کے لحاظ سے بھی یہ زمانہ ضبط و حفظ کا نہیں ذہول و نسیان کا زمانہ ہے پھر بھی جتنے واقعات جس تفصیل کے ساتھ راقم الحروف کو یاد ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

ملتان کی نمائش کے سلسلہ میں کل پاکستان مشاعرہ تھا، یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ اپنے انتہائی بے تکلف دوست صابر دہلوی مرحوم کے یہاں میرا قیام تھا، وہاں شفقت کاظمی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ صابر دہلوی نے جس انداز میں شفقت کاظمی سے میرا تعارف کرایا اس میں قدرے مزاح کا رنگ بھی شامل تھا۔ صابر دہلوی بڑے زندہ دل بلکہ ہنسوڑ تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ موقع اور محل میں ہنسنے ہنسانے اور لطف لینے کا کوئی پہلو پیدا کر لیا کرتے تھے۔

شفقت کاظمی اس مشاعرے میں مدعو نہ تھے ڈیرہ غازی خاں سے وہ مشاعرہ سننے کے لیے ملتان آئے تھے، اُن کا سادہ لباس مسکین صورت اور انکسار آمیز انداز کچھ نہ کچھ کشش ضرور رکھتا تھا، انہوں نے اپنی دو تین غزلیں بھی سنائیں۔

پھر اُس کے بعد وہ اپنی غزلیں "فاران" میں اشاعت کے لیے بھیجنے لگے اور اس طرح اُن سے ربط قائم ہو گیا۔ "فاران" میں اُن کا کلام ایک دو مہینہ کے وقفہ سے چھپنے لگا۔ وہ ہر غزل کے بارے میری رائے دریافت کرتے تھے، میں ان کی غزلوں کے کمزور اشعار حذف کر دیتا تو بعض اوقات میری اس جسارت کو گوارا کر لیتے اور کبھی کبھار شکایت آمیز خط بھی آ جاتا، مگر شکایت کا لہجہ دھیما، باوقار اور سنجیدہ ہوتا۔ یہ اُن کی شرافت تھی کہ حفظ مراتب کا خیال رکھتے۔

میری مرحومہ بیوی کے کلیم میں مکان ڈیرہ غازی خاں میں ملا، وہاں اس سلسلہ

میں دوبارہ میرا جانا ہوا، دعوتوں اور شعر و شاعری کی نشستوں میں اُن کا ساتھ رہا ڈیرہ غازیخاں کے ہر طبقہ کے لوگ اُن کا احترام کرتے تھے، ڈاکٹر نوحی کے ڈرائنگ روم میں شفقت کاظمی کے کئی فوٹو گروپ آویزاں تھے۔ شفقت مرحوم کے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی یہ اس کی تصویریں تھیں۔

شفقت کاظمی مشاعروں کے شاعر نہیں تھے اُن کی زبان میں گرفت تھی جس کی وجہ سے اشعار تحت لفظ پڑھتے ہوئے بھی پوری طرح الفاظ ادا نہیں ہوتے تھے۔ آواز بھی دبی دبی سی تھی اور شعر سناتے میں فرطِ انکسار سے اُن کا قد اور پست ہو جاتا — اُن کو اس کا احساس تھا کہ شعر خوانی کی اس کمزوری کی وجہ سے انہیں مشاعروں میں بہت ہی کم بلایا جاتا تھا، پھر بھی مجھے یاد پڑتا ہے، منظفر آباد (آزاد کشمیر) منظفر گڑھ علی پور اور ملتان وغیرہ مقامات کے مشاعروں میں اُن کی معیت رہی! کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں انہیں بلایا گیا! ان کی شاعری کے نقش مشاعروں میں نہیں صفحہ قرطاس پر مرتسم ہوتے تھے۔ اور یہی نقوش پائدار بھی ہیں ورنہ مشاعروں کی داد و ستائش کا تو یہ حال ہے:

؎ جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

اُن کی وفات سے تین چار برس پہلے ایسی بھی نوبت آگئی کہ میں نے اُن کی بھیجی ہوئی غزلیں پڑھ کر انہیں خط لکھا کہ آپ چند دن کے لیے شعر کہنا ترک کر دیں، آپ کی علالت کا اثر آپ کی شاعری پر بھی پڑا ہے۔ میں نے اُن کی ایک غزل کے ایک ایک شعر کا تجزیہ کر کے بھیجا، جسے انہوں نے مشہور غزل گو شاعر اور باکمال ناول نگار جناب فضل کریم فضلی کے پاس محاکمہ کے لیے بھیج دیا مگر فضلی صاحب نے اپنی رائے دینے سے گریز کیا اور کچھ لکھا بھی ہوگا تو اس کا انداز ایسا ہوگا کہ شفقت صاحب کو جس سے ناگواری نہ ہو۔ مرحوم مذہباً شیعہ تھے مگر مزاج میں شدت اور عصبیت نہ تھی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے مداح تھے۔ ڈاکٹر نذیر کی شہادت پر جو خط انہوں نے مجھے لکھا اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شاعر کس قدر حساس اور ملتِ اسلامیہ کے مخلص خدمت گزاروں کا کس درجہ قدر شناس ہے، اور دل دردمند رکھتا ہے۔

شفقت کاظمی نے کسی سہارے اور واسطے کے بغیر ادبی دنیا سے خود اپنا تعارف کرایا اور تعارف کا ذریعہ اُن کا کلام تھا، ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں کو وہ اپنی غزلیں بھیجتے رہتے۔ ان کی آمدنی قلیل تھی، ڈاک کے مصارف بھی ان کے اخراجات کی ایک مد تھی، شاید ہی کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جس میں ان کا کلام نہ چھپا ہو۔ یہاں تک کہ چھوٹے شہروں کے سہ روزہ اخبارات میں بھی اُن کی غزلیں نظر آتی تھیں۔ اُن کے تغزل کی خوبیوں کا اہلِ نظر کو اعتراف تھا۔

مولانا حسرت موہانی مرحوم سے انہیں بے انتہا عقیدت تھی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ "خاکپائے حسرت موہانی" لکھا کرتے تھے، اُن کا خط قدیم ہندوستانی مسلم شرفا کے خط کی طرح پختہ، منشیانہ اور جاذب نظر تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے اُن کی غزل کے کسی لفظ یا محاورے پر گرفت کی اور انہوں نے جواب میں کسی قدیم شاعر کا شعر لکھ کر بھیج دیا، جس میں وہ محاورہ نظم ہوا تھا، اس سے اندازہ ہوا کہ اردو زبان و روزمرّہ میں وہ خاصی گہری نگاہ رکھتے تھے۔

شفقت کاظمی کی غزلوں کی خصوصیت سلاست و سادگی ہے، اس سادگی اور روانی نے اُن کے متعدد اشعار کو سہل ممتنع بنا دیا ہے۔ رسالوں میں اُن کی غزلیں شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتیں۔ مادی طور پر اُن کی تھوڑی بہت قدر افزائی بھی ہوئی مگر اُس وقت جب وہ زندگی اور موت کی کشاکش میں مبتلا تھے۔

وہ برسوں سے ذیابیطس کے مریض تھے۔ پھر آنکھوں کی تکلیف عود کر آئی، آپریشن بھی ہوا، کئی مہینے لکھنے سے معذور رہے پھر لکھنے بھی لگے...... مگر اضمحلال بڑھتا گیا، ڈیڑھ دو برس سے وہ صاحبِ فراش تھے یہاں تک کہ وہ گھڑی بھی آپہنچی جسے کوئی تدبیر ٹال نہیں سکتی۔ شعر و ادب کے حلقوں میں اُن کی وفات کو سب نے محسوس کیا۔

اُن کے صاحبزادے سید نجیب الحسن نقوی نے دو خط راقم الحروف کو لکھے جس سے اندازہ ہوا کہ اپنے فرزند کی شفقت مرحوم نے بڑی اچھی تربیت کی تھی! انہی کے خطوں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ شفقت کاظمی مرحوم نے اپنے نورِ نظر کی محبت میں دوسری شادی نہیں کی۔

شفقت کاظمی کی سیرت و کردار کا خلاصہ قناعت، خودداری اور سادگی ہے، آخر دم تک اُن کی یہی وضع رہی ـــ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کی ہر منزل کو اُن کے لیے آسان بنا دے۔ (آمین)

ـــــــــــ (ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۵ء)

شفیق جونپوری

جناب شفیق جون پوری مرحوم کا کلام تو رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا، مگر اُن سے میری ملاقات لکھنؤ کے "مشاعرۂ مدح صحابہؓ" میں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کو بھی بس اکیس سال ہونے کو آئے، اس کے بعد ان سے مشاعروں میں ملنا ہوتا رہا۔ تقسیم ہند سے قبل جب میں دلی میں تھا، تو اُن سے کچھ دنوں خط و کتابت بھی ہوئی، پاکستان بننے کے بعد جب "فاران" نکلنا شروع ہوا، تو میں نے اُن سے کلام بھیجنے کی درخواست کی، اور انھوں نے میرے نیاز نامہ کو پڑھتے ہی اپنا کلام بھیج دیا۔

حضرت شفیق جون پوری مرحوم کا کلام "فاران" میں اکثر چھپتا رہا ہے۔ بعض اوقات میری طلب کے بغیر بھی کرم فرماتے اور کئی کئی غزلیں ایک ساتھ بھیج دیتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انتخاب میں اُن کی غزل کے اشعار کم ہو جاتے مگر انھوں نے میری اس "جسارتِ انتخاب" کا بُرا نہیں مانا، نہ مجھ سے یہ پوچھا کہ فلاں فلاں شعر تم نے کیوں حذف کر دیئے؟ اس کی وجہ بتاؤ؟ —— یہ اُن کی عالی ظرفی تھی اور ساتھ ہی راقم الحروف کے ذوقِ انتخاب پر اُن کے اعتماد اور اعتبار کی دلیل!

شفیق مرحوم کا مذہبی رجحان "بریلوی عقائد" کی جانب تھا، کبھی کبھار میرے کسی بدعت شکن مضمون پر نرم لہجہ اور مشفقانہ انداز میں گرفت بھی فرماتے، میں ہاتھ کے ہاتھ جواب دیتا، اس پر وہ خاموش ہو جاتے، اور اس طرح "جواب الجواب" کا سلسلہ دراز نہ ہونے پاتا اُن کے اور میرے درمیان بحث و مباحثہ میں ذرہ برابر بدمزگی اور کبیدگی پیدا نہیں ہوئی! میں نے مرحوم کی کتابوں پر "فاران" میں گرفت و تنقید کی، تو اُس کا بھی کوئی ناگوار اثر قبول نہیں کیا۔

حضرت شفیق جون پوری مرحوم نے مرنجان و مرنج طبیعت پائی تھی، اُن کے مزاج میں سادگی کے ساتھ وضعداری بھی تھی جس سے جیسے تعلقات قائم ہو جاتے،

انہیں نباہنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کرتے، شعرگوئی میں وہ اُستادانہ مہارت رکھتے تھے، غزل اور نظم دونوں کے بادشاہ! اُن کی نظموں میں "حدی اور رجز" کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے! زودگوئی، پرگوئی اور خوش گوئی یہ ہیں اُن کی شاعری کی چند خصوصیات! انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی قدرشناسی کی تھوڑی بہت بہار بھی دیکھ لی، بڑے بڑے حاکموں اور وزیروں تک نے اُن کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا، ہندوستانی حکومت نے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کردیا تھا۔

حضرت شفیق جون پوری کے چھوٹے بھائی جناب عزیز ربانی (ایڈیٹر نئی دنیا) نے مجھے لکھا:۔

"......غالباً آنجناب کو آل انڈیا ریڈیو یا اخبارات کے ذریعہ میرے حقیقی بھائی حضرت مولانا شفیق جون پوری کے سانحہ ارتحال کی خبر مل ہوگی مرحوم کا انتقال ۵ مارچ ۱۹۶۳ء کو ۵ بجے شام کے وقت ہوا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

برادرِ معظم کو آپ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ اور پُرخلوص محبت تھی مرحوم اکثر آپ کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کی پُرخلوص روایات جو بھائی مرحوم کے ساتھ وابستہ تھیں، اگرچہ میں اس کا اہل نہیں تاہم ناچیز کی دلجوئی کے لیے برقرار رکھیں گے......"

شفیق صدیقی جونپوری کی موت —— ایک غیرت مند مسلمان، شریف انسان اور عظیم شاعر کی موت ہے —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۶۳ء)

شفیق کوٹی

شفیق کوٹی سے سب سے پہلی بار ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی، اس کو بھی اب ۳۵ برس ہورہے ہیں، بمبئی میں میرا آنا جانا رہتا تھا، فلمی نغموں کے سلسلہ میں وہاں میں دو دو تین تین مہینہ قیام کرتا، مشاعروں اور پارٹیوں میں اُن سے ملاقات ہوتی رہتی۔ شفیق مرحوم نے شاعروں کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا جس کا نام ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔

پاکستان بننے کے بعد اُن سے کراچی اور لاہور میں ملنا جلنا رہتا، کئی بار لاہور میں اپنے یہاں راقم الحروف کی دعوت بھی کی، لاہور کے بعض شعراء کو مدعو کیا، ہر دعوت میں شعر و شاعری بھی رہتی۔ وہ جس احاطے میں رہتے تھے اُس کے ایک حصہ میں کسی صاحب حیثیت کا وسیع و کشادہ مکان تھا، اُسی مکان میں مہمانوں کی دعوت کا انتظام ہوتا، ایک بار لاہور میں انارکلی کے فٹ پاتھ پر مولانا ظفر احمد انصاری اور راقم الحروف سے شفیق کوٹی کی ملاقات ہوگئی، بولے آپ دونوں حضرات کی میرے یہاں دعوت ہے۔ آپ کی چاہے کیسی ہی مصروفیات کیوں نہ ہوں آپ کو میری دعوت میں آنا پڑے گا، میں نے کہا حضرت جگر مرادآبادی ان دنوں لاہور ہی میں ٹھہرے ہوئے ہیں، انہیں بھی اپنی دعوت میں بلا لیجئے، شفیق صاحب نے جواب میں کہا کہ انہیں مدعو کرنے کا ارادہ نہیں ہے، میں جب بھی جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں مجھ سے یہی فرماتے ہیں "تم ریلوے میں نوکر ہو؟" میں نے بارہا اس کی تردید کی ہے کہ ریلوے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، میں تو اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوں۔ پھر میں نے شفیق کوٹی مرحوم سے کہا کہ میری اور آپ کی کب کی ملاقات ہے۔ بولے بمبئی میں جب آپ مشاعرے میں آئے تھے، غالباً ۱۹۴۲ء تھا، اُس وقت سے تعارف ہے۔ "تو سنیئے" میں نے ذرا تند لہجہ میں کہا کہ میں بھی اب تک یہی سمجھتا تھا کہ آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ اس پر

شفیق صاحب بیساختہ اچھل پڑے، مولانا ماہر القادری بھی ہنسنے لگے۔ اس لطیفہ کو میں بے تکلف دوستوں کی صحبتوں میں بیان کیا کرتا ہوں ۔۔۔ وہ جب بھی کراچی تشریف لاتے، مجھ سے ضرور ملتے! اپنے صاحبزادے کے مکان میں ٹھہرتے اور وہاں دعوتوں میں دوستوں کو بلاتے۔ کھانے کے بعد مشاعرہ!

شفیق کوٹی کے مجموعہ کلام پر "فاران" میں جو تبصرہ آیا وہ خفا ہو گئے مجھے لاہور سے خط لکھا جس میں یہ مصرعہ درج تھا:

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

میں نے جواب دیا کہ "فاران" میں بے لاگ تنقیدیں ہوتی ہیں، ان میں ذاتی تعلقات کی رعایت نہیں کی جاتی اور نہ گھر والوں اور باہر والوں کے لیے کوئی امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ کئی برس تک اُن سے ملنے جلنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ کراچی آتے تو کراچی سے لاہور جانے کے بعد پتہ چلتا کہ وہ چند دن یہاں رہ کر لاہور واپس بھی چلے گئے، مگر رفتہ رفتہ ان کی یہ برہمی دور ہو گئی، مشاعروں اور دعوتوں میں گرمجوشی کے ساتھ ملتے اور ہنسی خوشی کی باتیں رہتیں۔

شفیق کوٹی خوش گو شاعر تھے حضرت سیماب اکبر آبادی مرحوم کے شاعری میں شاگرد تھے پھر وہ خود بھی استادی کے منصب پر فائز ہو گئے مشہور نوجوان شاعر باقی احمد پوری نے چار پانچ غزلوں پر ان سے اصلاح لی تھی پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ شورش کاشمیری مرحوم اور حضرت احسان دانش سے اُن کے خاصے گہرے تعلقات تھے، شورش کاشمیری نے متعدد نظموں میں شفیق کوٹی سے خطاب کیا ہے۔ بیگم خلیق الزماں جب ایوب خانی دور میں وزیر صحت تھیں تو کراچی میں ان کی کوٹھی پر عشائیہ کے بعد مشاعرہ ہوا، شفیق کوٹی مرحوم کو اُن کی غزل پر سب سے زیادہ داد ملی۔ مشاعروں کے بہت شوقین تھے، مشاعروں کی ٹوہ میں رہتے اور بعض اوقات کسی معاوضہ کے بغیر اپنی گرہ سے کرایہ خرچ کر کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔

شفیق کوٹی کے صاحبزادے جرمنی میں ملازم ہیں۔ گزشتہ سال اُن کے فرزند نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیجا اور وہ یورپ کی سیر کر آئے۔ شفیق مرحوم خوشحال زندگی گزارتے تھے۔ ملازمت سے پنشن لینے کے بعد کئی سال کسی کمپنی میں سات آٹھ سو روپے ماہوار کی ملازمت پر کارگزار رہے۔ ان کے لڑکے برسرِ روزگار اور ہر طرح سے آسودہ حال! کراچی میں اُن کے فلیٹ بھی تھے جن کا کرایہ آتا تھا، شاعری کے ذریعہ انہوں نے محدود شہرت کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کیا۔

جسم دُبلا پتلا تھا مگر صحت اچھی تھی۔ دین سے دلچسپی اور پاکستان سے محبت تھی۔ وضع قطع، رہن سہن، نشست و برخاست شریفانہ اور سنجیدہ! چند دن بیمار رہے اور یہ بیماری مرض الموت بن گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۶ء)

شکیل بدایونی

۱۹۲۷ء کی بات ہے ، میں بدایوں کے مدرسہ قادریہ میں ٹھہرا ہوا تھا، ایک معمر بزرگ منشی ہدایت اللہ مدرسہ قادریہ کے مہتمم مولانا خواجہ غلام نظام الدین صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لائے ان کے ساتھ دُبلا پتلا ایک لڑکا تھا عمر دس گیارہ سال کے لگ بھگ! ان دنوں شریف مسلمانوں کے بچے انگریزی لباس نہیں پہنتے تھے، ترکی ٹوپی ، ململ کا کرتہ، شیروانی اور لٹھے کا پاجامہ یہ اس نونہال کا لباس تھا، چہرہ مہرہ جاذب نظر! دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولوی جمیل احمد قادری کے یہ اکلوتے فرزند ہیں ، باپ بمبئی کی کسی مسجد میں پیش امام ہیں ۔ دادا پوتے کی نگرانی و تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں اور سچ مچ جان چھڑکتے ہیں۔

مشہور نعت گو شاعر مولانا ضیاء القادری بدایونی اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جس جگہ بھی رہے، وہاں ان کے زیرِ اہتمام ، ۲۷ رجب کو بڑے دھوم دھام سے جلسہ ضرور ہوتا۔ (غالباً) ۱۹۳۲ء میں مولانا موصوف نے "رجبی" میں نعتیہ نظمیں پڑھنے کے لیے راقم الحروف کو بلایا۔ بدایوں کی تاریخی مسجد شمسی میں جلسۂ معراج ہوا، مولانا نعیم الدین مراد آبادی کو زندگی میں پہلی بار دیکھا اور اُن کی تقریر بھی سنی جو اس اجتماع کی سب سے اچھی تقریر تھی، مولانا ضیاالقادری نے مجھے جس مکان میں ٹھہرایا وہ مولوی جمیل احمد قادری کا مکان تھا، گرمی کی رُت تھی رات کو کھلی چھت پر سوتے تھے۔ اس طرح دو دن اور دو رات شکیل بدایونی کا ساتھ رہا، ان دنوں شکیل میٹرک میں پڑھتے تھے، شباب منزلِ آغاز سے آگے بڑھ چکا تھا! تقریباً سات سو سال پہلے عجمی تصوف اور عاشقانہ شاعری کی بدولت مسلمانوں کے معاشرے میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب مردوں کے فتنۂ شباب کو عورتوں کی جوانی کے فتنہ سے زیادہ شدید اور خطرناک سمجھا جاتا تھا! اسی فتنۂ شباب کی جھلکیاں ان آنکھوں نے بدایوں میں دیکھیں۔

بدایوں میں ان دنوں بارہ ربیع الاوّل کو خاصے شاندار پیمانے پر جلوس نکلتا تھا اس جلوس میں شکیلؔ بدایونی شاہنامۂ اسلام (حفیظؔ جالندھری) اپنے خاص انداز میں پڑھتے تھے، نعت خوانوں کی بہت سی پارٹیاں جلوس کے ساتھ ہوتیں مگر تنہا شکیلؔ ان سب پر بھاری رہتے۔ جس جگہ وہ شاہنامہ پڑھتے وہاں لوگوں کا سب سے زیادہ ہجوم ہوتا۔ اسی تقریب سے شہر میں اُن کے تعارف اور شہرت کا آغاز ہوا، میں نے بدایوں کے قیام میں شکیلؔ کی زبان سے اُن کا ایک شعر بھی نہیں سُنا ہو سکتا ہے کہ وہ شعر کہتے ہوں مگر دوسروں کو سناتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہوں۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس مرحلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے آسان بنا دیا۔ بمبئی کے ایک ٹرسٹ سے شکیلؔ اور اُن کے ہم زلف محمد میاں (یوسف حسین قادری، مولانا ضیاء القادری بدایونی کے صاحبزادے جو ان دنوں مرکزی حکومت پاکستان میں سیکشن افسر ہیں) کے (غالباً) چالیس روپیہ ماہوار کے وظیفے مقرر ہو گئے۔ علی گڑھ کے محلہ نئی بستی میں مکان کرایہ پر لیا گیا اور مسلم یونیورسٹی میں شکیلؔ اور محمد میاں نے "ڈے اسکالر" کی حیثیت سے داخلہ لے لیا، آگرے میں طلباء کی شاعری کے مقابلے ہوتے تھے، ان مقابلوں (COMPETITION) میں شکیلؔ اور رازؔ مرادآبادی حصہ لیتے اور میدان انہی دونوں کے ہاتھ رہتا۔ یہ شکیلؔ کی شاعرانہ شہرت کا آغاز تھا پھر دوسرے شہروں کے مشاعروں میں بھی وہ شریک ہونے لگے، ان دو غزلوں

؎ تمام میکش پکار اٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

؎ میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

نے شکیلؔ کو بہت چمکایا۔ اُن کی مشقِ شاعری اور شہرت کا یہ وہ زمانہ ہے جب ضیاء القادری اور جامؔ نوائی بدایونی کی محنت و تربیت اُن کے کام آئی!

شکیلؔ مشاعروں میں غزل اور نظم پڑھنے سے پہلے چار چار مصرعوں کے قطعے بحرِ طویل میں پڑھتے اور مشاعرے پر چھا جاتے، رنگ جمنے کے بعد پھر وہ جو غزل اور نظم بھی سناتے کامیاب رہتی اور مشاعرے کو لوٹ لیتے، کلام کی سادگی و شوخی کے ساتھ ترنم دلنشیں! اُن کی نظموں میں ——"چور" اور "نمائش" سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہوئیں۔

مسلم یونیورسٹی میں انہیں ایسا اعزازی عہدہ ملا تھا جس کی بنا پر وہ یونیورسٹی کی حدود سے باہر آنے جانے والے طلبار کی چیکنگ کرتے، کسی طالب علم کی بے عنوانی کی وہ رپورٹ کر دیتے تو یونیورسٹی کی انتظامیہ اس پر ایکشن لیتی۔

۱۹۴۲ء سے شکیل کی سرکاری ملازمت کا آغاز ہوا، گریجویٹ ہونے کے بعد وہ مرکزی حکومت کے محکمہ سپلائی میں سینئر کلرک اور پھر جلد ہی اسسٹنٹ یعنی متعلقہ شاخ (BRANCH) کے انچارج ہو گئے۔ ملازمت کے تقریباً تین سال بعد بمبئی کے مشاعرے میں شکیل کا جانا ہوا، مشاعرے میں ان کی کامیابی نے فلمی دنیا کو متوجہ کیا یہاں تک کہ سرکاری ملازمت کو خیر باد کہا اور کاردار فلم پروڈکشن میں نغمہ نگار کی حیثیت سے چار سو روپیہ ماہوار پر ان کا تقرر ہو گیا، شہرت، نغموں کی مقبولیت اور کارکردگی کے ساتھ تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا۔

شکیل نے فلمی دنیا میں "یک درگیر محکم گیر" کی ضرب المثل پر عمل کیا، مشہور میوزک ڈائرکٹر نوشاد سے انتہائی گہرے روابط قائم کیے جن میں دوستی کا ناز کم اور نیاز زیادہ شامل تھا۔ پھر وہ بھی نوشاد کی طرح ملازمت چھوڑ کر فری لانسر ہو گئے اب یہ صورت ہو گئی کہ جس فلم میں نوشاد نغموں کی دھن بناتے اس میں نغمے شکیل کے ہوتے۔ نوشاد اور شکیل اس طرح ایک دوسرے کے ردیف اور لازم و ملزوم بن گئے۔ فلمی مصروفیت کے سبب انہوں نے مشاعروں میں جانا بھی کم کر دیا تھا۔ مگر جس شہر میں چلے جاتے وہاں شہرت و مقبولیت اور احترام و قدر دانی کے مناظر دیکھ کر انہیں خود حیرت ہوتی۔

کئی سال کے بعد پردیس سے وطن گئے تو بدایوں کے شہریوں نے ان کا والہانہ انداز میں استقبال کیا، ان کا مکان شہر کی جس سڑک پر واقع ہے میونسپل کمیٹی نے اس کا نام شکیل روڈ رکھا۔

ہندوستان اور پاکستان سے باہر ملکوں میں بھی شکیل کی عالمی شہرت، بادِ صبا بن کر پہنچی، ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف کو ساؤتھ افریقہ بلایا گیا، تو بزمِ ادب نیٹال کے سکریٹری یوسفی صدیقی صاحب نے فرمایا کہ ہم نے شکیل بدایونی صاحب کو مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی تھی مگر انہوں نے ہمارے خطوں کا جواب ہی نہیں دیا، میں نے کہا

دعوت نامہ کے جواب نہ دینے کا سبب اُن کی بیماری ہے۔

پاکستان بننے کے بعد متعدد مقامات سے راقم الحروف کو مشاعروں کی دعوت آئی مگر مگر وہاں جانے کے لیے دل نے ہامی نہیں بھری۔

از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

مگر ۱۹۵۸ء میں نخشب مرحوم کا اصرار مجھے کشاں کشاں بمبئی لے گیا، بارہ سال کے بعد بمبئی جانا ہوا، احباب نے بڑی پذیرائی کی، شکیل بدایونی ایرپورٹ پر موجود تھے، بڑی محبت وخلوص کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ دو ہفتہ میرا وہاں قیام رہا۔ شکیل نے کئی بار مجھ سے کہا کہ نوشاد تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ میں نوشاد کے بنگلہ پر جا کر اُن سے ملوں، مگر میں ہر بار اُن کے کہنے کو ٹال گیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نخشب اور نوشاد کی اَن بن ہے ورنہ وہ تم سے خود یہاں آکر ملتے۔ ایک دن شب میں نوشاد آئے، نخشب جارچوی کے فلیٹ کی سڑک پر موٹر میں بیٹھے رہے۔ میرے پاس پیام بھجوایا کہ آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں، میں نیچے پہنچا، محبت و احترام کے انداز میں معانقہ کیا۔ نوشاد کسی پارٹی سے آرہے تھے وہاں اُن کو جو ہار پہنایا گیا تھا وہ انہوں نے میرے گلے میں ڈال دیا۔

شکیل نے راقم الحروف کی دعوت کی، نخشب میزبانی اور ضیافت کے بادشاہ تھے، اُن کے باورچی کو شکیل اپنے یہاں لے گئے۔ بکرے کی مسلّم رانیں، دہی کی بریانی اور طرح طرح کے کھانے اس نے تیار کیے، نخشب اور بعض دوسرے احباب کہنے لگے کہ اس شخص (شکیل) نے تو حضرت جگر تک کی دعوت نہیں کی، یہ کیا نئی بات ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری دعوت کی اور اس قدر اہتمام کے ساتھ کی —! میں اس کا کیا جواب دیتا۔ کھانے کے بعد یہ لطیفہ مزہ دے گیا —— شکیل باندرے کے جس مکان میں رہتے تھے اُس کے سامنے جو درخت تھے وہ جھکے ہوئے تھے، دوستوں نے پوچھا کہ بھئی! یہ درخت ٹیڑھے کیوں ہیں، علی سردار جعفری برجستہ بولے:

"کثرتِ استعمال نے ان پیڑوں کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔"

شکیل نے اپنی بڑی لڑکی کو اس کی خالہ کے پاس پاکستان بھیج دیا تھا، کئی سال کی بات ہے میں اپنی بیوی کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں جناح ہسپتال گیا، وہاں شکیل

کے خسر قیصر صاحب ملے اُن کی نواسی یعنی شکیل کی لڑکی کی لڑکی اُن کے ساتھ تھی۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے یہاں کیسے آنا ہوا، بولے یہ شکیلؔ کی سب سے بڑی لڑکی ہے ایم، اے میں پڑھتی ہے، کچھ دنوں سے (MENTAL WORRY) میں مبتلا ہے، اسے دکھانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد تین چار بار شکیلؔ کا کراچی آنا ہوا، اُن کے احباب اور قدر دانوں کی یہاں کمی نہ تھی، ہر دوست اور مداح اُن کی دعوت کرنا چاہتا تھا، میں نے انہیں اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی تو پروگراموں میں کاٹ پھانس کر کے وقت نکالا، مگر دو تین دن کے بعد اُن کا مزاج قدرے ناساز ہو گیا اور کئی دعوتوں میں جانے سے معذرت چاہی، فضل کریم فضلیؔ صاحب تک کی دعوت میں وہ نہ جا سکے فضلیؔ صاحب سے ٹیلی فون پر میں نے اپنی دعوت کی یاد دہانی کرائی تو وہ بولے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے شکیل صاحب بیمار ہیں وہ دعوتوں میں شریک نہیں ہو رہے ہیں، میں نے عرض کیا مگر وہ میری دعوت کو نہیں ٹال سکتے! وہ ضرور آئیں گے، چنانچہ دعوت ہوئی اور شکیلؔ صاحب وقت پر آئے تین چار گھنٹے خوب لطف رہا۔

تقریباً پانچ سال ہوئے جب وہ آخری بار بغداد شریف سے کراچی آئے تو طبیعت کی جولانی اور مزاح و ظرافت کا وہی رنگ تھا مگر چہرے سے بیماری کے آثار نمایاں تھے، شعر پڑھتے میں آواز پوری طرح ساتھ نہیں دیتی تھی۔

میرا اور شکیلؔ کا دلی، میرٹھ، لائل پور، بمبئی، بھساول، ساگر، اجمیر وغیرہ مقامات پر مشاعروں میں ساتھ رہا ہے، دلیؔ اور بمبئی میں طویل طویل صحبتیں رہی ہیں، ساگر میں پوری ایک رات تو ساز و نغمہ اور رامش و رنگ ہی کے ہجوم میں بسر ہوئی! کتنے بہت سے لطیفے ہیں جو شکیلؔ کی یاد کے ساتھ حافظہ میں محفوظ ہیں! ایک بار شکیلؔ نے مجھ سے سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا، یہ بتایئے اردو میں کون شاعر زندۂ جاوید ہیں؟ میں اس پر سوچنے لگا، شکیلؔ اور تمام دوسرے احباب میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے اور میرے منہ سے جواب سننے کے منتظر تھے۔ دوستوں کی اس محفل پر سنجیدگی طاری تھی، میں نے کہا:-

" غالبؔ، اقبالؔ اور ایک کوئی اور "

میرے جواب پر تمام احباب نے قہقہہ لگایا اور شکیلؔ تو ہنسی کے مارے دہرے ہوئے جاتے تھے، بار بار کہتے اس " ایک کوئی اور " کا جواب نہیں!

۱۹۶۱ء میں مدراس کے مشاعرے میں جانا ہوا، پھر بمبئی گیا، وہاں ماہنامہ "شاعر" کا جشن سیمیں تھا اور اس سلسلہ میں پاک و ہند مشاعرہ منعقد ہوا اس کے بعد احمد آباد کے احباب کے اصرار پر وہاں کے مشاعرے میں شریک ہونے کا میں نے وعدہ کر لیا، شکیلؔ نے کہا کہ میں تمہیں اپنی کار میں ایر پورٹ لے چلوں گا، میں نے جواب دیا کہ اس مہربانی کا شکریہ مگر میرا یہ عام طور پر اصول ہے کہ میں ایر پورٹ ایر کمپنی کی بس میں جایا کرتا ہوں، پرائیویٹ کار راستہ میں خراب بھی ہو سکتی ہے۔ شکیلؔ کا اصرار میرا انکار، بات بڑھنے لگی تو شکیلؔ نے کہا فرض کیجیے میری کار کا انجن راستہ میں فیل ہو گیا یا ٹائر پھٹ گیا اور ہوائی جہاز چھوٹ گیا، تو تمہارے ہرجانہ کا میں ذمہ دار ہوں، میں بولا ہرجانہ تو تم دے سکتے ہو، مگر وہ جو "کوفت" ہوگی، اس کا کتنا معاوضہ ہوگا؟ میرے اس جواب پر شکیلؔ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

یہ لطیفہ بارہا مضامین میں آچکا ہے کہ لاہور میں شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ شکیلؔ تانگے میں جا رہے تھے۔ کسی بات پر شکیلؔ کے منہ سے "اللہ" نکلا ——— اس پر :-

ہیں کس نے پکارا ——— جوشؔ نے طنزیہ انداز میں کہا

یہ شیطان کی آواز کہاں سے آئی ——— شکیلؔ نے جواب دیا۔

مسٹر محمد علی جناح قائداعظمؒ ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تشریف لائے تو طلباء کی یونین کے ارکان کے ساتھ اُن کا فوٹو گروپ لیا گیا، شکیلؔ صاحب بھی ان ارکان میں شامل تھے۔ انہوں نے یہ کیا کہ فوٹو گروپ سے قائداعظمؒ کا اور اپنا فوٹو علیحدہ کر کے ان دونوں تصویروں کو یکجا کر لیا۔ ریل کے سفر میں وہ اپنے اور قائداعظمؒ کے فوٹو کی کاپی اٹیچی سے نکالتے اور ہاتھ میں لے لیتے، اس طرح پاس بیٹھے ہوئے مسافروں میں یہ فوٹو گروپ مرکز توجہ بن جاتا۔

اُن کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں مضامین اور تصاویر ہی نہیں، کسی پروگرام یا خبر کی دو سطریں بھی شائع ہوتیں تو اس کا تراشہ محفوظ کر لیتے، یہاں تک کہ

سینکڑوں دعوتی کارڈ جو اُن کے نام آتے رہتے تھے وہ بھی انہوں نے سلینت کر رکھ چھوڑے تھے۔

اُن کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام (رعنائیاں) چھپنے لگا تو مجھ سے اس پر "تقریظ" لکھنے کی فرمائش کی، میں نے مختصر تقریظ لکھ کر اُن کے حوالے کر دی، میں نے اس میں شکیلؔ کی شاعری کو سراہتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ شکیلؔ صاحب کے کلام میں کہیں کہیں کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن انہی کوتاہیوں اور لغزشوں کے اُفق سے اُن کے شاعرانہ مستقبل کا آفتاب طلوع ہوگا — جب شکیلؔ کا مجموعۂ کلام چھپ کر آیا تو میری تقریظ سے یہ جملے حذف کر دیئے گئے۔

شکیلؔ کے والد مولوی جمیل احمد قادری مرحوم ۱۹۱۸ء میں راقم الحروف کے وطن (کسیر کلاں، ضلع بلند شہر) سیرۃ النبی کے جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے وہاں کے مسلمانوں کو مفتی عبدالقدیر بدایونی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی اُن کے نام پر "مدرسہ قدیریہ" قائم کیا گیا، اس مدرسہ میں جو کتبہ نصب ہے اُس میں مولوی جمیل احمد قادری کا نام بھی شامل ہے۔ شکیلؔ بدایونی (غالباً) ۱۹۴۱ء میں جب کسیر کلاں گئے اور مدرسہ قدیریہ کے کتبہ کو پڑھا تو اپنے والد بزرگوار کے نام کی نسبت سے اس مدرسہ کے طلبا میں شیرینی تقسیم کرنے کے لیے کچھ روپے دیے۔ باسط بھوپالی اپنے نواح کے خاصے مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ شکیلؔ بدایونی کا ایک بڑے مشاعرے کے سلسلہ میں بھوپال جانا ہوا تو باسط مرحوم کے یہاں عیادت کے لیے گئے اور اُن کے صاحبزادے کو کچھ رقم عنایت فرمائی۔

مولوی جمیل احمد بدایونی ذیابیطس کے مریض تھے۔ ۱۹۳۳ء میں عراق جاتے ہوئے بمبئی میں ٹھیرنا ہوا تو مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں راقم الحروف بھی مولوی جمیل احمد مرحوم سے ملنے کے لیے گیا۔ اُن کے پیر میں زخم ہو گیا تھا۔ ذیابیطس کے مریض کو اللہ تعالیٰ چوٹ اور زخم سے محفوظ رکھے، یہ مرض زخم کے اندمال کا دشمن ہے۔ شکیلؔ کے والد اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے، شکیلؔ کو بھی ذیابیطس ورثہ میں ملی تھی، تقریباً پانچ سال سے یہ مرض شدت اختیار کر گیا۔ کئی کئی مہینے بمبئی سے باہر دیولالی اور ماتھران جیسے صحت بخش مرتفع مقامات پر قیام کیا۔ ہر قسم کا علاج کرایا مگر فائدہ ہونے کی بجائے

اُس سے زیادہ موذی مرض دق لاحق ہوگیا۔ پھر وہ کمزور نحیف ہوتے چلے گئے، بھساول کے مشہور شاعر قمرؔ صاحب کا میرے نام خط آیا کہ شکیلؔ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں، کئی مہینہ بھساول میں قیام کرنے کے بعد ممبئی واپس چلے گئے۔ قمر بھساولی کا خط اس سانحہ کی پیشگی خبر دے چکا تھا جس کے سننے کے لیے کان کسی طرح تیار نہ تھے، چنانچہ یہی ہوا کہ چھ سات دن بعد ریڈیو سے شکیلؔ کے انتقال کی خبر سُنی گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

تابشؔ دہلوی، محشرؔ بدایونی، اقبال صفی پوری اور راقم الحروف مولانا ضیاء القادری کے یہاں تعزیت کے لیے گئے تو وہ خود برسوں سے صاحب فراش ہیں اور جی کیا رہے ہیں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں وہاں ایک صاحب جو شکیلؔ کے عزیز بھی ہیں اور ممبئی آتے جاتے رہتے ہیں یہ معلوم کرکے بڑی اذیت ہوئی کہ شکیلؔ مرحوم کی علالت کے زمانے میں ان کے گھر والوں کا سلوک شکیلؔ کے ساتھ ہمدردانہ نہیں رہا——— گناہ برگردن راوی (واللہ اعلم بالصواب)

شکیلؔ نے اپنی شہرت ومقبولیت کا شباب اپنی آنکھوں سے دیکھا، دولت کی بھی ریل پیل رہی، اب زمانہ دولت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے اور شہرت ومقبولیت کے اور زیادہ امید افزا اور مسرت بخش نتائج ومظاہر دیکھنے کا آیا تو اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

شکیل بدایونی فلمی گیتوں کا مہاکوی (ملک الشعراء) تھا، اُس کے نغموں میں بڑی شعریت ہوتی تھی، فلمی دنیا میں آنے سے پہلے شکیلؔ کی غزلوں کا یہ رنگ۔

کیا کیا شکایتیں ہیں دل بدنصیب سے —— اک دن کسی کو دیکھ لیا تھا قریب سے

انہیں میرا خیال آتا تو ہوگا —— جفاؤں پر ملال آتا تو ہوگا

کتنا چوکھا تھا، فلمی مشغولیت اس رنگ تغزل پر اثر انداز ہوئی ——— شکیلؔ کی نعتیہ غزل کا تنہا یہ مصرعہ نظموں اور غزلوں پر بھاری ہے۔

مری آرزو محمدؐ، مری جستجو مدینہ

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۰ء)

آغا شورش کاشمیری

شورش کاشمیری کا نام تقسیم ہند سے پہلے بھی سنا تھا مگر اُن سے تعارف پاکستان بننے کے بعد ہوا اور یہ تعارف بھی کئی برس تک غائبانہ ہی رہا۔ "چٹان" میں اُن کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا اور ذہن و فکر نے اچھا اثر قبول کیا۔ ہفتہ وار "چٹان" جتنا مقبول ہوتا گیا، شورش کی شہرت بھی بوئے گل کی طرح پھیلتی چلی گئی، انہوں نے شہرت اور دولت جو کچھ بھی حاصل کیا اپنی قدرتِ بازو سے حاصل کیا یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے ادب و صحافت کا دبستان بن گئے۔

۱۹۵۱ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے، مشہور ادیب، ناول نگار، مترجم اور صحافی رئیس احمد جعفری مرحوم دفتر "فاران" میں تشریف لائے اور ایک مضمون چھپنے کے لیے عنایت فرمایا۔ یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق تھا۔ اس میں مولانا آزاد کے آبائی وطن ــــ کھیم کرن ــــ کی نشاندہی کی گئی تھی اور ان کے سفرِ عراق و مصر پر تنقید تھی، اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا آزاد نے اپنے بارے میں بعض واقعات صحیح نہیں لکھے، میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس مضمون کو شائع کر دیتا کہ یہ پاک و ہند کے کثیر التصانیف نامور ادیب (رئیس احمد جعفری) کا مضمون تھا جو دوسرے رسالوں میں معاوضہ لے کر مضامین لکھتے تھے ــــ مگر میں نے اُن کا مضمون نہیں چھاپا اور مولانا آزاد کے بارے میں بعض واقعات کی وضاحت خود ان کے قلم سے ضروری سمجھی، چنانچہ میں نے مولانا آزاد کی خدمت میں رجسٹری کے ذریعہ عریضہ ارسال کیا جس میں اُن کے آبائی وطن، مولد و منشاء اور سفرِ مصر کے بارے میں چند سوالات کیے گئے تھے! اُن دنوں پاکستان اور ہندوستان میں ڈاک آتی جاتی تھی اور رسل و رسائل اور آمد و رفت کے تمام راستے کھلے ہوئے تھے! دو ہفتہ اپنے خط کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں نے دوسرا خط بھی رجسٹرڈ ہی بھیجا اور اس خط

میں بھی ان سوالات کو دہرایا مگر میرے کسی خط کا جواب نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے مولانا آزاد کے آبائی وطن اور سفر مصر وغیرہ کے بارے میں از خود تحقیق کی اور اس تحقیق کا خلاصہ ایک طویل مضمون کی شکل میں پیش کر دیا، ہندوستان کے اخبارون اور رسالوں میں مولانا آزاد کے بعض عقیدت مند اہلِ قلم نے میرے مضمون کا جواب تو دیا مگر صرف طنز و تعریض اور جھنجلاہٹ، حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ شواہد و دلائل سے میرے اعتراضات رفع کیے جاتے! اس سلسلہ میں "فاران" میں دو تین مضامین اور آئے۔ شورش کاشمیری نے مولانا آزاد کی مدافعت اور حمایت میں راقم الحروف پر شدید تنقید کی اور ہفتہ وار "چٹان" میں یہ تک لکھ دیا کہ ماہر القادری کا نسبی تعلق اودھ کے معزول فرمانروا واجد علی شاہ کی ایک ممنوعہ حرم سے ہے ؎ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے۔ اور اس عجیب و غریب ذہنی جدت و اختراع پر ناطقہ سر بگریباں اور خامہ کو انگشت بدنداں ہونا پڑا۔ شورش صاحب سے جب ملاقاتیں ہونے لگیں تو اُن کی اس تنقید کا ذکر آیا، فرمانے لگے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کوئی اولاد بھی نہیں چھوڑی جو اُن کی مدافعت کر سکتی، اُن کا کوئی شاگرد بھی نہیں ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ کو کیا ہر شخص کو مولانا آزاد کی مدافعت کا حق حاصل ہے مگر مدافعت کو بے سروپا تہمت تو نہ بننا چاہیے۔

جب بھی میرا لاہور جانا ہوتا مفتی محمد شفیع[۱] مدظلہ کے صاحبزادے مولانا زکی کیفی کے یہاں ٹھہرتا، (اب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) انارکلی میں کیفی مرحوم کی کتابوں کی دکان کا نام "ادارہ اسلامیات" ہے۔ اسی ادارے میں راقم الحروف کی زیادہ تر نشست رہتی اور احباب سے ملاقات کا یہی ٹھکانا تھا۔ ادارہ اسلامیات ہی میں شورش صاحب سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت کے ساتھ معانقہ کیا اور طنز و مزاح کی پھلجھڑیوں اور مزیدار باتوں کے شکرپاروں سے میری تواضع کی، یہ غالباً ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے۔

لاہور میں آغا شورش کاشمیری اور راقم الحروف کی ملاقات کا مرکز ادارۂ اسلامیات تھا، ایک بار فرمایا کہ میرے یہاں کسی دن کھانا کھائیے، تاریخ اور وقت مقرر نہیں ہوا

---

[۱] حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

تھا، تیسرے دن تشریف لائے تو بولے "بھئی! نورجہاں باہر چلی گئی ہے" اپنی بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ تھا کہ جب گھر کی مالکہ ہی نہ ہوگی تو دعوت کا اہتمام کون کرے گا! اب سے دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے۔ شورش مرحوم کراچی تشریف لائے، مجھے فون کیا اور اپنے خاص لہجہ میں بولے:

"میں آج صبح لاہور سے کراچی آیا ہوں، حضور[1] سے ملے بغیر لاہور واپس نہیں جاؤں گا۔"

میں نے عرض کیا تو پھر غریب خانہ پر شام کو تشریف لاکر میرے ساتھ چائے پیجئے، بولے "بہت اچھا! ضرور حاضر ہوں گا۔" وقت بہت ہی تنگ تھا پھر بھی میں نے چند احباب کو بلا لیا۔ شورش صاحب کا انتظار کرتے کرتے شام کی چائے مغرب کے قریب پی گئی، میں متوقع تھا کہ وہ شاید فون پر اپنے نہ آنے کا سبب بتائیں گے اور اس تفصیل میں تھوڑی بہت معذرت کی جھلک بھی ہو سکتی ہے مگر یہ اُن کا مزاج ہی نہ تھا۔

سنہ ۱۹۶۱ء کا واقعہ ہے نخشب جارچوی مرحوم، نواب زادہ شمشاد علی خاں کی کوٹھی (فیروز پور روڈ) میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں بھی غالباً جہانیاں میں مشاعرہ پڑھ کر آیا تو انہی کے ساتھ قیام کیا، انہی دنوں آغا گل صاحب کی کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی، آغا صاحب نے چائے نوشی اور شوٹنگ دیکھنے کی دعوت دی، مغرب کے بعد نخشب جارچوی، ذکی کیفی اور راقم الحروف شوٹنگ دیکھ رہے تھے، اتنے میں حمید نظامی مدیر "نوائے وقت" اور آغا شورش وہاں تشریف لے آئے اور مجھے دیکھتے ہی آغا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:- "ماہر صاحب! آپ کا یہی صحیح مقام ہے "جمنا کا کنارا" جیسی رنگین نظم کہنے والا جماعت اسلامی میں کہاں جا پھنسا۔"

دوسرے دن شورش ادارہ اسلامیات میں تشریف لائے اور بولے کہ میں رات کے واقعہ پر نظم کہوں گا۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ میں نے تو نظم شروع بھی کر دی اور ارتجالاً یہ شعر پڑھا:

لطف لینے کا جہاں جذبہ بھی تھا کوشش بھی تھی ہائے! وہ محفل جہاں شورش بھی تھا شورش بھی تھی

---

[1] غالباً "حضور" ان کا تکیہ کلام تھا۔

اُن کے جانے کے بعد مولانا ذکی کیفی نے کہا کہ آغا شورش اب نظم نہیں کہیں گے!

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں آغا شورش دو تین بار قید و بند کی مصیبت میں مبتلا ہوئے مگر انہوں نے بڑی عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا، ایک بار بھوک ہڑتال بھی کی تھی، اور کئی دن تک مسلسل ترکِ غذا نے اُن کی صحت کو بہت کچھ متاثر کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے بھوک ہڑتال ختم ہوئی، پھر وہ کراچی ہسپتال میں جیل خانہ سے منتقل کر دیئے گئے مگر یہ بھی رہائی نہیں اسیری ہی کی ایک صورت تھی۔ جب تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہے پولیس کے پہرے چوکی میں رہے، کوئی شخص اُن سے مل نہیں سکتا تھا۔ اُن کے ایک دوست کے توسط سے جن سے میری بھی شناسائی تھی، شورش کی خیر خبر ملتی رہتی، اُن کے دوست کہا کرتے تھے کہ آغا صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ پھر ایک دن وہ شورش صاحب کا ایک پرچہ لے کر آئے جس پر غالب کا یہ مصرع ـــ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا ـــ لکھا تھا میں نے جماعت اسلامی کے دفتر کے ایک دو ذمہ دار کارکنوں سے کہا کہ آغا شورش سے سول ہسپتال میں میری ملاقات کا بندوبست کرا دیجیے وہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں اور میں بھی بے تاب ہوں۔ انہوں نے دبے لفظوں میں مروتاً ہامی تو بھر لی مگر مجھے اطلاع نہیں دی کہ ان صاحبوں نے کوشش کی یا نہیں اور اس کا کیا نتیجہ نکلا، توڑ جوڑ، اور وہ چیز جسے "تکڑم" کہتے ہیں، جماعت اسلامی والوں کا یہ مزاج ہی نہیں ہے۔ تن بہ تقدیر ایک دن میں گھر سے اللہ کا نام لے کر سول ہسپتال کے لیے چل پڑا جس پرائیویٹ وارڈ کے کمرے میں جناب آغا شورش کو رکھا گیا تھا اُس کے زینہ پر سپاہیوں کا پہرا تھا، مگر میں زینہ پر چڑھتا چلا گیا۔ کسی نے مجھے نہیں ٹوکا، پہرے کے سپاہی شاید یہی سمجھے ہوں گے کہ میں کسی مریض کو دیکھنے کے لیے آیا ہوں، پھر میں آغا شورش کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ وہاں دو سپاہی متعین تھے، میں نے کہا آغا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، انہوں نے قدرے تیز لہجہ میں جواب دیا۔ "ان سے ملنے کی ممانعت ہے۔" میں نے اصرار کیا تو بولے آپ ہمارے ایس آئی صاحب سے بات کیجیے۔ میری اور پہرے کے سپاہیوں کی گفتگو سُن کر اندر کے کمرے سے باوردی سب انسپکٹر صاحب برآمد ہوئے اور انہوں نے بھی نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا کہ آغا صاحب

کا دُور ہی سے دیدار کرا دیجیے اور اندر جانے کی آپ اجازت دیں تو آپ کی مہربانی۔ آپ بھی وہاں بیٹھے رہیں، اُن سے سلام دُعا اور دو چار باتیں ہو گئیں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ میری اِلتجا کارگر ثابت ہوئی۔ ایس، آئی صاحب کا دل پسیج گیا، اور اب میں آغا شورش کے کمرے میں تھا وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے میں نے بڑھ کر بلکہ جُھک کر اُن سے معانقہ کیا کہ انہیں اٹھنا نہ پڑے۔ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دس بارہ منٹ ہم دونوں کی بات چیت رہی۔ میں نے چلتے ہوئے عرض کیا — آپ آئندہ بھوک ہڑتال نہ کیا کریں، کل کلاں کو کچھ ہو ہوا گیا تو یہ موت دینی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہیں سمجھی جائے گی۔

جب میں آغا شورش کاشمیری کے کمرے سے دروازے پر آیا تو ایس، آئی صاحب نے تشویش کا اظہار کیا۔ بولے آغا صاحب سے ملنے کی مجھے اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ نیچے کے پہرے والوں نے پوچھ گچھ کی اور اس بات کا پتہ لگ گیا تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ میں نے کہا آپ نشاطِ خاطر رکھیں آپ سے پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ میں زینے سے اتر کر وہاں آیا جہاں پہرے کے سپاہی متعین تھے اور وہاں اطمینان کے ساتھ دو تین منٹ کھڑا رہا، کسی اضطراب یا بدحواسی کا اظہار کرتا تو بازپُرسی کا اندیشہ تھا۔

آزاد کشمیر کے صدر مقام مظفر آباد میں یومِ اقبال منایا گیا۔ آغا شورش کاشمیری نے بڑی دھوم کی تقریر کی۔ ایوب خاں کا دورِ حکومت تھا، ایک پتنگا اڑتا ہوا اُن کے قریب آن پہنچا، آغا شورش اُسے پکڑ کر چٹکی سے مسلتے ہوئے اپنے خاص انداز میں بولے: "یہ B.D. کا ممبر کہاں سے آگیا" تمام مجمع بے اختیار ہنس پڑا۔ ایوب خاں کے طرزِ حکومت اور اُن کی خود ساختہ بیسک ڈیموکریسی پر یہ بھرپور طنز تھی۔ اس جلسہ میں راقم الحروف کی بھی تقریر تھی، دونوں تقریریں آزاد کشمیر ریڈیو سے بعد میں نشر ہوئیں!

جس جلسہ میں آغا شورش تقریر کرتے اور اُس میں راقم الحروف بھی ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے روئے سخن میری ہی طرف رہتا۔ انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں "شامِ انور" کے مخصوص مقرر آغا شورش ہی تھے، تقریر شروع کرتے کے چند منٹ بعد بولے ——— یہ ماہر صاحب لفظ و بیاں اور روزمرہ کی غلطیاں پکڑتے رہتے ہیں، فلاں مصرع میں فلاں لفظ کا الف دب گیا ——— مضمون نگار نے مذکر لفظ کو

مونث لکھ دیا۔۔۔۔ یہ محاورہ یوں نہیں یوں ہے ——— اہلِ زبان اس طرح نہیں بولتے!

چار برس پہلے کی بات ہے مجلسِ اتحاد العلماء کے زیرِ اہتمام لائل پور میں سیرۃ النبیؐ کے کئی اجلاس ہوئے، دن میں میونسپل ہال میں علمی مقالے پڑھے جاتے اور تقریریں ہوتیں۔ ایک نشست میں راقم الحروف نے بھی تقریر کی، شب میں کھلے اجلاس ہوتے جس دن آغا شورش کاشمیری کی تقریر تھی، جلسہ گاہ میں دُور تک آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے، مجمع ڈیڑھ لاکھ سے کیا کم ہوگا! میرے شیر نے وہ دھواں دھار اور طوفانی تقریر کی کہ پورے ماحول کو شعلہ جوالہ بنا دیا، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر اس قدر کس کر تنقید کر ڈالی جیسے مقرر کو اپنا مال و دولت عزیز ہے نہ آرام و راحت سے دلچسپی ہے ——— اور نہ اپنی جان پیاری ہے۔ میں اسٹیج ہی پر بیٹھا تھا بار بار مجھے مخاطب فرماتے تھے ——— کیوں ماہر صاحب سُنا آپ نے ——— آپ اس بات کے گواہ رہیں ——— اے ماہر القادری! پاکستان میں یہ بھی ہو رہا ہے ——— میں ڈر رہا تھا کہ آغا شورش کی شعلہ فشاں جرح و تنقید کی تائید کے جرم میں میں کہیں میں نہ دھر لیا جاؤں! اس تقریر کے ڈیڑھ دو مہینہ بعد آغا صاحب گرفتار کر لیے گئے۔ انہوں نے رہائی کے بعد شکوہ کیا کہ جس لائل پور میں ڈیڑھ لاکھ کا مجمع "شورش زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا اس کی گرفتاری پہ لائل پور کے سو آدمیوں نے بھی احتجاج نہیں کیا۔

مشہور شخصیتوں پر تنقید کرنے میں وہ خاصے جری اور بیباک تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ کے شروع شروع میں بہت مداح تھے۔ انہوں نے "چٹان" میں اس کا اعتراف کیا کہ دہریوں اور کمیونسٹوں سے جیل خانہ میں پالا پڑا اور ان کی صحبت میں میرے دینی عقائد متزلزل ہو جاتے مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر نے مجھے بچا لیا، پھر انہوں نے اس مدح و ستائش کے بعد مولانا مودودی پر ایکا ایکی جرح و تنقید کی چاند ماری شروع کر دی۔ تقریباً سال سوا سال تک یہی لب و لہجہ رہا۔ انہی دنوں جب ہفتہ وار "چٹان" میں مولانا مودودی پر تنقید جاری تھی میرا لاہور جانا ہو گیا، ادارۂ اسلامیات میں آغا شورش کاشمیری سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو مودودی صاحب کے بڑے مداح تھے، ان کے بارے میں آپ کی رائے کیسے بدل گئی، فرمایا بڑے بڑے لوگ سب میری والدہ کی موت پر تعزیت کے لیے میرے مکان پر آئے مگر مولانا مودودی کو اتنی توفیق نہیں

ہوئی، میں اُن کی شخصیت ...... !" میں نے اس کے جواب میں مولانا موصوف کی بیماری کا عذر پیش کیا۔ ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہا کہ آپ کی والدہ محترمہ کی وفات پر اُن کا آپ کے یہاں پُرسے کے لیے نہ آنے سے اُن کے علم و فضل اور سیرت و کردار سب کے سب بے وقعت کیسے ہو گئے ...... مگر میری کسی دلیل کو آغا صاحب نے کوئی اہمیت نہیں دی! اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی روش پھر بدلی، اُن کے جی میں اللہ تعالیٰ نے نیکی ڈال دی، مولانا مودودیؒ پر جتنی جرح و تنقید کی تھی اُس سے کہیں زیادہ مدح و ستائش سے تلافی کی، یہاں تک کہ برسوں سے مرتے دم تک شورشؔ مرحوم مولانا کے عقیدت مند اور ستائش گر رہے۔ مولانا مودودیؒ کے مخالف علماء خاص طور سے مولوی غلام غوث ہزاروی کو دنداں شکن اور منہ توڑ جواب دیئے۔ مولانا مودودیؒ کی مشہور کتاب "خلافت و ملوکیت" پر بعض ناقدین نے بڑی لے دے کی مگر شورشؔ مرحوم نے اس کتاب کو بہت کچھ سراہا اور اُسے تاریخ دانی اور تحقیق کا شاہکار قرار دیا۔ اُن کے دل و دماغ میں مولانا مودودیؒ کی محبت اور عقیدت رچ بس گئی تھی اور زبان و قلم سے وہی نکلتا تھا جو دل میں تھا۔ شیخ ضمیر الدین صاحب نے ایک بار خود شورشؔ صاحب کی موجودگی میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودیؒ کو شورشؔ کی شکل میں ایک سونٹا عطا کر دیا ہے۔

آغا شورشؔ کاشمیری نے اپنے تیشہ قلم سے بڑی بڑی شخصیتوں کے پندار کے بُت توڑے ہیں مگر کبھی کبھار ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم جیسی مرنجاں مرنج شخصیتیں بھی اس بُت شکنی کے لپیٹ میں آجاتیں۔ بعض اوقات احساسِ برتری کے جذبہ کی تسکین ہدف و تصادم ہی سے ہوتی ہے!

راقم الحروف سے آغا شورشؔ کاشمیری ایک گونہ ربط رکھتے تھے، اپنی بعض نظموں میں مجھ ہیچمدان کا نام لیا ہے، جب بھی خط لکھنے کی نوبت آتی ہر خط میں اپنے دوستانہ روابط کا ضرور ذکر فرماتے! مگر ان کی ایک روش "نظر انداز" کرنے کی روش بھی تھی مثلاً میں نے کئی کئی مہینے مسلسل "فاران" اُن کی خدمت میں بھیجا، لیکن انہوں نے "چٹان" تبادلہ میں جاری نہیں فرمایا! انہوں نے اپنی کتاب تبصرے کے لیے ڈاک سے بھیجی تو میں نے "فاران" میں پہلی فرصت میں ریویو کر دیا مگر میں نے اپنی کتاب "کاروانِ حجاز" جبیس ہوٹل (کراچی) میں خود جا کر دی تو اُس پر "چٹان" میں تبصرہ نہیں آیا ہو سکتا

ہے کہ میری کتاب ہوٹل کی الماری یا میز کی دراز میں رکھ کر بھول گئے ہوں۔

فاران کے "توحید نمبر" کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تیسرے ایڈیشن کی ڈیڑھ سو دو سو کاپیاں فروخت ہونے سے رہ گئی تھیں، میں نے ہفتہ وار "چٹان" کے منیجر کے پتہ پر "توحید نمبر" کا اشتہار بھیجا اور لکھا کہ اس کی جو اُجرت ہو اُس کا بل بھیج دیا جائے "بل" آتے ہی رقم ادا کر دی جائے گی۔ "توحید نمبر" کا خاصہ طویل و عریض اشتہار "چٹان" میں چھپا مگر منیجر کا خط آیا کہ آپ سے اشتہار کی اجرت نہیں لی جائے گی۔ اس ایک اشتہار پر "توحید نمبر" کے ستر اسی آرڈر آ گئے! یہ آغا شورش کی اعلیٰ ظرفی، سیر چشمی اور دوست نوازی کی دلیل تھی۔

سال سوا سال ہوا "فاران" میں پروفیسر محمد سرور کی کتاب "عبیداللہ سندھی" پر مفصل تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہ تبصرہ ایک مشہور اہلِ قلم کو جو مولانا عبیداللہ سندھی کے عقیدت مند ہیں، پسند نہیں آیا۔ انہوں نے نہ جانے آغا شورش کو خط میں کیا لکھ دیا کہ آغا صاحب نے "چٹان" میں مجھ پر تنقید[1] کر ڈالی۔ میں نے آغا شورش کی خدمت میں خط بھیجا کہ میں نے تو کئی برس سے مولانا آزاد کے بارے میں کوئی مضمون نہیں لکھا، ہاں! پروفیسر سرور کی کتاب "عبیداللہ سندھی" پر فاران میں تنقید کی تھی۔ یہ تنقید آپ "چٹان" میں میرا نام لکھے بغیر چھاپ بھی چکے ہیں، پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالہ سے یا اُن کی مدافعت پر جرح و تنقید کس لیے کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں اُن کا جو خط آیا تھا وہ حسنِ اتفاق سے میرے کاغذوں میں محفوظ رہ گیا۔

۱۷ جنوری ۵۷ء

ماہر صاحب محترم و مکرم!

سلام مسنون! آپ کا خط ملا، فاران بھی پہنچ گیا ہے، ایک آدھ روز میں آپ کو تفصیلات لکھوں گا!

بیماری جا چکی ہے، توانائی واپس نہیں آ رہی ہے، مولانا آزاد سے متعلق میرے جذبات نہایت نازک ہیں آپ سے تعلقِ خاطر ہے ــــ

---

[1] میرے پاس چٹان کی اس تنقید کے بعد کئی حضرات کے خط آئے، اسنے یہی لکھا کہ آپ اس کا جواب دیں۔ اُن سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں ہے۔ معاملہ اسی نوبت پر رک جائے تو غنیمت ہے۔

"قلم قتلے" یوں کہئے دل کی مخلصانہ ٹیس تھے۔

میں آپ سے اس سلسلہ میں مفصل بات چیت کرنا چاہتا ہوں، صحت ساتھ دے تو عرض کروں، بہر حال میرے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں کہ مجھے آپ سے تعلقِ خاطر نہیں رہا، میں جس مسلک کا انسان ہوں اس میں دوستی کے رشتے پائدار ہوتے ہیں۔

والسلام۔ آپ کا مخلص
شورش کاشمیری

اس خط کے دو ڈھائی مہینے بعد وہ کراچی تشریف لائے، جبیس ہوٹل میں قیام فرمایا، مجھے ٹیلیفون کیا مغرب کے بعد میں آغا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا، ایک دو ملنے والے بھی بیٹھے تھے۔ آغا شورش مرحوم حسب معمول خندہ پیشانی کے ساتھ ملے مولانا ابوالکلام آزاد پر انہوں نے جو کتاب لکھی ہے اُس کا مسودہ اُن کے ساتھ تھا اُس کے بعض حصے سنانے شروع کیے، مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی کے روابط کا ذکر آیا، میں نے عرض کیا آپ اس مسئلہ کو نہ چھیڑیں تو اچھا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم "الہلال" کے نائب مدیر اور مولانا آزاد کے شریکِ کار تھے۔ "الہلال" کے بعض اداریے اور شذرات سید صاحب نے لکھے تھے مثلاً "مشہدِ اکبر" مشہور اداریہ سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے زورِ قلم کا شاہکار ہے، جن مضامین پر لکھنے والوں اور ترجمہ کرنے والوں کے نام نہیں تھے ناشرین نے ان مضامین کے مجموعے "مضامین ابوالکلام آزاد" کے نام سے چھاپ دیئے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بعض اُن مضامین کی نشاندہی فرمائی جو مولانا آزاد سے غلط منسوب کیے گئے تھے، سہ روزہ "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر نے مولانا آزاد سے ملاقات کی اور علامہ سید سلیمان ندوی کا الہلال کے مضامین کی نسبت سے ذکر نکلا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے واضح طور پر تردید نہیں فرمائی کہ یہ مضامین میرے نہیں ہیں بلکہ ایک مبہم سی بات کہی کہ اچھا! سید صاحب کہتے ہیں تو انہی کے مضامین ہیں ......! میں نے دوسرا واقعہ آغا شورش سے یہ بیان کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر فرمایا ہے کہ اُن کے والد نے جو بیس لاکھ روپیہ سے جو اُن کے معتقدین نے چندہ کے طور پر دیئے تھے، حجاز کی مشہور نہر زبیدہ کی مرمت کرائی تھی، راقم الحروف نے نہر زبیدہ کی تاریخ کا پتہ لگایا، کتاب مل

گئی اُس میں لکھا تھا کہ دُنیا کے مسلمان ملکوں کے نمائندوں کی ایک کمیٹی بنی تھی جس میں ہندوستان کے نمائندے مولانا رحمت اللہ کیرانوی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد اس کمیٹی کے رکن بھی نہیں تھے۔ تمام مسلمان ملکوں سے چندہ کیا گیا اور چوبیس لاکھ کی رقم سے نہر زبیدہ کی مرمت ہوئی! —— میں نے آغا شورش کی خدمت میں عرض کیا کہ ناقدین اور معترضین کو بُرا بھلا کہنے سے مولانا آزاد کی مدافعت نہیں ہوتی، دلیل کا جواب دلیل سے دینا چاہیئے۔

اس گفتگو میں شیخ ضمیر الدین صاحب (حلوہ مرچنٹ) اور ایک دوسرے صاحب بھی موجود تھے، ان حضرات کی ہمدردی اور رجحان شورش صاحب کی طرف تھا اور میں اپنے کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ شیخ صاحب اپنے ساتھ ٹفن کیریر میں کھانا لے کر بھی آئے تھے۔ کھانا میز پر لگایا گیا، تو میں نے معذرت کی۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ آپ کھانا نہیں کھائیں گے تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ اُن کے شدید اصرار پر میں بھی شریک طعام ہوگیا، کھانے کے ساتھ آغا صاحب کی دلچسپ باتیں اور مزہ دے گئیں، پھر چائے کا دَور چلا، شورش مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

لاہور جاکر آغا شورش نے مجھے خط لکھا کہ مولانا آزاد صداقت کا نام ہے میں نے جواب میں عرض کیا آزاد ذہانت کا نام ہے، انہوں نے حکومت الٰہی کا بے شک صور پھونکا تھا اور انگریز جو اُن کے نزدیک طاغوت تھا، اُس کے مقابلہ میں کلمۂ حق بلند کیا تھا مگر آخری عمر میں ہندو جو انگریز سے بڑا طاغوت تھا اس کی حکومت کی وزارت قبول فرمالی اور جس محکمہ (تعلیم) کے مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تھے اس کے مرتبہ نصاب کی کتابوں میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی تاریخ مسخ کر کے بیان کی گئی مثلاً مسجد کی یہ تعریف کی گئی —— کہ مسجد مسلمانوں کا مندر ہے جس میں وہ پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اس قسم کی تحریف اور غلط بیانیوں کا کوئی نوٹس تک نہیں لیا...... !

ہفتہ وار "چٹان" میں تردید و اختلاف کے محاذ قائم ہوتے رہتے اور پھر یہ ہنگامے دب جاتے، ہفتہ وار "شہاب" اور "چٹان" کے مابین اتنی شدید معرکہ آرائی ہوئی کہ خدا کی پناہ! شہاب کے مدیر جناب کوثر نیازی اور حضرت شورش ایک دوسرے کے اندر باہر کے حالات سے واقف تھے اس لیے نوبت خاندان و نسب اور گھریلو معاملات

تک پہنچ گئی۔ مشہور احراری رہنما مولانا احسان احمد شجاع آبادی نے بیچ میں پڑ کر اس ناگوار بحث کو ختم کرایا۔

آغا شورش نے مسٹر غلام مصطفیٰ کھر کی گورنری کے مستبد دور میں کلمۂ حق بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی! کھر کے ذاتی کردار و حالات کا "چٹان" میں ایسا تجزیہ کیا کہ کھر صاحب چیں بول گئے، مسٹر کھر تنقید کی تاب نہ لاکر شورش مرحوم کے مکان پر پہنچے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر اس دن سے آغا شورش نے ان کے خلاف لکھنا موقوف کر دیا اور مرتے دم تک اپنی اس بے تعلقی اور سکوت کی روش کو نباہتے رہے! کھر سے ملاقات کے بعد اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ کھر بُرا آدمی نہیں ہے!

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی مخالفت میں نظم و نثر کے عنوان اور لب لہجہ بدل بدل کر "چٹان" میں بہت کچھ لکھا، وہ چیز جسے شعر و ادب کی زبان میں علامیت (SYMBOLISM) کہتے ہیں اور مجاز مرسل، ایہام و کنایہ، رمز و اشاریت، تشبیہات اور استعاروں کا تمام میکزین ہجو و تنقید میں صرف کر دیا، اُن کی بیباکی، حرف برہنہ اور حق گوئی کی دھوم مچی ہوئی تھی، مگر سُنا ہے کہ مسٹر بھٹو نے بھی شورش صاحب کے مکان پر قدم رنجہ فرمایا، اس کے بعد عزت مآب وزیر اعظم کے خلاف تنقید کا باب بند کر دیا اور یہ بساط ہی تہہ کر کے رکھ دی گئی! ؎ انقلابات ہیں زمانے کے

آغا شورش کثیر الاولاد تھے، اُن کی جوان بچیوں اور بچوں میں شاید کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ آغا شورش اپنے انداز قلندریت کے باوجود معیشت و روز گار اور انتظامی معاملات میں اچھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، انہیں کوئی شخص دھوکا نہیں دے سکتا تھا، خرچ اخراجات کے باب میں وہ محتاط تھے، "چٹان" خاصہ مقبول تھا ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے بھی کئی کئی ایڈیشن چھپے اور فروخت ہو گئے، اُن کی آمدنی خرچ سے بہت زیادہ تھی، اپنے گھر والوں کو انہوں نے فقر و فاقہ اور تنگی ترشی نہیں ترفہ و آسودگی کی حالت میں چھوڑا ہے۔ اُن کی اولاد نے نامور باپ کے مالی ترکہ کی حفاظت کی تو وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں گے! آغا شورش کے مزاج میں تیزی اور اشتعال بھی تھا گھر میں کبھی کھٹ پٹ ہو جاتی تو پاس پڑوس کے مکانوں کے دریچے کھل جاتے۔

آغا شورش انگریز کے دور میں جب پہلے پہل جیل گئے ہیں تو اُن کی عمر بہت سے

بہت اُنیس بیس برس کی ہوگی انہوں نے انگریز کے عہدِ استبداد میں اور پاکستان بننے کے بعد بھی حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی مصیبتیں مردانہ وار برداشت کیں! جس چیز کو غلط سمجھا اُس کی تردید و تنقیص میں زمین و آسمان ایک کر دیئے، جس بات کو حق سمجھا اُس کی حمایت میں پس و پیش نہیں کرتے تھے چاہے موجِ خون ہی سر سے کیوں نہ گزر جائے! وہ اپنے سامنے بڑے بڑے قدآوروں کو بونا سمجھتے تھے۔

تقریر، تحریر اور شاعری پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی! اُن کی تقریر کی دلچسپی سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتی، تقریر کرتے میں بعض اوقات موضوع سے دور بھی چلے جاتے تو بھی لذتِ تقریر میں کمی نہ آتی! نثر کی زبان صحیح، عبارت کی نوک پلک درست۔ الفاظ کا دروبست ہموار و متناسب! ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ شاعری میں بھی اُن کی طبیعت نے خوب جوہر دکھائے، ان کی نظموں میں کس قدر تنوع اور بوقلمونی تھی، پھر پُرگوئی اور قدرتِ کلام کا یہ عالم کہ دس بارہ شعروں کی غزل یا نظم چند منٹ میں کہہ کر دم لیتے! مشاعرہ چاہے ریڈیو سے ہو یا ٹیلی ویژن سے کتنا ہی بھاری معاوضہ ملتا ہو مگر وہ مشاعرے میں شریک نہ ہوتے، کتنا ہی اصرار کیوں نہ ہو کسی ادبی نشست میں اپنا کلام نہ سناتے! اس وصف میں وہ منفرد شاعر تھے کہ اُن کی زبان سے اُن کا کوئی شعر نہیں سنا گیا۔ زبان کی طرح اُن کا قلم بھی شوخ تھا، شعر و ادب کی ایسی جامعیت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے، ان کی نثر و نظم پہلودار ہوتیں، ایک شعر اور ایک جملہ کے کئی کئی روپ!

تقریر میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، نثر میں مولانا ابوالکلام آزاد اور قومی نظموں اور صحافت میں مولانا ظفر علی خاں سے متاثر تھے، مگر اس تقلید و تاثیر کے باوجود خود ان کے یہاں انفرادیت بھی پائی جاتی تھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابوں کا انہوں نے خاصہ اثر قبول کیا تھا۔ وہ صرف ادیب، شاعر ہی نہیں سیاسی لیڈر بھی تھے۔ بھوک ہڑتال کے بعد جب وہ جیل سے چھوٹ کر لاہور پہنچے ہیں تو ہزاروں آدمیوں نے اُن کا استقبال کیا۔ خیر مقدم کرنے والے فرطِ عقیدت سے زمین پر بچھے جاتے تھے، دوسرے شہروں میں بھی اُن کے جلوس نکلے اور ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

لادینیت مغرب زدگی اور مذہبی آزادی اور تجدد کے خلاف بھی انھوں نے قلمی جہاد

کیا۔ اُن کی زبان و قلم سے دینی محاذ کو تقویت ملی۔ علماء دیوبند سے بہت متاثر تھے اور اہلِ بدعت کے علی الرغم شہداء بالاکوٹ اور توحید شناس مجاہدین سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کی فرضیت کے قائل تھے مگر اسلام سے اُن کی وابستگی فکری و نظری زیادہ تھی، اللہ تعالیٰ نے زیارتِ حرمین شریفین کی بھی توفیق عطا فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ان کو عشق تھا اور حضورؐ کی غلامی پر فخر و ناز کرتے تھے اسی لیے قادیان کے نبیٔ کاذب مرزا غلام احمد سے انتہائی نفرت تھی۔ قادیانیت کے خلاف زبان و قلم سے اُن کا جہاد جو آخری سانس تک جاری رہا، آغا شورش کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہے اور یہی کارنامہ ان کے لیے انشاء اللہ سندِ مغفرت ثابت ہوگا۔

آغا شورش کاشمیری مرحوم کی وفات حسرت آیات نے پاکستان کے طول و عرض میں غم و تاسف کی لہر دوڑا دی۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے، سرحد اسمبلی نے قرارداد تعزیت پاس کی، اخباروں اور رسالوں نے اداریے لکھے اور شعراء نے نظمیں کہیں۔ سب سے بڑا تعزیتی جلسہ لائل پور میں ہوا جس میں ایک لاکھ کے لگ بھگ سوگواروں کا مجمع تھا۔ اسلامی دنیا کے مفکرِ اعظم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے نقل و حرکت کی شدید تکلیف کے باوجود شورش مرحوم کے گھر جا کر تعزیت کی اور ہمہ شما کا کیا ذکر ہے حکومتِ پاکستان کے وزیرِ اعظم تعزیت کے لیے بذاتِ خود تشریف لے گئے۔ خواص و عوام اور ہر طبقہ کے لوگوں میں اتنی مقبولیت مرنے والے کی عظمت اور ہر دلعزیزی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور اپنی مغفرت سے شورش مرحوم کو نوازے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۷۶ء)

عبدالرحمٰن شوق امرتسری

شوقؔ امرتسری مرحوم اب سے تقریباً ۳۶ سال قبل ماہنامہ "عارف" (لاہور) کے ایڈیٹر تھے۔ مضامین اور کلام کی فرمائش کے سلسلہ میں اُن کی طرف سے مراسلت کا آغاز ہوا، پھر یہ رسمی خط و کتابت اور غائبانہ تعارف قریبی تعلقِ خاطر کی حد تک پہنچ گیا، انہی کے توسط سے ۱۹۳۷ء میں میرے افسانوں کا مجموعہ ـــــ طلسم حیات ـــــ ملک دین محمد اینڈ سنز (لاہور) نے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس پر "تعارف" انہی کے نام سے چھپا۔

عبدالرحمٰن شوقؔ امرتسری سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد لاہور میں ہوئی۔ بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ملے۔ مجھے جب بھی خط لکھتے "فاران" کے مضامین کی تعریف کرتے اور کبھی کبھار میرے دینی عقائد پر ہلکی سی گرفت بھی! جب میں دلائل کے ساتھ جواب دیتا تو پھر خاموش ہو جاتے اور "جواب الجواب" کی نوبت نہ آنے دیتے، ان کا رجحان کسی حد تک "بریلوی عقائد کی جانب تھا۔ ذاتِ رسالت مآبؐ سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے تھے، اس لیے قادیانیوں کے شدید مخالف تھے۔

ملک دین محمد اینڈ سنز کی فرم کی ملازمت میں ساری عمر گزار دی، انہی کے شوق و دلچسپی کی خاطر اس فرم کے مالکان رسالہ "عارف" کی اشاعت کے مصارف برداشت کرتے۔ "عارف" تقریباً تیس سال تک نکلتا رہا، پھر بند ہو گیا ـــــ!

"عارف" کا اداریہ عبدالرحمٰن صاحب شوقؔ امرتسری مدیر کی حیثیت سے لکھتے۔ "منکرینِ سنّتِ نبوی" کے گمراہ کن مسلک پر چوٹیں کرتے رہتے تھے یہ دلیل تھی اُن کی حقیقت پسندی کی۔

ساٹھ سال کے سن کو پہنچ کر اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی، بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر اسی سے کیا کم ہو گی۔ جہاں تک شعر گوئی اور مضمون نگاری کا تعلق ہے اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے — اُن کی تھوڑی بہت جتنی بھی شہرت تھی اسی پر قانع تھے۔ اپنی بساط اور حد سے زیادہ بڑھنے اور اونچا ہونے کی کوشش نہ کرتے! انہوں نے علم و فن اور شعر و ادب میں اپنی چادر کا طول و عرض دیکھ کر ہی پاؤں پھیلائے۔ مزاج میں سادگی تھی۔ اُن سے حیدرآباد دکن اور کراچی سے خط و کتابت رہی۔ ایک بار تھوڑی دیر ملاقات کا موقع ملا اُن کے کسی دوست اور عزیز سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی اس لیے شوقؔ مرحوم کی زندگی کے بارے میں میری معلومات بہت زیادہ مجمل ہیں — اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۷۱ء)

شوکت تھانوی

اب سے تقریباً ۳۶ سال قبل ۱۹۲۸ء میں شوکت تھانوی مرحوم کے چند مزاحیہ افسانے رسالوں میں نگاہ سے گزرے، یہ اُن سے میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا ــــــ ایک صاحب تھے نسیم سندیلوی (بی۔اے، آنرز) ماہنامہ "اضطراب" ان کی ادارت میں نکلتا تھا، اس رسالہ میں میری غزلیں اور مضامین بھی چھپتے تھے اور شوکت تھانوی کا شمار تو اس ماہنامہ کے سرپرستوں میں ہوتا تھا، ان کا مشہور افسانہ "امرود کا چور" مجلہ اضطراب ہی کی بدولت پڑھنے کو ملا، یہ وہ زمانہ تھا جب ملّا رموزی کی "گلابی اردو" کے ہر طرف چرچے تھے، اور اس دَور میں شاید ملّا رموزی ہی وہ تنہا انشاپرداز تھے، جن کے مضامین کا بعض رسالے معاوضہ دیتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) روزنامہ کی حیثیت سے بھی شائع ہوا، ملک نصر اللہ خاں عزیز اس کے ایڈیٹر تھے، میں ان دنوں حیدر آباد دکن میں تھا، اور ہر طرح آرام سے تھا، مگر صحافت نگاری کے شوق میں اس پُرسکون ماحول کو چھوڑ کر روزنامہ "مدینہ" کی ادارت میں شامل ہوگیا۔ بجنور آکر معلوم ہوا کہ جناب شوکت تھانوی نے بھی اسسٹنٹ ایڈیٹری کے لیے درخواست بھیجی تھی، لیکن تنخواہ کا معاملہ طے نہ ہوسکا۔

روزنامہ "مدینہ" چھ مہینہ نکل کر بند ہوگیا، اور میں پھر حیدر آباد دکن واپس آگیا۔ ۱۹۳۶ء میں وہاں سے کانپور کے مشاعرے میں آنا ہوا، کانپور سے لکھنؤ کیا دور تھا، پھر وہاں میرے ایک عزیز بھی رہتے تھے، اُن سے ملنے کے لیے لکھنؤ چلا آیا، چار باغ ریلوے اسٹیشن پر حضرت ارشد تھانوی نظر آئے، وہ بڑے تپاک سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولے:

"ان سے ملیے یہ شوکت تھانوی ہیں، شوکت تھانوی ....."

شوکت مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی .... مگر

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اُن سے بس مصافحہ ہو کر رہ گیا، چال ڈھال، وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ بڑے شائستہ اور سنجیدہ نظر آئے۔ میں حیران تھا کہ اتنا سنجیدہ آدمی، ادب انشاء کی دنیا میں مسکراہٹیں اور قہقہے لٹاتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء میں شوکت مرحوم سے ملاقات دلی کے کارونیشن ہوٹل کی ایک دعوت میں ہوئی، ان دنوں بھوپال میں بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شوکت صاحب نے اس مشاعرے کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے اُس کے انتظام و اہتمام سے اُن کا تعلق ہے۔ فرمانے لگے آپ کو اُس مشاعرے میں آنا ہے ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ بھوپال کے کوئی سینئر مجسٹریٹ اس مشاعرے کے کنوینر ہیں اور دلی کے چند شاعروں کے نام دعوت نامے آچکے ہیں، ایک دو شاعروں نے مجھ سے کہا کہ اُن صاحب کو تمہارا پتہ معلوم نہیں ہے، تم اپنا پتہ انہیں لکھ کر بھیج دو ـــــ میں نے عرض کیا کہ خدا کی مجھ پر لعنت ہو، جو میں مشاعرے کے داعی یا کسی منتظم کو اپنا پتہ لکھ کر بھیجوں، پھر وہ کہنے لگے تو ہم تمہارے پتہ کی انہیں اطلاع دیئے دیتے ہیں، میں نے تاکید اور شدومد کے ساتھ انکار کیا کہ آپ ایسا ہرگز نہ کریں۔ بھوپال کا مشاعرہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ مگر میرا وہاں جانا نہ ہو سکا۔

پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں شوکت تھانوی مرحوم سے جن دو ملاقاتوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ "ملاقاتیں" کیا تھیں، بس "آمنا سامنا" تھا، اُن سے اصل ملاقاتیں تو پاکستان بننے کے بعد ہوئیں، ہر ملاقات کے بعد میل جول میں اضافہ ہو جاتا، پھر اُن سے اتنی بے تکلفی ہوئی اور اس قدر یارانہ بڑھا کہ رکھ رکھاؤ، خودداری، تکلف اور متانت و سنجیدگی کا کوئی پردہ بھی حائل نہیں رہا۔

تقسیم ہند سے قبل شوکت تھانوی مرحوم مزاح نگار، انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور اور معروف تھے، میں نے ہندوستان کے کسی ایک مشاعرے میں بھی اُنہیں نہیں دیکھا، اُن کی شاعری کے جوہر تو پاکستان بننے کے بعد نمایاں ہوئے! اُن کی مزاحیہ نظمیں شائع ہوں

کو سچ مچ "کشتِ زعفران" بنا دیتیں، سننے والوں کو مشاعروں میں اُن کا انتظار رہتا، ہر بڑے مشاعرے میں اُنہیں بُلایا جاتا، اور وہ کامیاب رہتے۔

شوکتؔ تھانوی جب تک خاموش رہتے بڑے ہی سنجیدہ کم سخن اور متین نظر آتے، مگر جب بولتے تو پتہ چلتا کہ وہ تو بُلبلِ ہزار داستان ہیں، علمِ مجلسی (TABLE TALK) کے تو وہ بادشاہ تھے۔ دوسروں کی کیسی کیسی نقلیں کرتے، کیسے کیسے مزیدار لطیفے سُناتے لطیفہ اور اپنی نقلوں، لطیفوں اور چٹکلوں سے پوری محفل کو "دیوارِ قہقہہ" بنا دیتے! بارہا ایسا ہوا کہ دوستوں کی بے تکلّف صحبت میں ایک لطیفہ میں نے بیان کیا، اُس کے جواب میں دوسرا لطیفہ شوکت نے! جواب الجواب اور عمل و ردِّ عمل کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا، مگر بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا میدان اُنہی کے ہاتھ رہتا۔ جس انداز میں وہ کسی کی نقل اتارتے تھے وہ بس اُنہی کا حصّہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ دوسروں کی حرکت و ادا (GESTURES) کا وہ کس دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، خاص طور سے جھوائی ٹولہ (لکھنؤ) کے ایک مشہور طبیب کی "نقل" تو شاعر کی مشہور و مقبول نظم کی طرح اُن سے منسوب ہو کر اور چپٹ کر رہ گئی تھی، بے تکلفی کی ہر محفل میں اس "نقل" کے لیے اُن سے فرمائش بلکہ اصرار کیا جاتا! شاید اسی شوق کی بدولت انہیں اپنے ادبی منصب سے نیچے اُترنا پڑا، اور پاکستان کی ایک فلم (گلنار) میں انہیں ایکٹنگ کرتے ہوئے دیکھا گیا، کیا عجب ہے کہ اس کا سبب اُن کے معاشی حالات بھی ہوں!

جب وہ بے تکلف ہوتے اور موج میں آتے، تو چاہے اُن کے اہلِ خانہ ہی کیوں نہ موجود ہوں، مذاق کرنے سے نہ چوکتے، اور کبھی کبھی تو استعارہ اور کنایہ کا حجاب بھی اٹھا دیتے، اُن کی باتوں میں بڑی گھلاوٹ پائی جاتی تھی، اور آواز و لہجہ کے بدلنے میں تو اُنہیں کمال حاصل تھا۔

بڑے بڑے مشاعروں میں شعر خوانی کے علاوہ شاعروں کی فہرست ترتیب دینے اور اُن کے ناموں کا اعلان کرنے کی خدمت بھی وہ انجام دیتے، بزمِ شعر و سخن کے وہ "کامیاب کنڈکٹر" تھے! شوکتؔ تھانوی مرحوم سے لاہور میں آخری ملاقات اسی سال فروری میں ہوئی، جب میں مشاعرہ گاہ پہنچا، تو وہ صدرِ مشاعرہ کے قریب اسٹیج پر تشریف فرما تھے، اس مشاعرے میں ایک ناخوشگوار بات یہ پیش آئی کہ ایک شاعر کا نام جب

شوکت مرحوم نے پکارا تو وہ ناراض ہو گئے، کہ مجھے میرے مقام پر نہیں بلایا گیا، اور شوکت صاحب ہر مشاعرے میں میرے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں، اپنی غزل پڑھ کر وہ صاحب مشاعرے ہی سے چلے گئے، شوکت مرحوم نے اعلان کیا کہ یہ فہرست مشاعرہ کے منتظمین کی مرتب کی ہوئی ہے، اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے! اُن شاعر کی اس حرکت کو سب نے اُن کی تنگ ظرفی پر محمول کیا۔

اس مشاعرے میں شوکت تھانوی کو میں نے ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش پایا، بیماری کی تو ذرا سی جھلک بھی اُن کے چہرے اور بشرے سے نمایاں نہ تھی، وہی ہنسی خوشی کی باتیں اور مزیدار گفتگو! اس کے چند دن بعد اخبارات میں اُن کی علالت کی خبر پڑھی! پھر ان کی حالت بگڑتی اور ابتر ہوتی ہی چلی گئی۔ ۲۱ مارچ کو حیدرآباد کے مشاعرے میں مشہور و مقبول مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری سے ملاقات ہوئی، انھوں نے شوکت تھانوی کی علالت کا حال تفصیل کے ساتھ سنایا، میں نے اُن سے کہا کہ خدا کے لیے شوکت کو ان ڈاکٹروں کے چکر سے کسی طرح نکالو، یونانی علاج کراؤ، اس سے اُنہیں انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

بہت دنوں تک تو ڈاکٹروں کی سمجھ میں یہی بات نہیں آئی کہ شوکت تھانوی کو کیا مرض لاحق ہے، پہلے یہ کہا گیا کہ اُن کا دل بڑھ گیا ہے، پھر دل میں "کینسر" تشخیص کیا گیا، جناب فضل کریم فضلی کے یہاں ۲ مئی کو "بزم جگر" کی نشست تھی۔ وہ شوکت مرحوم کو دیکھنے گئے تھے فرماتے تھے کہ انہیں دیکھ کر شوکت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مایوسی کی سی کیفیت! پھر وہ ذرا سنبھلے تو بستر مرگ پر بھی اُن کی طبیعت نے شوخی دکھلائی کہنے لگے:

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تم وسیع القلب ہو گئے ہو ——————"

بزم جگر کی اس گفتگو کے دوسرے دن بقر عید سے ایک روز پہلے شوکت تھانوی کے انتقال کی خبر ملی، اور اُن کے دوست، احباب، شناسا اور مداحین بلکہ ساری اردو دنیا غم و الم میں ڈوب گئی! اُن کی موت پر ادیبوں، شاعروں، صحافت نگاروں، اسمبلی کے ممبروں، وزیروں یہاں تک کہ پاکستان کے عالی وقار صدر نے بھی غم کا اظہار کیا، اخبارات نے تعزیتی مقالے لکھے —— اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت و مغفرت نازل فرمائے (آمین)

شوکت تھانوی کی خانگی زندگی بڑی دُکھی زندگی تھی، وہ طرح طرح کی اُلجھنوں میں مبتلا تھے، مگر یہ انہی کا دل گردہ تھا کہ سینہ میں غموں کی بھٹی سلگ رہی ہے اور وہ لوگوں کے دامنوں کو مسکراہٹوں کے پھولوں سے بھرے جا رہے ہیں۔

شوکت تھانوی مرحوم کی شہرت کا ستارہ "سودیشی ریل" کے افق سے طلوع ہوا، اس کے بعد اُن کی شہرت بڑھتی اور پھیلتی ہی چلی گئی، انھوں نے درجنوں کتابیں لکھیں اور ہر کتاب مقبول ہوئی، طنز و مزاح میں وہ ممتاز مقام پہ پہنچتے تھے! ان کی تحریریں خاص و عام شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے! ریڈیو پاکستان سے انھوں نے برسوں "قاضی جی" کے نام سے فیچر نشر کیے ہیں، اور کروڑوں آدمیوں کے دل و دماغ کو نشاط و انبساط اور فرحت و آسودگی دی ہے —— اُن کے بارے میں ایک بات تو عجیب سُننے میں آئی —— یہ کہ وہ ایک ایک نشست میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے، مگر اُس پر نظرِ ثانی نہ کرتے، جو ایک بار لکھ دیا، بس وہی مسودہ ہوتا اور مبیضہ بھی! اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے میں کوئی سطر کہیں سے کٹی ہوئی نہ ہوتی! یہ دلیل ہے اُن کی پختہ مشقی، خود اعتمادی اور حاضر دماغی کی! سُنا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم کا بھی ایسا ہی اندازِ تحریر تھا کہ وہ مضمون لکھ کر، اُسے دوبارہ نہیں پڑھتے تھے! اور مجھے تو یہ بات عجیب ہی نہیں "کرامت" معلوم ہوتی ہے کہ میں اپنی تحریر کو بار بار پڑھتا ہوں، اور ہر بار کچھ نہ کچھ کاٹ چھانٹ اور اضافہ ہو جاتا ہے —— کئی سال سے وہ روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی) کے مدیرِ اعلیٰ تھے، اور ایک ہی وقت میں سیاسی اداریہ اور فکاہی کالم لکھتے!

شوکت تھانوی شاعری میں حضرت آسی الدنی (جو بعد میں اپنے نام کے ساتھ "الدنی" کی بجائے لکھنوی لکھا کرتے تھے) کے شاگرد تھے، انھوں نے بہت سی سنجیدہ غزلیں بھی کہی ہیں، جو "گہرستان" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ، الٰہ آباد اور اُس نواح کے مشاعروں میں شوکت تھانوی مشاہیر کے ساتھ شریک ہوتے تھے، مگر اُن کا یہ رنگ اُن کی مزاح نگاری اور ظریفانہ شاعری کے آگے نہ صرف یہ کہ پھیکا پڑ گیا، بلکہ دب کر رہ گیا۔

پچھلے دو تین سال اُردو دنیا کے لیے کتنے غمناک اور الم انگیز ثابت ہوئے۔ ایک

نامور، ادیب یا شاعر کی موت کا زخم بھرنے نہیں پاتا کہ کوئی دوسرا سانحہ اور المیہ پردۂ غیب سے ظہور میں آجاتا ہے! کیا ہماری قسمت میں ماتم گساری اور سوگواری ہی لکھی ہوئی ہے! کچھ دنوں سے شعر و ادب کی دنیا میں سچ مچ چل چلاؤ لگ رہا ہے! سب سے زیادہ غم اس بات کا ہے کہ دنیا کی مکروہات نے دلوں کو سخت کر دیا ہے، ان سانحوں اور المیوں سے قلوب عبرت حاصل نہیں کرتے، ہماری وہی غفلتیں اور آخرت فراموشیاں ہیں جیسے یہ وقت ہم پر آنا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو گداز عطا فرمائے، جو عبرت کے نقوش قبول کر سکے، اور ہمیں اپنی دنیا بنانے کی جتنی فکر ہے، اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے بھی کچھ کر سکیں۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر شوکت سبزواری

پندرہ سولہ برس ہوئے ہونگے ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم سے کسی ادبی تقریب میں ملاقات ہوئی۔ اس تقریب کے بعد کسی قریب کے ہوٹل میں پون گھنٹہ اردو لسانیات پر ہم دونوں گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اس ملاقات اور صحبت و گفتگو سے خوشی دونوں کو ہوئی۔ مجھے اس کی مسرت کہ لسانیات کے ایک عالم سے تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا، انہیں اس کی خوشی کہ اس دور میں ایک شاعر اردو زبان و لغت سے اس درجہ شغف رکھتا ہے اور طالب علم کی طرح تحقیق کرتا ہے۔

الفاظ کی تحقیق کے لیے ترقی اردو بورڈ میں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا، ڈاکٹر سبزواری سے قریب قریب ہر پھیرے میں ملاقات ہوتی اور الفاظ پر بحث و گفتگو بلکہ رد و کد بھی! ایک بار باتوں باتوں میں خاصی تلخ گفتگو بھی ہوگئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک لفظ کے عروضی وزن پر اتنی وضاحت کی نوبت آئی اور بات بڑھ گئی، مگر دوبارہ ملنا ہوا تو ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملے جیسے اس دن کی تلخی کو انھوں نے بھلا دیا۔

میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ بعض الفاظ کی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تشریح و توضیح سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ لفظ کہاں سے نکلا ہے؟ اس کے مصدر اور " ROOT " پر اُن کی نگاہ رہتی تھی اور اصل مادۂ مصدر کی روشنی میں وہ الفاظ کا کھوج لگاتے تھے۔ خاص طور سے پراکرت، اپبھرنش اور بھاشا میں بڑا درک رکھتے تھے اور اس فن میں تمام اردو اداروں میں کوئی اُن کا ہم پلّہ نہ تھا۔

میں اپنے نواح کے بعض الفاظ کا ذکر کرتا تو وہ انہیں بڑے اشتیاق کے ساتھ نوٹ فرما لیتے۔ ڈیڑھ دو سال پہلے کی بات ہے ڈاکٹر سید محمود بھارت سے پاکستان آئے ہوئے تھے، اُن کے اعزاز میں بورڈ کی طرف سے عصرانہ دیا گیا، چائے نوشی کے دوران میں

ڈاکٹر سبزواری نے فرمایا کہ چند مہینے ہوئے اردو زبان کا ایک مستشرق انگلستان سے ہندوستان ہوتا ہوا، کراچی آیا تھا۔ اس نے FURROW کے معنی دریافت کیے ہم اُسے کوئی جواب نہ دے سکے، ہندوستان کے اردو ادیب اور شاعر بھی اس لفظ کے اردو معنی نہ بتا سکے، راقم الحروف نے چھوٹتے ہی کہا کہ اُردو میں FURROW کو "کونڑ"[1] کہتے ہیں۔ دوآبہ کے اضلاع میں یہ لفظ عام ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ جب میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اس وقت کے انگریزی نصاب کی کتاب میں یہ لفظ (FURROW) آیا اور ایک ہندو ٹیچر نے اس کے معنی "کونڑ" ہمیں بتائے۔

ترقی اُردو بورڈ کی لغت جب بھی چھپ کر منظر عام پر آئے گی تو یہ اردو کی سب سے بڑی لغت ہوگی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کی تحقیق و ریاضت اور مشورت کا اس میں خاصہ دخل ہے۔ لُغت کی ترتیب و تسوید کے کام کو وہ شاید جلد نمٹا لیتے ہوں گے یا خاص دنوں میں لغت کی ترتیب و تحقیق کے لیے بورڈ بیٹھتا ہوگا —— اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ میں اُن کے کمرے میں پہنچا اور انہیں کام سے فارغ پایا۔

ترقی اردو بورڈ کی تاریخ میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ انجمن ترقی اردو میں اسے ضم کرنے کی در پردہ کوششیں کی گئیں، خدا جانے کیا مصلحتیں اور نزاکتیں تھیں جن کی بنا پر ڈاکٹر سبزواری اس تحریک کے حق میں تھے۔ بورڈ کے اعزازی معتمد جناب شان الحق حقی کی فراست و عزیمت نے اس سانحہ سے ترقی اردو بورڈ کو بچا لیا۔

مذہب میں اُن کا رجحان تجدد کی جانب تھا، خاندانی منصوبہ بندی اور سوشلزم کی تائید میں انہوں نے مضامین بھی لکھے مگر دوسرے آزاد خیالوں کی طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مذہب سے کد نہ تھی، دینی روایات کا احترام کرتے تھے اور دین و اخلاق کے بارے میں کوئی ناگوار لفظ اُن کی زبان سے نہیں سُنا گیا۔ علماءِ دیوبند کے خلوص سے متاثر تھے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری خرچ اخراجات کے معاملے میں محتاط بلکہ جزرس تھے، سادہ رہن سہن، معمولی لباس و غذا! پچھلے چند برس میں کئی بار ان پر دل کا دورہ پڑا۔ خانگی

---

[1] ہل چلاتے ہوئے کھیت (زمین) میں جو نالی سی بن جاتی ہے جس کے دونوں طرف مٹی ہوتی ہے بیچ میں نشیب اُسے "کونڑ" کہتے ہیں (اس کا تلفظ کونڑ ہے جیسے سونف۔ مرتب)

اُلجھنیں بھی اُنہیں خاصی مضطرب رکھتی تھیں۔ ترقی اردو بورڈ سے پیرانہ سالی کے سبب سبکدوش ہو چکے تھے مگر جناب نسیم امروہوی کی طرح اجرت پر کام کرنے کی انہیں پیشکش کی گئی۔ تین مہینے ہوئے اُن پر دل کا ایسا دورہ پڑا کہ پھر اٹھ نہ سکے۔ اس تعلق خاطر پر مجھے خود حیرت ہے کہ علالت ہی کے زمانے میں "فاران" کے لیے قرآن کے اردو ترجمہ پر مضمون لکھ کر بھیجا جو میرے پاس محفوظ ہے، شاید یہ اُن کی آخری علمی تحریر تھی اللہ تعالےٰ مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، خاص طور سے غالب پر اُن کی کتاب اونچے درجہ کی کتاب ہے۔ پاکستان کے بلند پایہ دانشوروں اور محققین میں اُن کا شمار ہوتا تھا، وسیع المطالعہ ادیب اور انشا پرداز تھے، مرحوم کی علمی ادبی اور لسانی خدمات پر مقالے نہیں کتاب آنی چاہیئے۔

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۳ء)

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری

متحدہ ہندوستان میں خلافت اور کانگریس کی تحریکیں جب زور پر تھیں اس دور میں مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی کا نام بار بار اخباروں میں نظر سے گزرا۔ اس وقت میں انگریزی مڈل اسکول کی پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ پھر ۱۹۲۴ء میں مولانا مرحوم کے ہفتہ وار اخبار "خدام الحرمین" میں میری نظمیں اور مضامین چھپنے لگے۔ میری مضمون نگاری کا آغاز ہی اس اخبار سے ہوا! برسوں کے اس غائبانہ تعارف کے بعد ان سے پہلی بار ملاقات جبل پور میں ہوئی، یہ غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔

جبل پور میں مسلم لیگ کی کانفرنس کے ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام تھا، مجھے اس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی، ان دنوں بلدہ حیدر آباد میں میرا مستقل طور پر قیام تھا، وہاں سے اٹارسی ہوتا ہوا جبل پور پہنچا، وہ جو کسی نے کہا ہے ——— یوں چلے آیئو دلی کو بخارا ہو کر ——— تو قریب کے راستہ کو چھوڑ کر اس طویل راہِ سفر اختیار کرنے میں ناواقفیت کے علاوہ میری مسافرانہ بدحواسی بھی شامل تھی۔ جبل پور کی مشہور "محبوب بیڑی مارکہ کمپنی" کے مالک کی کوٹھی میں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ٹھہرایا گیا۔ شاندار کوٹھی، وسیع لان، آرام دہ فرنیچر، سیٹھ صاحب کے نوکر مہمانوں کے ادا شناس، اچھے اور لذیذ کھانے، فراوانی کے ساتھ! ہر طرح کا آرام اور امیرانہ انداز کی خاطر و مدارات!

مولانا حسرت موہانی (جو انہی دنوں انگلستان کے سفر سے واپس آئے تھے) مولانا صبغۃ اللہ شہید، الٰہ آباد کے مولوی ظہور احمد ایڈووکیٹ، پٹنہ کے مشہور بیرسٹر اور بہار مسلم لیگ کے روحِ رواں سید عبدالعزیز جو بعد میں حکومت حیدر آباد دکن میں وزیر عدالت و قانون مقرر ہوئے۔ اور راقم الحروف اس کوٹھی میں مہمان تھے۔ ان بڑے آدمیوں میں ہر اعتبار سے سب سے چھوٹا میں ہی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے میرے ساتھ سب کا برتاؤ عزت و قدر شناسی کا برتاؤ تھا۔ مولانا شہید انصاری مرحوم

اس نیاز مند سے بڑے تپاک کے ساتھ بغل گیر ہوئے، تین دن اُن کا ساتھ رہا جلسۂ عام میں مرحوم کی پُرجوش تقریر بھی سُنی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جبل پور کی ملاقات کے بعد مولانا شہید انصاری مرحوم سے دوسری بار ملاقات حیدر آباد دکن میں ہوئی! تقسیم ہند کے بعد اُن سے نیاز حاصل ہونے کی کیا توقع ہو سکتی تھی کہاں لکھنؤ اور کہاں کراچی سچ مچ بُعد المشرقین، پھر ویزا وغیرہ کی الجھنیں اور پابندیاں لیکن اللہ تعالےٰ نے مشرقی پاکستان میں اُن سے ملنے کی سبیل پیدا کر دی، مولانا مرحوم جاڑوں میں سال کے سال اپنے صاحبزادے حبیب انصاری اور ان کے بال بچوں سے ملنے کے لیے ڈھاکہ تشریف لایا کرتے تھے، حبیب میاں کی ذات اور اُن کا مکان شعر و ادب کی دلچسپیوں کا مرکز ہے، کئی بار مشاعروں میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانا ہوا اور وہاں مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری مرحوم کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا اور بیٹھنا اٹھنا رہا اُن سے آخری ملاقات پچھلے سال ہوئی تھی اور آہ! کہ اب ایک برس بعد ۱۹۶۵ء میں اُن کے نام کے ساتھ "مرحوم" لکھنا پڑ رہا ہے۔ اس عالمِ آب و گل اور دنیائے فانی میں چل چلاؤ لگا ہوا ہے ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے!

مولانا مرحوم کئی سال سے بلڈ پریشر کے مریض تھے، ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ میں اُن کی طبیعت بگڑی اور ذرا سی دیر میں حالت اتنی نازک ہو گئی کہ ڈھاکہ کا سفر جاری رکھنے کی بجائے کلکتہ کے اسلامیہ ہسپتال میں انھیں پہنچا دیا گیا، وہاں دو دن دو رات مسلسل غشی طاری رہی اور اسی عالم میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے! ۲۵ دسمبر کو کلکتہ سے میت ریل کے ذریعہ لکھنؤ لائی گئی اور ہزاروں مسلمانوں نے جنازہ کی نماز پڑھی جن میں سُنّی علماء کے علاوہ شیعہ علماء اور مجتہدین بھی نمازیوں کی صف میں موجود تھے، سوگواروں اور تعزیت کرنے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل تھے، مغربی بنگال کے گورنر نے بھی تعزیت کا پیام بھیجا۔

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محل کے مشہور علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، عربی کے عالم، اردو کے شاعر، مضمون نگار اور شعلہ بیان خطیب! عربی کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا، انجمن خدام کعبہ، خلافت کمیٹی، کانگریس، خدام الحرمین، جمعیۃ علماء

اور مسلم لیگ کے پُرجوش کارکن بلکہ لیڈر رہے اور آغازِ شباب ہی سے سیاسی، قومی اور دینی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے، علی برادران، مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا حسرت موہانی جیسی مشہور و محترم شخصیتوں کے ساتھ سیاسی اور دینی تحریکوں میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا، تقریر و خطابت اُن کا سب سے زیادہ نمایاں وصف تھا! تقریر کا انداز و اسلوب ہی نہیں لب لہجہ بھی مخصوص تھا! خاص طور سے سیرت النبیؐ پر بولتے تو سننے والوں کو رُلا کر اُٹھتے! سرکارِ دو عالم، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی سے قابلِ رشک عقیدت و محبت تھی!

مولانا مرحوم بڑے ہنس مکھ، بذلہ سنج اور باغ و بہار آدمی تھے، شاعری تو اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اچھا شعر سُن کر والہانہ انداز میں داد دیتے، افسوس ہے کہ اُن کے داد دینے کے انداز کی نقل اُتارنے والے شوکت تھانوی بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

"فاران" اور اس کے کم سواد ایڈیٹر کے قدر شناس! فاران کا "توحید نمبر" بڑے شوق سے منگایا اور اُسے پسند کیا! حالانکہ بریلی، بدایوں اور فرنگی محل کے مشائخ و علماء "توحید نمبر" پڑھ کر خوش نہیں ہو سکتے۔ پچھلے سال کئی خط بھی راقم الحروف کو لکھے، خط کی عبارت بہت مختصر ہوتی، بہت سے بہت چار پانچ سطریں بس ضرورت اور کام کی بات! ریڈیو سے میری غزل سُن کر خط لکھا کہ تمہارے اس شعر:

تو گرفتارِ محبت پہ خدا رحم کرے
آج اس شخص کی پہلی شبِ تنہائی ہے

میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "اس شخص" کی جگہ "کم بخت" ہونا چاہیے۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ "اس شخص" کو نکال دیا گیا تو شعر کا سارا لطف ہی جاتا رہے گا۔

مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری مرحوم اس دنیا سے کیا گئے اپنے ساتھ دین و اخلاق اور شرافت و انسانیت کی بہت سی روایتیں بھی لے گئے، لکھنؤ کا نام آتے ہی اُن کی شخصیت ضرور نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی، اللہ تعالیٰ آخرت میں ابرار و صلحا کی معیت و رفاقت انہیں نصیب فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۶۵ء)

صابر دہلوی

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا، اور ہم کو مرنا ہے

محمد اسحاق نام تھا۔ صابر تخلص، ضلع بلند شہر میں ایک گاؤں امر پور ہے۔ جو سان گری اور چاقو سازی کے لیے اُس نواح میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے تھے، پھر دلّی کو اپنا وطن ثانی بنا لیا، یہاں تک کہ "دہلوی" کہلانے لگے۔ دلّی میں برسوں اپنی قوتِ بازو سے روزی کمائی۔ پھر دُوکان اور کاروبار اپنے لڑکوں کو سونپ کر مشاعروں، شعر و شاعری اور دوستوں کی صُحبتوں ہی کے ہو کر رہ گئے۔ کوئی کام اور ذمہ داری نہیں۔ ہنسی مذاق، قہقہے، چہچہے، خوش فعلیاں اور رنگینیاں!

۱۹۴۰ء میں مالیر کوٹلہ کے مشاعرے میں صابر مرحوم سے پہلی بار مُلاقات ہوئی اور اس کے بعد سے جو یارانہ شروع ہُوا ہے۔ تو ان کے مرتے دم تک قائم رہا۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خالص دوستی کسی غرض اور مطلب کی ذرہ برابر ملاوٹ نہیں، بے تکلفی بے حد و بے نہایت! سفر میں، حضر میں، خلوت و جلوت میں مہینوں ساتھ رہا۔ کیسی کیسی رنگین اور دلچسپ صحبتوں میں ہم دونوں زانو سے زانو ملا کر بیٹھے ہیں اور کس کس محفل میں ہم نفسی اور ہم لگا ہی رہی ہے۔

شائستہ اور سنجیدہ محفلوں میں، مشاعروں اور پارٹیوں میں صابر اور میں جس طرح لطف لیتے تھے، مُسکراتے اور ہنستے تھے اُسے کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ کس بات پر یہ دونوں ہنسی کے مارے دُہرے ہوتے جا رہے ہیں! خندہ و قہقہہ کے "رموز" ہم دونوں نے ایجاد کیے تھے، جو ہر کسی کی سمجھ میں کہاں آتے تھے۔ ایک لفظ ایک اشارے اور ایک حرکت و ادا پر دونوں

دیوارِ قہقہہ اور کشتِ زعفران بنے ہوئے!

صابرؔ مرحوم کا بدن کسرتی تھا، جوانی کے زمانے میں پہلوانی کی تھی اور دنگلوں میں کشتیاں لڑی تھیں، اس لیے وہ یار دوستوں کے "باڈی گارڈ"، کے فرائض بھی انجام دیتے، کوئی لاتوں کا بھوت، باتوں سے نہ مانتا تو اس کی مرمّت کرنے کے لیے بھی وہ تیار ہوجاتے، آدمی جیوٹ حوصلہ مند، جری بلکہ ہَیت چھُٹ تھے۔ اس مزاج کا آدمی کسی کی ذراسی بھی بات کہاں سہار سکتا ہے! منافقت، مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی ان کو آتی ہی نہ تھی جس سے ملتے ٹوٹ کر ملتے، اور جس سے کھنچتے اُس سے کھنچے ہی رہتے۔

صابرؔ مرحوم کا چہرہ وجیہہ اور خوش منظر تھا۔ خوش پوشاک بھی تھے۔ ہر لباس ان کے بدن پر پھبتا، اُن کی آواز میں بھی سوز اور دل کشی تھی۔ شعر و شاعری کی بدولت ہر طرح کی صُحبت میسّر آتی، اس لیے حقیقت و افسانہ، خوش فہمی اور غلط فہمی کے بڑے معرکے اور مقابلے رہتے۔

صابرؔ مرحوم کی سرشت اور فطرت میں دو چیزیں شامل تھیں۔ عاشقی اور شاعری! انہی چٹخاروں کی بدولت وہ کم و بیش ستّر سال کی عمر میں بھی پچاس سال کے لگتے تھے! یار دوست چھیڑنے کی خاطر اُن کی عمر پوچھتے؟ اس پہ وہ بگڑ جاتے! اُن کی زندگی سے بہت سے افسانے، لطیفے اور رنگین و دلچسپ واقعات منسوب ہیں! پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کیا تو راستہ بھر سہمے ہوئے بیٹھے رہے! ہوائی جہاز سے جب وہ اُترے تو چند قدم چل کر ہوائی جہاز کو مُڑ کر دیکھا، اور خاص انداز میں بولے:۔

"اب میں کہتا ہوں سواری خطرناک ہے"۔

صابرؔ مرحوم کا سب سے زیادہ دلچسپ موضوع میری ذات تھی۔ "اپنے ہوں، پرائے ہوں، دوست ہوں، اجنبی ہوں، میرا ذکر چھڑ جاتا، تو گھنٹوں باتیں کیے جاتے۔ میں نے انہیں کئی بار ٹوکا کہ بھائی! دوست کی ہر بات ہر کسی کے سامنے نہیں کہی جاتی! مجھے آخر کس کس کے سامنے رُسوا کرو گے، کئی بار وعدہ کیا کہ اب ایسا نہیں کروں گا مگر پھر دوسروں کی زبانی سُننے میں آیا

کہ انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا ـــــــــــ اور وہی ذکرِ ماہر بہ زبانِ صابر!

صابر مرحوم کے گھر میں پردے کی سخت پابندی تھی۔ دلّی میں سب سے پہلی بار جب میں اُن کے یہاں گیا، تو بولے ماہر! میں نے قصداً اس وضع قطع کا مکان کرایہ پر لیا ہے، تاکہ کسی کو مکان میں ٹھیرانا نہ پڑے، دوستوں میں جگر مُرادآبادی کے بعد تم دوسرے شخص ہو، جس کو میں نے اپنے گھر کھانے پر بُلایا ہے! میری بیوی کو برسوں دلّی میں رہتے ہو گئے، مگر اس مُدت میں ایک یا دوبار جامع مسجد اور قلعہ دیکھا ہے۔ میری بیوی اور بیٹی نے آج تک سینما نہیں دیکھا۔ ـــــــــــ اس باب میں صابر مرحوم بڑے خود دار محتاط اور غیرت مند واقع ہوئے تھے، عورتوں کے معاملہ میں جس کسی نے بھی ڈھیل دی، اُس نے سخت نادانی کی، عفت و عصمت کے ان نازک و مقدس آبگینوں کی جتنی بھی حفاظت کی جائے کم ہے۔

پوتوں اور پوتیوں پر مرحوم جان چھڑکتے تھے، ان کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور بڑی فراخدلی اور حوصلہ کے ساتھ خود تکلیف اُٹھاکر، اُن کی راحت و آرام کے اسباب مہیّا کیے! ان کے بڑے پوتے انوار انجم ایم اے کے آخری سال میں ہیں، اور اپنی ذہانت، قابلیت اور شعر و ادب کے ذوق کے سبب کالج میں خاصے مقبول ہیں!

چند سال ہوئے انہوں نے دوسری شادی کرلی تھی، پہلی اور دوسری بیوی دونوں ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ ملتان کی نئی آبادی ـــــــــــ گل گشت ـــــــــــ میں انہوں نے مکان نہیں کوٹھی بنوائی۔ جس کے سبب ہزاروں کے مقروض ہو گئے۔ پوری زندگی بے فکری میں بسر کی، فکر و غم کو تو وہ اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے، مگر تین چار سال سے ایسے حالات ہو گئے تھے کہ فکر و غم کو بہت کچھ ٹالنے کے باوجود فکر مند رہنے لگے تھے۔ آٹے کی چکّی کی آمدنی بھی برائے نام رہ گئی تھی ـــــــــــ اتنا بڑا ٹبر پورے کنبہ کے آذوقہ کی ذمہ داری اس پرطرّہ یہ کہ اخراجات کے معاملہ میں کشادہ دست اور سیرچشم!

۱۴ مارچ کو لاہور میں مشاعرہ تھا۔ میں نے کراچی سے لاہور روانہ ہوتے وقت ارادہ کر

لیا تھا کہ واپسی میں مُلتان اُتر کر صابر صاحب سے مِلوں گا، ۷، مارچ کو مُلتان ان کے نو تعمیر مکان پر پہنچا، وہاں جاکر پتہ چلا کہ وہ آج ہی ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ ان کے پوتے کو تانگے میں بٹھا ہسپتال کا رُخ کیا، شام کے پانچ بجے ہوں گے سول ہسپتال میں چاروں طرف سنّاٹا سا نظر آیا۔ دروازوں میں تالے پڑے ہوئے، کئی منٹ کی تلاش کے بعد صابر مرحوم کے کمرے کا پتہ چلا، مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ بھائی! اس ہسپتال کے اسپیشل کمروں کے دروازوں کو دیکھ کر میں سمجھا کہ ہسپتال میں بھی جیل خانہ ہوتا ہے، اور تم نے ہسپتال میں آتے ہی کوئی ایسی حرکت کی ہے کہ تمہیں حوالات میں بند کر دیا گیا، اس پر وہ خوب ہنسے، میں اُن کے پاس ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب بیٹھا رہا، میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہارے چہرے پر بڑی شگفتگی اور تمہاری باتوں میں خاصی زندگی پائی جاتی ہے، انشاء اللہ جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ بولے ماہر! میں اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہوں، جسم میں کچھ نہیں رہا، ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ تمہارے پیشاب میں شکر آتی ہے اسی کے علاج کے لیے یہاں داخل ہوا ہوں، دو ہفتہ کے قریب یہاں رہنا ہوگا۔ ہاں! مظفر گڑھ کے مشاعرے سے تم بالا ہی بالا چلے گئے۔ اس کا مجھے بڑا شکوہ اور صدمہ تھا۔ جوش ملیح آبادی مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ تمہارا ذکر بھی ان سے رہا۔

اور

ماہر! میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ کراچی میں آ کر رہوں، گلگشت کا مکان، کارخانہ اور اس کی زمین، یہ سب چیزیں مل ملا کر دو لاکھ پونے دو لاکھ میں بک جائیں گی۔ قرضہ ۴۰، ۴۵ ہزار سے زائد نہیں ہے! بس پھر کراچی میں عیش اور مزے رہیں گے۔ تم وہاں موازنہ کرنا کہ کھانا نخشب جارچوی کے یہاں اچھا ہوتا ہے یا میرے یہاں!

میں نے اپنی تازہ غزل سُنائی اور صابر مرحوم نے اپنے یہ دو شعر پڑھے۔

عشق کا حُسن نہ موجود رہا میرے بعد　　کر سکا کوئی نہ تجدید وفا میرے بعد
ہائے! صابر سا وفادار کہاں سے لاؤں　　اُس نے لوگوں سے یہ رو رو کے کہا میرے بعد

میں نے کہا "عشق کا حسن" کی بجائے "عشق میں حسن" ہو جاتے تو کیا ہے! اس پر وہ سوچنے لگے! میرے اس شعر پر ؎

کوئی خوش جمال ہوگا، کوئی بے مثال ہوگا ہمیں کس سے ہے محبت تمہیں نام کیا بتائیں

بہت داد دی، یہ اُن کے رنگ اور مزاج کا شعر تھا ——— یہ ڈیڑھ پونے دو گھنٹہ کا وقت باتوں باتوں میں اس طرح گزرا جیسے مجھے آئے ہوئے چند منٹ ہوئے ہیں! کس محبت کے ساتھ مجھے رخصت کیا، چلتے چلتے ہم دونوں نے ایک دوسرے پر ہنسی مذاق کی پھلجھڑیاں اور پچکاریاں چھوڑیں!

میں اسی شب میں ملتان سے روانہ ہو کر رحیم یار خاں پہنچا۔ ۹، مارچ کو وہاں مشاعرہ پڑھا، ۱۰ مارچ کو کراچی واپس آیا۔ کراچی آنے کے تیسرے دن بعد دفتر میں بیٹھا ہوا خطوں کے جواب لکھ رہا تھا کہ منیجر نے تار لاکر دیا، میں سمجھا کسی مشاعرے کی اطلاع یا دعوت آئی ہے مگر اس میں لکھا تھا:-

" ابا کا انتقال ہو گیا، جمیل الدین عالی اور دوسرے حضرات کو اطلاع دے دیجیے۔" جمیل کس قدر الم انگیز برقیہ، مگر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ نہ آنکھوں سے آنسو نکلے اور نہ میں نے دل کو تھاما۔ گھبرا گھبرا کر در و دیوار کو دیکھتا تھا، ہائے! میں تو صابر سے کہا کرتا تھا کہ صابر! تم مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہو، مگر دیکھ لینا، میں تم سے پہلے مروں گا اور تم یاد کیا کرو گے، کہ کیسا دل چسپ اور باغ و بہار دوست جاتا رہا ——— لیکن یہ کیا ہوا؟ میں تو انہیں ہنستا بولتا اور چہکتا چھوڑ آیا تھا۔

دو دن بعد جناب عاصی کرنالی کا خط آیا، اُس کے چند جملے:-

" ماہر صاحب! آپ کا سب سے سچا دوست، سب سے مخلص بھائی، سب سے بڑا خیر خواہ مر گیا ہے۔ جب وہ آپ کا نام لیا کرتے تھے، اُن کی آنکھوں کی چمک کہتی تھی ——— ماہر میرا ہے، صرف میرا ہے ——— آپ کا ذکر کرتے وہ کبھی نہ تھکتے گھنٹوں۔ حدیثِ دوست اور ذکرِ حبیب کی سرمستی ان پر طاری رہتی۔

" آپ جمعرات کو اُن سے ملنے ہسپتال گئے۔ جمعہ کو میں پہنچا، تین گھنٹے بیٹھا

رہا پہلے آپ کا ذکر کیا کہ وہ آئے تھے۔ مولانا ۔۔۔۔۔اور باہر سے کہلوایا، کوئی ماہر آیا ہے پھر فرمانے لگے انہوں نے ایک غزل کہی ہے۔ سبحان اللہ کیا غزل ہے، انہیں کراچی لکھا، وہ غزل اُن سے منگوانا، تین گھنٹے اُن تھک بولتے رہے، داغ دہلوی کا ذکر، اردو زبان کے الفاظ کی اصلاح، ملتان کی کس مپرسی کا حال، زیادہ ذکر کراچی کا رہا کہنے لگے میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں صحت یاب ہوتے ہی ملتان چھوڑ دوں گا۔ ملتان مدفنِ ادب ہے، اور پھر حکیؔ میں میرے لیے کشش نہیں، میں کراچی چلا جاؤں گا۔ وہاں میرا ماہر جو ہے تمہیں بھی لے چلوں گا عاصی! یا جلد بلا لوں گا اپنا بیٹا عالی وہاں ہے، وہ تمہارے لیے بہت کچھ کر دے گا پھر مولانا تم پر شفقت کرتے ہیں۔!

صابر دہلوی مرحوم کی فطرت اور مزاج میں غزلیت سموئی ہوئی تھی، ان کے اس ایک مصرعہ ہی سے ان کے رنگِ تغزل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

؎ دل سلامت ہے تو مشکل میری آسان کیوں ہو

اور

پھر محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

؎ میری جمعیتِ خاطر سے پریشان کیوں ہو۔

وہ زود گو ہی نہیں خوش گو بھی تھے! تقسیمِ ہند سے چار پانچ سال قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ان کی نعتیہ غزلوں کے پروگرام ہوتے تھے! رسالوں اور اخباروں میں اپنا کلام چھپوانے کا انہیں شاید کبھی خیال ہی نہیں آیا، نہ جانے اُن کی غزلیں اُن کے ساتھ ہی چلی گئیں یا کسی بیاض میں محفوظ ہیں! اب سے ڈیڑھ سال پہلے ایک غزل انہوں نے سنائی تھی، جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

ہجر کی شب بہت مختصر ہو گئی — اُن کی یاد آ گئی اور سحر ہو گئی
کیا میری آہ ۔۔۔۔[1] کارگر ہو گئی — جو اِدھر کی تھی حالت اُدھر ہو گئی

یہ مشہور مصرعہ صابر دہلوی مرحوم کی موت پر کس قدر صادق آتا ہے جیسے خاص انہی کے لیے اور اسی دن کے لیے کہا گیا تھا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۶۳ء)

---

[1] اس مصرعہ کا درمیانی لفظ اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ (م۔ق)

آغا صادق حسین نقوی

سنہ ۱۹۵۲ء میں کوئٹہ کے ایک مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا، میں بیرِ سفر کا رسیا ہوں " آب گم ریلوے اسٹیشن " کے بعد ٹرین میں دو انجن لگ گئے، کوئٹہ تک یہ چند گھنٹے مناظر کے نظارے ہی میں گزرے۔ کوئٹہ کی سڑکوں پر ہرے بھرے تناور درختوں کو دیکھ کر طبیعت نے فرحت محسوس کی! دن سیر سپاٹے میں گزرا، آنے والی رات شبِ مشاعرہ تھی۔

مشاعرے میں باہر سے آئے ہوئے شاعروں کے علاوہ کوئٹہ کے شاعروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ آغا صادق حسین نقوی کا نام پکارا گیا تو حاضرین نے تالیاں بجائیں، پھر آغا صاحب اور بعض من چلے سامعین کے درمیان سوال و جواب ہونے لگے اور چوٹیں چلنے لگیں، مقامی شاعروں نے بتایا کہ یہاں کے ہر مشاعرے میں آغا صاحب کے ساتھ یہی صورت پیش آتی ہے۔ بمبئی میں حکیم مرزا حیدر بیگ جن کے یہاں حضرت جگر مرادآبادی اور راقم الحروف مہینوں مہمان رہے ہیں اور جو شاعروں کے بڑے قدر شناس تھے، وہ جب مشاعرے میں کلام سنانے کے لیے اسٹیج پر آتے تو " ہینڈ بیگ " کے آوازے بلند ہوتے اور ہوٹنگ ہونے لگتی اُن کا ایک اچھا شعر یاد آرہا ہے:

تصور آرہا ہے جا رہا ہے
خیال اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے

ریاست ٹونک کے استاذ الاساتذہ حضرت صولت کے ساتھ بھی ٹونک کے مشاعروں میں یہی معاملہ پیش آتا کہ اُن پر کسی نے ایک آدھ فقرہ کس دیا، صولت مرحوم نے جواب میں تیز تر جملہ کہہ دیا اور پھر فقرہ بازی ہونے لگی! بعض شاعروں کی صورت شکل اور ان کے پڑھنے کا اندازہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ حاضرین کا جی چہلیں کرنے کو چاہتا ہے۔
مجھے یاد پڑتا ہے کہ اب سے سولہ سترہ برس پہلے ملتان سے آغا صادق حسین نقوی

نے اپنی غزل بھیجی میں نے جواب میں لکھا کہ چند غزلیں اور عنایت فرمادیں میں اُن کا انتخاب" فاران" میں شائع کروں گا انہوں نے چار پانچ غزلیں لکھ کر ارسال فرمائیں اور اُن کے منتخب اشعار" فاران" کی زینت بنے! پھر اُن سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُن کی کئی کتابوں پر" فاران" میں تبصرہ ہوا، راقم الحروف کے بعض تبصروں کو انہوں نے سراہا، اور ایک دو تنقیدوں پر اپنی ناگواری کا بھی اظہار فرمایا۔ عروض پر اُن کی کتاب خاصی جامع کتاب ہے، ضرورت کے وقت اُس سے استفادہ کرتا ہوں۔

آغا صاحب مرحوم نے اپنی ذہانت اور قابلیت ومحنت کے سہارے ترقی کی، مشرقی علوم کے اعلیٰ امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد گریجویٹ ہوئے اور پھر ایم۔ اے کیا۔ کوئٹہ اور لورالائی اور ملتان کے گورنمنٹ کالجوں میں برسوں پرنسپل رہے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد موسم سرما ملتان گزارتے اور موسم گرما کوئٹہ میں! ملتان اور کوئٹہ دونوں مقامات پر اُن کے ذاتی آرام دہ مکانات تھے! معاش کی طرف سے انہیں ذرہ برابر کسی قسم کی فکر نہ تھی، ایسی مطمئن زندگی ہر کسی کو کہاں میسر آتی ہے! لکھنا، پڑھنا اور کتابوں کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا! ضرورت مندوں کے ساتھ سلوک بھی فرماتے اور آڑے وقت میں اُن کے کام آتے۔ شرافت اور وضعداری اُن کی سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔ مذہبًا شیعہ تھے مگر سُنّی دوستوں میں اس طرح گھل مل کر رہتے جیسے وہ انہی کے ہم عقیدہ ہیں! دل آزاری اُن کے مذہب میں کفر نہیں تو گناہ ضرور تھی۔

نام نہاد" ترقی پسند شعر وادب" سے اُن کو وحشت ہوتی تھی اور آزاد شاعری کو اردو کے ساتھ ایک طرح کا مذاق سمجھتے تھے۔ شجاع آباد سے نور صابری نے اُن کے انتقال کی خبر سُن کر مجھے لکھا کہ ان امر آزاد کو وہ" ننگِ ملت" کہا کرتے تھے!

آغا صادق حسین نقوی بڑھاپے کے دور سے گزر رہے تھے مگر صحت اچھی تھی، مضبوط قویٰ، پاٹ دار آواز —— لیکن اب کے کوئٹہ کا یہ سفر دراصل اُن کا سفرِ آخرت تھا —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ فاران" ستمبر ۱۹۷۷ء)

سیّد صدّیق الحسن گیلانی

سیّد صدیق الحسن گیلانی مرحوم اور راقم الحروف دینی اعتبار سے ہم فکر بلکہ ہم مشرب! وہ جماعتِ اسلامی کے پُرجوش اور مخلص کارکن بلکہ دوسری صف کے رہنما اور میں جماعتِ اسلامی کا مداح اور اس کے برسرِ حق ہونے کا شاہدِ عادل! مگر اس ہم خیالی کے باوجود اُن کے ساتھ سفر و قیام کا موقعہ نہیں ملا۔ ان کا راولپنڈی اور لاہور میں قیام، میں کراچی کا ساکن! سینکڑوں میلوں کا بُعدِ جسمانی لیکن روحیں ایک دوسرے سے قریب تر! سید صاحب مرحوم سے برسوں کی ملاقات تھی، جماعت اسلامی کے جلسوں میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا۔ ہر ملاقات میں ایسا لگتا جیسے طرفین کی جانب اور زیادہ مقناطیسیت پیدا ہوتی جارہی ہے!

میں قادری اور وہ سیدنا شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدس خانوادے کے فرد! اس اعتبار سے وہ میرے مخدوم تھے۔ اُن کا چہرہ خاندانی سیادت کا آئینہ دار تھا۔ جماعتِ اسلامی کے "مومنِ مخلص" ایک بار تعلق پیدا ہوگیا تو پھر اس تعلق میں کمی نہیں آئی۔ یہ ربط قوی تر ہوتا گیا۔ اکابرِ جماعت کی کسی رائے اور طرزِ عمل سے ممکن ہے اُن کا اختلاف ہوا ہو، مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو جماعت کے "مفرورین" کے گروہ میں شامل ہونے سے بچایا۔ یک در گیر و محکم گیر پر اُن کا عمل رہا۔ اُن کے چھوٹے بھائی سیّد اسعد گیلانی بھی جماعت کے انتظامی مناصب پر فائز رہے۔ خلافت کمیٹی میں جس طرح مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی "علی برادران" کہلاتے تھے، اسی طرح یہ دونوں بھائی جماعت اسلامی کے "گیلانی برادران" تھے۔

(غالباً) پولٹیکل سائنس کے ایم۔اے تھے۔ مطالعہ خاصہ وسیع، خوش بیان مقرر، پُرجوش اور مخلص دینی کارکن، جس ذمہ داری کو قبول فرماتے اُسے پورا کرنے کی حتی المقدور سعیِ بلیغ کرتے! حق کے اظہار میں جری اور بیباک! اسی جرمِ حق گوئی کی بدولت جیل خانے جانا پڑا، اور عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا۔ بذلہ سنج بھی مگر اخلاق کی حدود میں رہ کر۔ جماعت اسلامی

کا شعبہ پارلیمانی امور اُن سے متعلق تھا! یہ اس کی دلیل ہے کہ جماعت نے ان کو صاحبِ فکر سمجھا؟ اور مرحوم کی سیاسی سمجھ بوجھ پر اعتماد کیا! وہ جو علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

ان کی تمنا قلیل، اُن کے مقاصد جلیل

تو سید صدیق الحسن گیلانی مرحوم قناعت پسند اور متوکل علی اللہ تھے مگر عزائم بلند اور مقاصد جلیل رکھتے تھے! زندگی صاف ستھری نستعلیق اور ہموار، حلم مسا ہت اور نیکی اُن کی سرشت! ہمدردی و دردمندی شعار! لایعنی باتوں سے دُور رہتے! بوڑھے باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک! موت نے اس ٹھنڈک کو تپش اور جلن سے بدل دیا! مغفرت کا تعلق تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری بخشش بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے ہوگی ——— مگر سید صاحب مرحوم نیک اعمال کی وافر زادِ راہ اپنے ساتھ لے گئے، جو آخرت میں اُن کے کام آئے گی۔ آگے پیچھے کا معاملہ ہے موت ہر جان کو آکر رہے گی، موت سے کسی کو مفر نہیں! ساری دنیا کے ماتم و فریاد سے بھی گئی ہوئی جان واپس نہیں آسکتی! اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ہم زندوں کو اپنے فضل و کرم کا سزاوار بنائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۴ء)

نواب صدیق علی خاں

۱۹۳۸ء کی بات ہے ناگپور میں سیرت النبیؐ اور مسلم لیگ کے ملے جلے اجلاس تھے اور آل انڈیا مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا، مجھے بھی مشاعرے کا دعوت نامہ بھیجا گیا مگر مجھے مل نہیں سکا۔ میں حیدرآباد دکن سے وطن رخصت پر آیا ہوا تھا۔ یہاں آکر بھی عزیزوں سے ملنے ملانے کے لیے خاصے دن سفر ہی میں گزرے۔ متھرا میں میرے ایک عزیز تھے، اُن کے یہاں تین چار دن ٹھہرنے کے بعد اپنی اہلیہ اور اُن کی کمسن بھانجی اور بھتیجی کے ساتھ گرانڈ ٹرنک اکسپریس سے حیدرآباد جا رہا تھا، راستے میں ساغر نظامی اور مشہور افسانہ نگار اعظم کریوی[1] میرٹھ سے آرہے تھے، بولے کیا آپ ناگپور جا رہے ہیں؟ میں نے کہا میں ناگپور نہیں حیدرآباد دکن جا رہا ہوں! راستے میں ان دونوں حضرات کے ساتھ سفر کا لطف رہا۔ کانفرنس اور مشاعرے کے جو منتظمین ناگپور اسٹیشن ان حضرات کے استقبال کے لیے آئے تھے وہ مجھے دیکھ کر پیچھے پڑ گئے کہ آپ کو مشاعرے کا دعوت نامہ ہم نے بھیجا تھا مگر آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، یہ ہماری محبت کی کشش ہے کہ آپ ٹھیک مشاعرے کے دن ناگپور تک آگئے۔ میں نے بہت کچھ ردوکد کی مگر ان کا اصرار اس حد تک بڑھ گیا کہ مجھے ناگپور اترنا پڑا۔ گھر کے لوگ حکیم اسرار احمد کریوی کے یہاں اُن کی بیوی بچوں کے ساتھ ٹھیرے! مسلم لیگ کی کانفرنس کے تمام سامعین جن کی تعداد بیس ہزار سے کیا کم ہوگی مشاعرے میں موجود تھے، میں اُس زمانے میں یہ غزلیں مشاعروں میں پڑھا کرتا تھا:

پینے کی دیر ہے نہ پلانے کی دیر ہے
ساقی کے بس نگاہ اٹھانے کی دیر ہے

ہم بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

---

[1] افسوس ہے بہت دن ہوئے اُن کو کراچی میں قتل کر دیا گیا مگر نہ قاتل کا سراغ ملا اور نہ سبب قتل کا پتہ چلا۔

جامِ شراب، مست گھٹا مطرب و بہار | سب آ چکے ہیں، آپ کے آنے کی دیر ہے

تری محفلِ ناز سے اٹھنے والے | نگاہوں میں تجھ کو لیے جا رہے ہیں
مرے زخمِ دل کا مقدر تو دیکھو | نگاہوں سے ٹانکے دیئے جا رہے ہیں

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا | سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

نظموں میں "جمنا کنارا" اور "کمسن مزدور"! اس عظیم الشان مشاعرے میں میری پہلی غزل ہی کی وہ پذیرائی ہوئی کہ اس کی کیفیت بیان کروں تو خودستائی کا مجرم قرار پاؤں! اس مشاعرے کے بعد دسیوں کانفرنسوں اور مشاعروں میں ناگپور بار بار جانا ہوا۔ سی۔پی کے مسلم عوام راقم الحروف سے محبت کرتے تھے، بلاسپور، جبل پور، اور رائے پور صوبہ متوسط کے مشہور شہروں کے مشاعروں میں مجھے مدعو کیا گیا۔ رائے پور تو پانچ بار جانا ہوا، چھتیس گڑھ کالج ہندوؤں کا کالج تھا، اس کے پرنسپل کی وضع قطع سادھوؤں جیسی تھی مگر اس کالج میں تقریباً ہر سال مشاعرہ ہوتا اور پرنسپل صاحب بطورِ خاص شرکت فرماتے! اُن دنوں ہر طرف اردو ہی کا ڈنکا بجتا تھا!۔

سی۔پی میں مسلمانوں کی تعداد چھ سات فی صدی ہوگی مگر وہ ہندوؤں سے داب نہیں کھاتے تھے، جب کسی شہر میں تصادم کی نوبت آئی تو اللہ کے فضل سے میدان اہلِ ایمان ہی کے ہاتھ رہا اور اقلیت نے اکثریت کی خاصی پٹائی کر دی! مشہور متعصب مہاسبھائی لیڈر ڈاکٹر مونجے (ڈنڈے باز) ناگپور ہی کا رہنے والا تھا۔ ناگپور میں مہاسبھائیوں کا خاصہ زور تھا مگر ناگپور کے مسلمان بھی بنیان مرصوص بنے ہوئے تھے جن سے ٹکرا کر ہندو نقصان ہی میں رہتے تھے! مسلمانوں کو منظم کرنے میں نواب صدیق علی خاں کی تدبیر و حکمت اور دلیری کا بہت کچھ دخل تھا۔

ناگپور کے جس پہلے مشاعرے کا میں نے ذکر کیا ہے، وہی مشاعرہ نواب صدیق علی خاں مرحوم سے تقریبِ ملاقات کا سبب قرار پایا، پھر جب بھی ناگپور میرا جانا ہوتا، نواب صاحب سے ضرور ملاقات ہوتی، وہ صدر کے ایک بنگلہ نما مکان میں کرایہ سے رہتے تھے، یہ اُن کا معمول تھا کہ شعراء کو شام کے وقت چائے پر مدعو فرماتے! تازہ اور گرم کیک جو غالباً

خانہ ساز ہوتے تھے ہر عصرانہ میں ضرور رہتے۔

ناگپور میرا بار بار جانا ہوتا، میری یہ نظم :-

وہ ستاروں کا دوپٹہ، وہ لباسِ زرق برق　　　سر سے پا تک کہکشاں ہی کہکشاں میرے لیے

——— اسی دَور اور مقام کی یادگار ہے، اس نسبت سے بھی ——— پھر وہاں کے سنترے (سنگترے) جن کی لذت کام و دہن بھول ہی نہیں سکتے۔ پروفیسر منظور حسین شور کے بعد کامٹی کے نواب غازی آف گیوردھا، شاطر حکیمی، ناگپور کے حمید اور امراوتی کے ساقی خوش گو شعرا تھے، نواب مرزا داغ کے تلمیذ حضرت ناطق گلاوٹھوی نے جن کے ساتھ "پیر خمخانۂ سخن" لکھا جاتا تھا، ناگپور ہی کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا! اور خان بہادر ولایت اللہ اکبر الہ آبادی کے رنگ میں خوب کہتے تھے، ان تمام حضرات سے میرے مخلصانہ روابط تھے۔ سی۔پی کے سب سے بڑے مسلمان رئیس اور زمیندار نواب محی الدین خاں مرحوم سے بڑا یارانہ تھا، دو بار ان کی کوٹھی پر مہمان رہا، وہ عیش و تفریح کے رسیا اور سچ مچ لکھ لٹ تھے!

سی۔پی کے علاقہ برار میں مسلمانوں کی زیادہ آبادی تھی، اس لیے صوبہ مسلم لیگ کی صدارت کے لیے جب رائے شماری کا موقعہ آتا تو سید عبد الرؤف شاہ منتخب ہوتے، شاہ صاحب مرحوم زمیندار تھے، ایڈووکیٹ تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند، انتہائی مخلص لیڈر، شرافت اور نیکی تو ان کے چہرے سے برستی تھی صوبائی مسلم لیگ کا صدر ہی مسلم لیگ کے مرکز میں ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوتا تھا۔ نواب صدیق علی خاں مرحوم کا شمار مسلم لیگ کے چوٹی کے لیڈروں میں ہوتا تھا مسلم لیگ کی رضا کار تنظیم کے وہ سالار اعلیٰ بھی تھے، مگر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز انہیں حاصل نہ ہو سکا! غالباً ۱۹۴۱ء کی بات ہے سی۔پی مسلم لیگ کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ شاندار پنڈال، ہزاروں مسلمانوں کا اجتماع! بیگم مولانا محمد علی، نواب محمد اسماعیل خاں جیسے اکابر رہنما اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ سید عبد الرؤف شاہ خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو مجمع سے عجیب سی آوازیں (HISSING) آنے لگیں۔ پھر یہ شور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ پنڈال میں طوفان سا برپا ہو گیا۔ میرے پاس منتظمین آئے کہ آپ کھڑے ہو کر کچھ کہہ دیجیے، میں نے کہا کہ بھئی! اتنے بڑے بڑے لیڈر یہاں موجود ہیں، اُن سے مائکروفون پر کچھ کہلوایئے

اُن کے سامنے میری کیا حیثیت ہے ، مجھ غریب شاعر کی آواز اس نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوگی ، لیکن پھر چند حضرات کے بیحد اصرار پر میں کھڑا ہوا اور مسکرد قوں کے سامنے آیا تو میں نے محسوس کیا کہ شور میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور واقع ہوئی ہے ، پھر میں نے اپنے قطعہ کا پہلا مصرعہ پڑھا تھا کہ شور آدھا رہ گیا اور جب میں نے قطعہ سنایا :-

اخلاق کا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
اسٹالن و ہٹلر یہ زمانے کی نظر ہے ۔۔۔ میں مردِ مسلماں کی نظر دیکھ رہا ہوں

تو مجمع ساکت بلکہ ہمہ تن گوش تھا ! اور پھر جلسہ کی کارروائی آخر تک جاری رہی اور ذرا سی بھی گڑبڑ نہیں ہوئی ۔

نواب صدیق علی خاں عام سامعین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ، اُن کو بااصرار اسٹیج پر لایا گیا جس گروہ کو سید عبد الرؤف شاہ صاحب کی صوبائی صدارت اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کھلتی تھی ، اُس کی ہلڑ بازی کو شکست ہوئی ۔

ناگپور کے ابراہیم علی خاں فنا[1] ، یوپی کے حکیم اسرار احمد کریوی[2] اور بہار کے صلاح الدین[3] صاحب نواب صدیق علی خاں کے خاص مشیر اور خیر خواہ تھے ــــ نواب صاحب خود اپنی

---

[1] ناگپور کے معزز شہری اور مسلم لیگ کے پُرجوش ورکر ! دین و ملت اور پاکستان کے دردمند خیر خواہ پاکستان بننے کے بعد یو-پی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے ۔

[2] طبیب ، عالم ، مقرر اور نثر نویس ! دیکھنے میں دھان پان مگر ذہانت اور تدبیر و حکمت کا مرین ستون ! کراچی کے بہت سے کالجوں میں لیکچرار رہے لیکن ملازمت کے معاملے میں متلون واقع ہوئے ہیں ! ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے ۔ مشہور افسانہ نگار اعظم کریوی (مقتول) ان کے بڑے بھائی تھے ۔

[3] ۱۹۳۴ء میں جب راقم الحروف روزنامہ "مدینہ" بجنور کی ادارت سے وابستہ تھا تو یہ بھی میرے رفیق تھے ! پھر حیدرآباد دکن میں بھی اُن کا ساتھ رہا ، حیدرآباد کے بعد برسوں ناگپور میں مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو کے کارکن کی حیثیت سے کام کیا ۔ پاکستان بننے سے دو ڈھائی سال پہلے دلی چلے آئے ۔ انجمن ترقی اردو سے ملازمت کا تعلق تھا ۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق کے معتمد علیہ ! خاصے باغ و بہار آدمی اور عام معلومات میں چھوٹی موٹی ڈائرکٹری ! یار باش ، خوش خوراک اور دوستوں کو دعوتیں کھلا کر خوش ہونے والے خاصی عمر تجرد میں بسر کی ۔ پاکستان بننے سے کچھ قبل شادی کی اور بیوی بچوں کی ذمہ داریوں نے ان کو بالکل بدل دیا ۔ دوستوں کے کام کے نہیں رہے ، دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر اسی چکر میں مبتلا ہیں ۔

ذات سے بھی قابلِ ذکر شخصیت تھے مگر یہ بھی واقعہ ہے ان کی شخصیت کو چمکانے میں ان حضرات کے اخلاص و خیر خواہی کا بھی ہاتھ ہے۔

ناگپور سے دلودھا تقریباً بیالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ مقام گاندھی جی کا آشرم تھا۔ ودیا مندر کی اسکیم بھی اسی آشرم کے ایما پر وجود میں آئی تھی۔ ناگپور میں اردو دشمن اسکیم کے خلاف محاذ قائم ہوا، نواب صدیق علی خاں اس محاذ کے سربراہ تھے، اُن کے جوش و اخلاص کا عملی مظاہرہ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ اردو کی خاطر انہیں جیل جانا پڑا۔ اس سے اُن کا وقار مسلمانوں کی نگاہوں میں اور بڑھ گیا۔ مولوی عبدالحق ناگ پور کو جاگ پور کہا کرتے تھے۔ یعنی ایسا شہر جہاں کے مسلمانوں میں اردو زبان کی حمایت میں بیداری پائی جاتی ہے۔

راقم الحروف سے نواب صاحب ہمیشہ محبت[1] و اخلاص کے ساتھ ملتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ناگپور میں وہ مجھے اپنی کار میں لے جا رہے ہیں، اُن کی بیگم صاحبہ برقع میں اُن کے برابر بیٹھی ہیں اور میں پچھلی سیٹ پر! ایک بار دلی میں ملاقات ہو گئی، اُن دنوں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، وہ اور حاجی عبدالستار مسعود فتحپوری کے سامنے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے، ان دونوں میں بڑا یارانہ تھا ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتے اور ایک ہی تانگے میں اسمبلی ہال جاتے۔ نواب صدیق علی خاں نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ ہوٹل میں ایک دن کھانا کھائیے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو خود مسافر ہیں، دعوت کے مستحق تو مسافر ہیں نہ کہ مسافر دوسروں کی دعوت کریں، مگر ان کے محبت آمیز اصرار کے آگے میری کچھ نہ چل سکی۔ شب میں دعوت تھی، خاصے پُرتکلف اور لذیذ کھانے۔ اس مسافرت میں مرغِ مسلّم تک تیار کرایا، میں اپنے ہم زلف بالو عبدالکریم خاں مرحوم کو بھی ساتھ لے گیا! کھانے کے بعد شعر خوانی بھی رہی!

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے، میں بنگلور کے آل انڈیا مشاعرے میں گیا ہوا تھا، وہاں احباب نے کہا کہ مسلم لیگ کی جانب سے جلسہ کرنے کا ارادہ ہے آپ کے خیال میں مسلم لیگ کے کس لیڈر کو بلایا جائے۔ میں نے کہا ناگپور کے

---

[1] ان کی کتاب "بے تیغ سپاہی" پر میں نے جو مفصل تبصرہ کیا تھا، اس کے بعض حصوں پر کبیدگی محسوس کی۔ مگر میں کیا کروں مصنفوں اور شاعروں کی دلدہی کے لیے کتاب کے کمزور پہلوؤں سے صرف نظر نہیں کر سکتا! اور ذاتی تعلقات اس راہِ دیانت میں حائل نہیں ہو سکتے۔

نواب صدیق علی خاں کو ! میرے اس انتخاب پر سب نے صاد کیا۔ نواب صاحب بنگلور تشریف لائے اور بڑے دھوم کے جلسے ہوئے۔ اُن کی جوشیلی تقریروں کو خاصہ پسند کیا گیا۔ میں ایس۔ مکے عبدالعزیز فرنیچر مرچنٹ کے بنگلہ میں دو ہفتہ سے ٹھہرا ہوا تھا، وہیں نواب صاحب مرحوم نے قیام فرمایا۔ کئی دن اُن کا ساتھ رہا۔ عبدالعزیز صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے عبدالرحمٰن مہمانوں کی خاطرداری اور پذیرائی میں امیرانہ مزاج رکھتے ہیں، میں نے دو دو تین تین ہفتے اُن کے قیام کیا، موٹر کار ہر وقت سواری میں رہتی تھی! تواضع و مدارات کی کوئی حد و نہایت نہیں!

نواب صدیق علی خاں پاکستان بننے کے بعد قائدِ ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں کے پولٹیکل سکریٹری رہے۔ قائدِ ملت ان کو بہت چاہتے تھے اور ان کی ذات پر اعتماد کرتے تھے۔ راولپنڈی کے اجتماعِ عام میں تقریر کرتے ہوئے نواب زادہ صاحب کے جب گولی لگی ہے تو نواب صدیق علی خاں اسٹیج پر موجود تھے۔ انہوں نے بڑھ کر شہیدِ ملت کو سنبھالا اور انہی کی گود میں ان کا دم نکلا۔ اس واقعہ کو جب وہ بیان کرتے تو نواب صاحب کی آواز گلوگیر اور پلکیں نمناک ہو جاتیں۔

کئی ملکوں میں وہ پاکستان کے سفیر اور ہائی کمشنر رہے، بڑی دیانتداری اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دیا۔ ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف نیروبی (ایسٹ افریقہ) گیا تو وہاں کے مسلمان نواب صاحب کے اخلاق اور برتاؤ کے مداح تھے۔ مسلم لیگ سے اُن کی وابستگی اُن کو ہر طرح سے راس آئی۔ شاندار بنگلہ، سواری کے لیے کار، خدمت کے لیے نوکر چاکر! آرام و آسائش کی زندگی![1] اپنی جائداد وقف کر کے (غالباً) ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا، پاکستان کے حالات کی ابتری سے بہت مغموم تھے۔ اسی غم کو لے کر دنیا سے رخصت ہوئے! (ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۴ء)

---

[1] اُن کے رفیق اور قدیم دوست حاجی عبدالستار سیٹھ کے حالات آخر عمر میں اس کے برعکس ہیں۔

حضرت صفی لکھنوی

حضرت صفی لکھنوی کو میں نے پہلی بار ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، دیکھنے سے میرا مطلب دُور کا نظارہ ہے، ملاقات اور بات چیت نہیں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان ابن سعود کی فوجیں یلغار کرتی ہوئیں مکہ معظمہ تک پہنچ چکی تھیں، حجاز میں سعودی حکومت قائم ہو چکی تھی اور شریف حسین حجاز سے اپنا بوریا بستر باندھ کر قبرص پہنچ چکے تھے شریف حسین سے تمام عالم اسلام ناراض تھا مگر حجاز میں مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ سعودی فوجوں نے جو ناروا سلوک کیا تھا اس سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی — لکھنؤ میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ حجاز کانفرنس ہوئی، صالح بھائی بڑودہ والے اس کے صدر تھے، ملک کے قریب قریب تمام مسلمان عمائد، علما اکابر اور مشاہیر جمع تھے، شیعوں کے مجتہد مولانا آقا حسین صاحب اور مولانا نجم الحسن صاحب کے دوش بدوش مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کو بھی دیکھا گیا، مولد النبیؐ اور جنت البقیع بہرحال سب کے نزدیک محترم ہیں — اس کانفرنس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی شریک تھے، بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں، سید جالب دہلوی مرحوم (مدیر روزنامہ ہمدم وہمت) رپورٹر کی حیثیت سے ڈائس کے فرش پر بیٹھے ہوئے جلسہ کی کارروائی لکھتے جاتے تھے۔

اسی حجاز کانفرنس میں صفی لکھنوی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں نظم سنائی، جس کا ایک ٹیپ کا بند مجھے یاد رہ گیا۔

اٹھتی ہے گرد مولدِ خیر الانامؐ سے
اے تیغ انتقام نکل آ نیام سے

۱۹۲۷ء میں دوسری بار حضرت صفی لکھنوی کو بہارِ ادب (لکھنؤ) کے ایک مشاعرے میں دیکھا جو شہنشاہ حسین وکیل کے مکان میں منعقد ہوا تھا، مدرستہ الواعظین کے پرنسپل مولانا سید سبط حسن صاحب نے "شاعری" پر تقریر کی اور پھر جو مشاعرہ

شروع ہوا ہے تو صبح کے دس بجے جا کر ختم ہوا، حضرت عزیز لکھنوی کو بھی اسی مشاعرہ میں دیکھا اور سُنا، ان کی طرحی غزل کے دو شعر اب تک یاد ہیں۔

اے نگاہِ شوق! تو نے کر دیا رسوا مجھے
اس نے دیکھا اور اسی انداز سے دیکھا مجھے

قصۂ عہدِ جوانی پوچھتے کیا ہو عزیز
آ گیا تھا اتفاقاً نیند کا جھونکا مجھے

میں اُن دنوں لکھنؤ میں اپنے ایک عزیز کے یہاں صدر بازار میں ٹھہرا ہوا تھا، اخبار میں مشاعرے کی اطلاع پڑھ کر تماشائی کی حیثیت سے چلا گیا، مشاعرے میں پہلی بار لکھنؤ کی وہ گلوریاں کھائیں جن میں لونگوں کی جگہ لوہے کی کیلیں لگائی جاتی ہیں، لکھنؤ کی نفاست اور نزاکت کا میں معترف ہوں مگر یہ "فولادی قسم کی جدت" پسند نہ آئی۔

تقسیم ہند سے تین سال قبل میرٹھ میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا، مشاعرہ گاہ کے چاروں طرف شاعروں کے ٹھہرنے کے لیے خیمے لگائے گئے تھے، پنڈال، خیمے اور دروازوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ "مشاعرہ سٹی" بنایا گیا ہے، شعراء کی تعداد ایک سو کے قریب تھی، ہندوستان کے ایک ایک گوشہ سے مشہور شعراء کھنچ کر آ گئے تھے، دو نشستیں ہوئیں ایک کی صدارت سر سیتارام (سابق انڈیا ہائی کمشنر) نے کی اور دوسرے اجلاس کے صدر سر سید رضا علی مرحوم تھے، میرٹھ کمشنری کے انگریز کمشنر نے بھی مشاعرے میں شرکت کی، اسی مشاعرے میں پہلی اور آخری بار حضرت صفی لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔

جناب صفی لکھنوی کی شاعری قدیم اور جدید طرز کا سنگم ہے، اُن کی قومی نظمیں کافی شہرت پا چکی ہیں، یہ انھی کا شعر ہے:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

حضرت صفی لکھنوی نغز گو شاعر ہی نہیں مستند اُستاد بھی تھے اُن کے شعر زبان کے لیے "سند" کی حیثیت رکھتے ہیں، صفی کے دم سے سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کی عزت قائم تھی —— اور یہ میں نے "قائم تھی" کیا کہا، اب بھی قائم ہے کہ صفی دنیا سے چلے گئے مگر ان کا کلام زندہ ہے۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

نواب صولت علی خاں

سنہ ۱۹۴۰ میں پہلی بار رام پور میرا جانا ہوا، سر بشیر حسین زیدی اُن دنوں ریاست رام پور کے وزیر اعظم اور ضمیر احمد ہاشمی ڈپٹی ریوینو منسٹر تھے، رام پور میں ایک ادبی بزم[1] قائم تھی، جس کے سربراہ ہاشمی صاحب تھے، اس بزم کی جانب سے ہر مہینہ یا کچھ زیادہ وقفہ سے دو شاعروں کو بلایا جاتا تھا، میں جس اجتماع میں شریک ہوا اس میں میرے علاوہ دوسرے شاعر پنڈت نارائن مُلّا کو مدعو کیا گیا، مخصوص محفل تھی، مسند صدارت پر سید بشیر حسین زیدی متمکن تھے۔ کئی گھنٹہ تک ہم دونوں شاعر یکے بعد دیگرے غزلیں اور نظمیں سُناتے رہے! مشاعرے کے بعد جو اشخاص راقم الحروف سے ملنے کے لیے آئے، انہوں نے کہا کہ آپ زیدی صاحب سے ضرور ملیں، وہ آپ کے مداح ہیں، بعض حضرات نے دبے لفظوں میں یہ بھی اشارہ کیا کہ زیدی صاحب آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر میں اُن سے ملنے کے لیے نہیں گیا۔ میں نے اپنے بعض بہی خواہوں سے واضح طور پر کہہ دیا کہ آپ کے چیف منسٹر صاحب مجھے خود کیوں نہیں بُلا لیتے، ملاقات میں میری طرف سے پہل ہو، اس کے وہ کیوں منتظر ہیں۔

صاحبزادہ عبدالجلیل خاں صاحب رام پور اسٹیٹ میں ہوم منسٹر تھے، انہوں نے عصرانہ میں مجھے مدعو فرمایا، مگر جب میں بعض احباب کے ساتھ اُن کی کوٹھی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ صاحبزادہ صاحب کا حقیقی بھانجہ جو ہوائی جہاز کا پائلٹ تھا ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گیا اور صاحبزادہ صاحب دہلی تشریف لے گئے مگر انہوں نے دعوت ملتوی نہیں کی۔ مہمانوں کے لیے چائے اور اس کے لوازمات کا اہتمام تھا، لیکن میں نے کہا کہ اس المیہ اور سانحہ کے بعد چائے نوشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، دوسرے

---

[1] اس بزم نے "اوراقِ گُل" کے نام سے ایک تذکرہ شائع کیا۔

تمام مہمانوں نے میری رائے سے اتفاق کیا، میزوں پر رکابیاں رکھی جاچکی تھیں مگر کسی نے انہیں نہیں چھوا۔

صاحبزادہ ہی کی اجازت سے رام پور کی اسٹیٹ لائبریری دیکھنے کا موقع ملا، مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بڑی محبت کے ساتھ لائبریری کے بعض نادر مخطوطات کی تفصیل بیان کی، اس کے بعد شہر کی "صولت لائبریری" میں جانا ہوا، سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب تھی، وہ لائبریری کے نام کی نسبت تھی، مجھے بتایا گیا کہ نواب صولت علی خاں صاحب اس لائبریری کے بانی ہیں! میں نے پوچھا کہ کیا وہ حیات ہیں؟ جواب میں کہا گیا کہ وہ بقید حیات ہیں، ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور سے سخت اختلاف ہوگیا تھا، جس کے نتیجے میں انہیں رام پور چھوڑنا پڑا اور اب انہوں نے بریلی میں اقامت اختیار کرلی ہے۔

صولت علی خاں مرحوم سے یہ میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا، ان سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوئی اور پہلی ملاقات ہی میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو نہ جانے کب سے جانتے ہیں اور دینی افکار میں ہم خیال ہیں۔ میونسپل کارپوریشن کے سامنے بندر روڈ پر ان کے صاحبزادے کی شاپ ہے، جس میں بجلی کا سامان ملتا ہے، اسی شاپ میں ان کی نشست رہتی تھی، جب بھی میرا وہاں جانا ہوتا، چائے یا خنک مشروبات سے تواضع کی جاتی۔

دبلا پتلا جسم، اسی تناسب سے چھوٹا قد مگر عزم وحوصلہ میں وہ توانائی کہ اپنے یہاں کے خود مختار والئ ملک سے ٹکرلی اور جلاوطن ہونا قبول کیا مگر طاقت کے آگے جھکے نہیں ——— جماعتِ اسلامی کے متفقین میں برسوں شامل رہے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس حق پسند جماعت کی رکنیت کی توفیق عطا کی۔ دین ہی کی مدافعت وتبلیغ کے جذبہ نے انہیں مصنف بنا دیا، ایک کتاب لکھ کر چھپوائی جو دینی افکار کی آئینہ دار ہے، اسی کتاب کا دوسرا حصہ مرتب فرما رہے تھے، کہ دل کے شدید دورے پڑنے لگے۔

خداداد کالونی میں ان کا مکان تھا مگر ادھر دو تین سال سے زیادہ تر سعود آباد میں رہنے لگے تھے، وہاں کی آب وہوا ان کو موافق آگئی تھی، وہ نام کے "نواب

نہیں دل کے بھی نواب تھے، سیر چشم اور متواضع! دینی کاموں میں اُن کے دستِ کرم کو کشادہ ہی دیکھا گیا۔

چھ سات مہینہ پہلے اُن کے گھر کے لوگ رام پور جا رہے تھے، برسوں کی جلاوطنی کے بعد اُن کا بھی رام پور جانے کا ارادہ تھا مگر وقت کے وقت طبیعت اس حد تک ناساز ہو گئی کہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دینا پڑا، اور اس کے بعد سے طبیعت پھر سنبھلی نہیں بگڑتی ہی چلی گئی۔

رام پور کے شوکت علی خاں صاحب خاصے اہتمام سے ہر سال پاپوں کی دعوت کیا کرتے ہیں، امسال نواب صولت علی خاں صاحب کو آخری بار اُسی دعوت میں دیکھا، وہ نحیف الجثہ تو تھے ہی برسوں کی علالت نے سچ مچ دھان پان بنا دیا تھا ـــــ میں مکہ معظمہ میں تھا، روزنامہ "جنگ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی ـــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۶۹ء)

پروفیسر مولانا ضیاء احمد بدایونی

ضلع بدایوں میں گنور ایک قصبہ ہے جو راقم الحروف کے سابق وطن ذکسیر کلاں ہے تقریباً دس میل دور ہے۔ ضلع بلند شہر اور ضلع بدایوں کے درمیان گنگا ندی حدِ فاصل ہے، ۱۹۲۲ء میں وہاں ایک طرحی مشاعرہ ہوا، میں اُن دنوں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اس مشاعرے کے بعد گنور کے ایک صاحب ہمارے گاؤں میں آئے اور راقم الحروف کا یہ شعر

پتلیاں ہیں آخری گردش میں اب بھی دیکھ جاؤ
بات کہنے کو رہے مرنے میں آسانی ہوئی

سنایا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی! یہ مشاعرہ مولانا ضیاء احمد بدایونی کی صدارت میں منعقد ہوا، بدایوں، بلند شہر اور علی گڑھ کے شاعروں نے شرکت کی، مولانا مرحوم کے والد ماجد مولوی رفیع احمد عالیؔ جو امیر مینائیؔ سے نسبتِ تلمذ رکھتے تھے اور تحصیل گنور میں مختار (یا وکیل) تھے، انہوں نے بھی اس مشاعرے میں طرحی غزل پڑھی!

بدایوں میں ایک شاعر تھے علی حاتم، جو طنزیہ رباعیات اور قطعے کہتے تھے، بدایوں سے تین چار میل پر ایک گاؤں شیخو پورہ ہے جہاں کے رؤسا نسباً فریدی شیوخ ہیں، اُن کو "خان بہادر" کے خطابات انگریزی حکومت سے ملے تو علی حاتم نے رباعی کہی، جس کی آخری بیت یہ تھی۔

بھرمار اگر یونہی خطابوں کی رہی — شیخو پورہ خان پور ہو جائے گا

اسی بستی کے سب سے بڑے زمیندار نواب عبدالغفار کو C.I.E کے خطاب ملنے پر علی حاتم نے قطعہ موزوں کیا اور خود نواب صاحب کو جاکر سنایا، جس کا آخری مصرعہ تھا ؎

دیکھ لینا ایک دن ڈبی، آئی، ای ہو جائیں گے

یعنی انتقال (۶۱۵ء) فرما جائیں گے۔

علی حاتم ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے، انہوں نے گنور کے اس مشاعرے پر جو قطعہ کہا، اس کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔

؎ بیٹے کی صدارت میں باوا کی غزل خوانی

گنور میں مولانا ضیاء احمد بدایونی کو پہلی بار دیکھا، گفتگو کا موقع نہ مل سکا، ہاں! لوگوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ صاحب موصوف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی کے لیکچرار ہیں ـــــ اس مشاعرے کے چودہ پندرہ سال بعد میں حیدرآباد دکن سے علی گڑھ آیا اور وہاں کے نامور بیرسٹر اے۔ آر۔ قادری "مرحوم" کے صاحبزادے واحد بخش قادری کے یہاں مہمان رہا، میرے آنے کی خبر سن کر مولانا ضیاء احمد مرحوم نے مجھے شام کی چائے پر بلایا، اس شعری نشست میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ کچھ شعراء بھی تھے، جن میں مضطر خیرآبادی کے فرزند جاں نثار اختر کا نام یاد ہے، وہ اُن دنوں ایم اے کے طالب علم تھے۔ خاصی طویل مگر شگفتہ نظم انہوں نے ترنم سے سنائی، سامعین کی فرمائش اور اصرار پر راقم الحروف نے متعدد غزلیں اور نظمیں پیش کیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ میں بہت کچھ سنا دیا۔ جب ہم اس تقریب سے واپس آئے تو واحد بخش قادری مرحوم نے کہا، بھیا ماہر! بڑی چوک ہوگئی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا وہ کیا ـــــ؟ بولے مولانا ضیاء احمد صاحب سے کسی بندۂ خدا نے کلام سنانے کے لیے نہیں کہا! وہ خود ہی تمام شاعروں سے فرمائشیں کرتے رہے!

پھر ڈیڑھ دو سال بعد بدایوں جانا نکل آیا، یونیورسٹیوں کی چھٹیوں کا زمانہ تھا، مولانا ضیاء احمد بدایونی اپنے وطن گئے ہوئے تھے۔ صبح کے ناشتے پر خاکسار کو اپنے کرم سے بلاکر عزت بخشی، بدایوں شاعروں، عالموں اور مزاروں کا شہر ہے (غالباً) مصحفی سے یہ شعر منسوب ہے:

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
ہر گھر میں جس کے ایک مزارِ شہید ہے

مولانا مرحوم کی اس دعوت میں بدایوں کے شعراء ایک درجن سے کچھ زائد ہی ہوں گے، بدایوں کے پیڑوں کا میں عاشق و شیدائی، ناشتہ میں پیڑوں کی فراوانی، خوب

سیر ہو کر اور جی لگا کر ناشستہ کیا۔ مولانا ضیاء احمد کی تاریخی اور اسلامی نظمیں پہلی بار اُن کی زبان سے سنیں، جن کا نقش اب تک باقی ہے!

مولانا مرحوم کے مضامین اور نظمیں رسالوں میں پڑھتا رہا مگر اُن سے ربط "فاران" کی اشاعت کے بعد ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا، میں نے اُن کی خدمت میں رسالہ بھیجا اور مضمون کے لیے درخواست کی، انہوں نے میری گذارش والتجا کو شرفِ پذیرائی بخشا اور مقالہ بھیج دیا۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی کے متعدد مضامین اور چند نظمیں "فاران" میں شائع ہوئیں، میری گذارش کو وہ ٹالتے نہ تھے۔ "فاران" کے توحید نمبر میں اُن کی نظم "غیر اللہ کو سجدہ" کے عنوان سے شائع ہوئی اور سیرت نمبر کے لیے انہوں نے "فارسی شعرا اور نعتِ رسول" پر مقالہ بھیجا۔ اس میں انہوں نے جناب ابو طالب (عمِّ رسولؐ) کعبؓ بن زہیر، حسانؓ بن ثابت کے نعتیہ عربی اشعار کے بعد سنائی، سید حسن غزنوی، خاقانی شروانی، مولانا نظامی گنجوی، فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، سعدی، امیر خسرو، مولانا جامی، فیضی، عرفی، قاآنی، غالب اور اقبال کی فارسی نعتیہ شاعری کا انتخاب دل نشین ترجمہ وتشریح کے ساتھ پیش فرمایا بعض شعراء کے مختصر حالات بھی قلم بند کیے۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی کا یہ مقالہ "فاران" کے چوبیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس موضوع پر تحقیق وتشریح، شعر فہمی اور عقیدت واخلاص کا مقدس خریطہ اور بیش بہا گنجینہ ہے۔

بارہ برس ہوئے ہوں گے جب مولانا ضیاء احمد بدایونی کراچی تشریف لائے کئی دعوتوں میں اُن سے نیاز حاصل ہوا، یہ آخری ملاقات تھی! پھر وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کی صدارت (Dean) سے سبکدوش ہو کر، دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، وہاں سے اُن کے خطوط اور گاہے ماہے مضامین آتے رہتے! خط اتنا پاکیزہ اور نستعلیق اور عبارت اتنی شستہ اور رواں کہ پڑھتے ہیں آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا!

عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ان چاروں زبانوں میں وہ دست گاہ کامل رکھتے تھے، مطالعہ کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کا تعلق ہے اُن کے ہم عصروں میں شاید دو چار حضرات فارسی دانی میں اُن کی ٹکر کے ہوں گے۔

اپنی ذات سے فارسی معلومات کی انسائیکلو پیڈیا! ہزاروں طلبہ نے اُن سے استفادہ کیا، اُن کے تلامذہ میں زندہ مثال جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (صدر شعبۂ فارسی سندھ یونیورسٹی) کی ہے جو مولانا مرحوم کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں اور جن کے علمی تبحر اور زہد و تقویٰ کی قسم کھائی جاسکتی ہے! فارسی زبان اور شعر و ادب کی تحقیق میں ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے فاضل اُستاد کا "برزخ" واقع ہوئے ہیں!

مولانا ضیاء احمد مرحوم کئی کتابوں کے مصنف تھے، اُن کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا، سطحی مباحث کو انہوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، علم و تحقیق میں وہ اسلاف و اکابر کی یادگار تھے۔ مولانا مرحوم غزل کے نہیں تاریخی، اخلاقی اور اسلامی نظموں کے شاعر ہیں، ان کی نظمیں علامہ شبلی کی نظموں کی یاد تازہ کرتی ہیں، یہ نظمیں یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔

جن کو "بریلوی عقائد" کہا جاتا ہے اس کا اصل مرکز تو بدایوں ہے، مولانا احمد رضا خاں صاحب بدایوں کے شیخ طریقت اور عالم دین مولانا عبدالقادر محب رسول کے شاگرد تھے۔ عرس، نذر و نیاز، غیر اللہ سے استغاثہ ...... اس قسم کے تمام عقائد اور رسوم و اشغال بدایوں کے مسلمانوں پر چھائے ہوئے تھے، مگر مولانا ضیاء احمد بدایونی نے اپنے ماحول کا اثر قبول نہیں کیا، وہ بدعات کے مخالف اور توحید و سنت کے موید بلکہ مبلغ تھے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتہائی قدرشناس اور مداح! "ادبیاتِ مودودی" میں اُن کا فاضلانہ مقالہ (مولانا مودودی کی تحریر) شامل ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے خیال میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اُن چند علماء اسلام میں سے ہیں جن کو مجمع البحرین کہنا چاہیئے۔" (ص۱۰۱)

"جدید و قدیم دونوں اسلحہ سے آراستہ ہو کر جہاد بالقلم و باللسان کا فرض ادا کر رہے ہیں، مولانا کی قوتِ اجتہاد اور زورِ استدلال نہایت زبردست ہے۔ اس کے ساتھ خدا نے ان کو ایسا ادیبانہ انداز اور دلنشین اسلوب بخشا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔" (ص۱۰۱)

"ان کی عبارت کی دوسری خصوصیت اُن کا تجزیہ مسائل اور جزئیات پر نظر ہے۔ یہ وصف ان کی بالغ نظری اور علوم جدیدہ سے آگاہی کا نتیجہ ہے۔" (ص۱۰۱)

"مولانا مودودیؒ کی نظر واقعات کی ظاہری سطح سے گزر کر اصل حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کی خوگر ہے، یہی وجہ ہے کہ جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں وہ محکم اور اٹل ہوتے ہیں۔"

"مولانا کی قوتِ متخیلہ نہایت "FERTILE" ہے، اسی کا اثر ہے کہ وہ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے بے حد مناسب اور موزوں تمثیلات اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں، جن سے مفہوم پوری طرح دل میں اتر جاتا ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ کیمیائے سعادت اور مثنوی رومی کی تمثیلات کے بعد مولانا کی تمثیلات ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔" (صفحہ ۱۱)

"مولانا مودودیؒ نے ہماری زبان کو نئے حیات بخش خیالات سے مالا مال کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مؤثر دلکش اسلوب بھی دیا ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ نئی تعلیمیافتہ جماعت جس قدر موصوف کے افکار سے متاثر ہوئی ہے، اس قدر کسی دوسرے سے نہیں ہوئی، اس لیے بے جا نہ ہوگا اگر ان کو دورِ حاضر کا "متکلم الاسلام" کہا جائے۔"

یہ دلیل ہے مولانا ضیاء احمد بدایونی مرحوم کی حق پسندی اور جوہر شناسی کی! اتنے بڑے عالم ادیب اور محقق کا مولانا مودودیؒ کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کرنا ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو مولانا مودودی مدظلہٗ کے بارے میں معاصرانہ تعصب میں مبتلا ہیں!

راقم الحروف کو اس بات کا فخر ہے کہ مولانا ضیاء احمد بدایونی کو "فاران" کے آنے کا انتظار رہتا تھا اور اُسے دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے، کسی مہینہ کا رسالہ نہ ملتا تو اس کی اطلاع دیتے، گم شدہ شمارہ دوبارہ اُن کی خدمت میں بھیج دیا جاتا! میں نے اُن کے کرم نامے محفوظ نہیں رکھے، ان میں اس ہیچمداں کے بارے میں قدر افزائی اور تحسین وپسندیدگی کے الفاظ تھے!

مولانا مرحوم کا پورا گھرانہ شعر وادب اور علم وتحقیق کا ذوق رکھتا ہے، اُن کے والد شاعر، بڑے بھائی مولانا تمنی سخن سنج وسخن گو، اُن کے برادرِ خرد آفتاب احمد جوہر (ریٹائرڈ سشن جج) اردو غزل گوئی میں سینکڑوں شاعروں پر بھاری، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ظہیر احمد متعدد کتابوں کے مصنف اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر!

افسوس ہے ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ عمر چھتر برس سے کیا کم ہوگی! علم وفضل کا تابندہ ودرخشاں ستارہ موت کے پس منظر میں چلا گیا، اللہ تعالیٰ قبر سے لے کر روزِ جزا تک ہر مرحلہ کو اُن کے لیے آسان بنا دے! برد اللہ مضجعہ ورحمہ اللہ تعالیٰ!

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۷۳ء)

ضیاءالدین احمد برنی

اس بخت و اتفاق کو کیا کہئے کہ اکثر و بیشتر لوگوں سے میری ملاقات اور تعارف مشاعروں کے واسطہ سے ہوا ہے۔ افسوس ہے گزشتہ واقعات کے ماہ و سال ٹھیک طور پر یاد نہیں رہے، غالباً ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے بمبئی میں "یوم اکبر" منایا گیا اور اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی ہوا، اس تقریب میں بعض مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں نے مل جل کر حصہ لیا، یہ اکبر — لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نہیں — مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر تھا۔

ضیاءالدین احمد برنی نے مشاعرے کے لیے بمبئی سے دعوت نامہ بھیجا، میں ان دنوں حیدرآباد دکن میں رہتا تھا، ریل کے کرایہ اور نذرانہ کی جو رقم دعوت نامہ میں لکھ کر آئی، وہ بہت کم تھی مگر بمبئی جانے کے شوق میں راقم الحروف نے رد و کد نہیں کی۔ بات پکی ہو گئی مقررہ تاریخ پر میں بمبئی پہنچا، بوری بندر ریلوے اسٹیشن پر چھریرے بدن کے ایک پست قامت صاحب نے جو عینک لگائے ہوئے تھے بڑھ کر سلام کیا اور بولے میں ضیاء الدین برنی ہوں!"

قلی نے جب سامان اٹھا لیا تو وہ بولے کہ ہوٹل جہاں آپ کو قیام کرنا ہے، بہت قریب ہے، کیا آپ وہاں تک پیدل چل سکیں گے؟ میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں مگر دل میں سوچا کہ یہ صاحب "مہدی الاقتصادی" کی قسم کے معلوم ہوتے ہیں، خرچ کے معاملہ میں محتاط!

کرافٹ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں ہوٹل تھا، سید فضل شاہ مرحوم اس ہوٹل کے مالک تھے۔ وہاں ہم چند منٹ میں پہنچ گئے۔ وکٹوریہ میں اتنی دور جاتے تو روپیہ بارہ آنہ کرایہ دینا پڑتا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اس ہوٹل کی تعریف میں نظمیں کہی ہیں۔

صابو صدیق ہال میں مشاعرہ ہوا، میں نے ایک غزل پڑھی، سامعین نے کہا "ایک اور"، میں نے پھر نظم سنائی، پھر دوسری غزل کے لیے اصرار ہوا، چوتھی یا

پانچویں غزل پر میں نے بے چینی محسوس کی، اور ایک غزل طبیعت پر جبر کر کے اسی عالم میں پڑھی، مگر حالت غیر ہوئی جا رہی تھی، ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگا اور اسٹیج پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا، میں ہال سے نکل کر صحن میں پہنچا۔ وہاں جا کر کئی بار قے کی اور سبزے پر تڑپنے لگا، قے کرنے میں جو جھٹکے لگے وہ دل کی دھڑکن کے لیے مہمیز ثابت ہوئے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے، میں نے کہا کہ میں اپنے مزاج اور طبیعت سے واقف ہوں۔ کبھی کبھار اس قسم کے دورے مجھ پر پڑ جاتے ہیں، مجھے نہ دوائی پلائی جائے اور نہ انجکشن لگانے کی زحمت کی جائے، برف کی ڈلی چوسنے سے مجھے افاقہ ہو جاتا ہے۔ آپ حضرات برف کا انتظام فرما دیں، اور میں اس حالت میں ہوٹل جانے کے قابل نہیں ہوں، اسی احاطے کی عمارت میں میرے سونے کا بندوبست کر دیا جائے۔

لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ ماہر نے شراب مقدار سے زیادہ پی لی تھی، گرمی کے سبب چکر آ گیا اور ایسی حالت میں کوئی شرابی قے کے بغیر نہیں رہ سکتا! مجھے اسی عمارت میں سلایا گیا، صبح کو اٹھا تو طبیعت چاق چوبند تھی۔

اس کے بعد بمبئی میرا مسلسل آنا جانا ہوتا رہتا، کئی کئی مہینے وہاں قیام کرتا، برنی صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی، ایک بار انہوں نے اپنے یہاں چائے پر بھی بلایا تھا۔

پاکستان بن جانے کے بعد تو وہ اور میں ایک ہی شہر کے باشندے ہو گئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملنا ہوتا رہتا، پان اسلامک شپنگ کمپنی سے ملازمت کا تعلق تھا اور غالباً آخر دم تک رہا، گھنٹہ سوا گھنٹہ کا کام، ایک طرح کی پنشن سی تھی اور شاید بعد میں تو دفتر کی یہ برائے نام حاضری بھی معاف کر دی گئی۔

مرنے سے چار پانچ سال پہلے فیڈرل ایریا میں خاصا آرام دہ مکان بھی بنوا لیا تھا۔ ٹیلی فون بھی تھا۔ اسی زمانے میں دل کے دورے پڑنے لگے، جس کے سبب باہر آنا جانا موقوف ہو گیا۔ میں ایک بار رازق الخیری صاحب مدیر "عصمت" کی معیت میں ان سے ملنے کے لیے گیا، گھنٹہ پون گھنٹہ بات چیت ہوئی، چائے پلائی ہلکے پھلکے لوازم بھی تھے۔

بہت سے بہت ڈیڑھ سال ہوا ہوگا ضیاء الدین برنی مرحوم کے صاحبزادے کی شادی میں ان سے آخری بار نیاز حاصل ہوا۔ بنگلور ٹاؤن کے ایک ہال میں ولیمہ کا انتظام تھا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مہمانوں کی تعداد کئی سو کی تھی، مگر وہ اپنی محبت سے میرے قریب بیٹھے رہے۔ جناب رازق الخیری صاحب قدرے تاخیر سے آئے، انہیں دیکھ کر کچھ فقرے چست کیے، رازق الخیری صاحب سے نوک جھونک رہتی تھی۔

نیروبی (ساؤتھ افریقہ) میں محبی اسمٰعیل احمد مینائی کے خط سے اُن کے انتقالِ پُرملال کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مرحوم برن (بلند شہر) یا اس ضلع کے کسی قصبہ یا گاؤں کے باشندے نہیں تھے، مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی مناسبت سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے ان کو یہ "نسبت" عطا فرمائی۔

ضیاء الدین احمد برنی کے والد منشی محمد الدین دہلی کے مشہور خطاط تھے، نسخ اور نستعلیق کے استاد! مرحوم کے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر نے بھی خوشخطی سیکھی تھی، وہ اپنے نام کے ساتھ "دالاخوان" (AND BROTHERS) لکھتے تھے۔ مگر یار لوگ یہ سمجھے کہ جس طرح مولود خواں اور مرثیہ خواں ہوتے ہیں، یہ "الاخوان" بھی اسی طرح کا کوئی لقب ہے۔ منشی عبدالقدیر مرحوم سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک کانگریس بن کر رہ گئے تھے؟ برنی صاحب کے چھوٹے بھائی منشی محمد یوسف پاکستان اور ہندوستان کے سب سے بڑے خطاط ہیں۔ اپنے وقت کے میر پنجہ کش! مگر سنکی واقع ہوئے ہیں۔

ضیاء الدین احمد برنی نے ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے پریویس پاس کیا، اور ان کی صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کی سب ایڈیٹری سے ہوا۔ تقریباً تیس سال تک حکومت بمبئی کے دارالترجمہ میں سینئر اردو ٹرانسلیٹر کے عہدے پر فائز رہے اور پنشن لے کر سبکدوش ہوئے۔

بہت سی کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم تھے، ان میں "عظمتِ رفتہ" خاص طور سے ذکر کے قابل ہے، پاکستان اور ہندوستان کی بڑی سے بڑی شخصیتوں کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور بہت سوں سے روابط بھی رہے۔

ضیاءالدین احمد برنی مرحوم کا مطالعہ وسیع تھا، اور انداز تحریر متین و سنجیدہ ادبی مزاج رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مداح اور اُن کی علمی و دینی عظمت کے معترف "فاران" میں راقم الحروف کے لکھے ہوئے مضامین کا اپنے رسالہ "کتابی دنیا" میں ذکر فرماتے اور ہمیشہ تحسین و ستائش کرتے۔

ضیاءالدین احمد برنی مرحوم کی موت نے اُردو ادب میں کوئی شک نہیں ایک خلا پیدا کر دیا۔ ادب کے اس افراتفری کے دَور میں برنی صاحب کی کتابیں نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اُن کا دماغ سلجھا ہوا تھا، یہی سلجھاؤ اُن کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے، اردو ادب کی تاریخ میں اُن کا ذکر آنا چاہیے۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۹ء)

مولانا ضیاء القادری بدایونی

سنہ ۱۹۱۸ء کا قصہ ہے میں ان دنوں کبیر مڈل اسکول ڈبائی میں انگریزی کی فورتھ کلاس کا طالب علم تھا، اسی سال قصبہ گنور ضلع بدایوں سے اشتہارات ہمارے گاؤں میں بھیجے گئے، ان اشتہارات کی سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی، گاؤں کے لیے یہ بالکل نیا واقعہ تھا، اس سے پہلے کسی جلسہ کا کوئی اشتہار گاؤں والوں کی نگاہ سے نہیں گزرا تھا۔ اس میں مشہور علماء کے نام درج تھے ــــــ جلسہ کا عنوان " رجبی شریف" تھا۔ بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ دوسرے چند لوگوں کے ساتھ میں بھی گنور پہنچا۔

مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا نثار احمد کان پوری اور مولانا محمد فاخر الہ آبادی جن کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی ان کی تقریریں سنیں، مولانا عبدالقدیر بدایونی نے جلسوں کی صدارت کی۔ وہ بدایوں کے سلسلہ قادریہ کے صاحب سجادہ تھے: اس لیے کم عمری کے باوجود بڑے بوڑھے لوگ بھی اُن کی عزت کرتے اور ہاتھ چومتے، مولانا مرحوم کی تقریر بھی اثر انگیز رہی! ان تمام تقریروں میں زیادہ تر " دیوبندیت " اور " وہابیت " کی تردید کی گئی، مولانا فاخر صاحب الٰہ آبادی کی شوخیٔ تقریر تو اس حد تک پہنچ گئی ــــــ انہوں نے فرمایا جو لوگ یہ کہتے ہیں اولیاء اللہ اولاد نہیں دیتے، وہ اپنی عورتوں کو ہمارے یہاں لائیں، ہم انہیں اولاد دیں گے۔

بدایوں کے مشہور نعت خواں محمد حسین بھی اپنی پارٹی کے ساتھ موجود تھے اُن کی نعت خوانی بھی سنی۔ ان شاندار جلسوں کے بانی مبانی مولانا ضیاء القادری تھے جو ان دنوں تحصیل گنور میں سب رجسٹرار قانون گو تھے، مگر اپنی سرکاری ملازمت کے سبب اشتہار میں انہوں نے اپنا نام نہیں دیا، اس کے بعد انہیں بارہا میلاد شریف کے جلسوں میں دیکھا، ایک دو بار وہ کبیر کلاں (میرے وطن) بھی تشریف لائے، مولود خواں اُن کی نعتیں پڑھا کرتے تھے اور اس نواح میں اُن کی نعتیہ شاعری کی خاصی شہرت تھی۔

منشی احمد بخش ابر[1] حسنی گنوری بھی اپنی پارٹی کے ساتھ میلاد کے جلسوں میں نعت خوانی کرتے تھے۔ اُن کی زبانی مولانا ضیاءالقادری کی متعدد نعتیں سنیں۔ مولانا کی نعتیہ غزل کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

تیری مرضی ہے حقیقت میں خدا کی مرضی
ہو خدا اس کی طرف جس کی طرف تو ہو جائے

۱۹۲۲ء میں گنور میں مشاعرہ ہوا جس میں باہر کے شعراء بھی شریک ہوئے، استاد قمر جلالوی مرحوم کو سب سے پہلے اسی مشاعرے میں سُنا، شائق اکبر آبادی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے، صبا اکبر آبادی کا دورِ شباب تھا مگر اُن کی غزل خاصی کامیاب رہی! اسی مشاعرے میں مولانا ضیاءالقادری سے تعارف ہوا، میری غزل کا یہ شعر:

پتلیاں ہیں آخری گردش میں اب بھی دیکھ جاؤ
بات کہنے کو رہے مرنے میں آسانی ہوئی

کئی بار پڑھوایا گیا! ۱۹۲۵ء کے آخر میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جوبلی منائی گئی ہے، انہی دنوں میری شادی ہوئی —— مولانا ضیاءالقادری بدایونی شادی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے مگر ریلوے اسٹیشن پر کسی شناسا شخص کو نہ پاکر اترے نہیں سیدھے علی گڑھ چلے گئے۔ لیکن انہوں نے اس کا مجھ سے شکوہ نہیں کیا کہ تم دولہا تھے۔ شادی کی رسموں کی مشغولیت کے سبب اسٹیشن نہ آسکتے تھے مگر کسی دوسرے آدمی کو تو بھیج سکتے تھے!

مولانا ضیاءالقادری کی ملازمت کا زیادہ زمانہ قصبہ گنور میں گزرا۔ بسولی، داتا گنج اور بدایوں کو اُن کا کئی بار تبادلہ بھی ہوا مگر گنور کی کشش غالب رہی، بسولی ضلع بدایوں کی تحصیل ہے، فانی بدایونی اسی قصبہ میں پیدا ہوئے تھے، ایک بار مولانا ضیاءالقادری سے ملنے کے لیے بسولی پہنچا —— یہ میری شاعری کا دورِ آغاز تھا، میں اپنے کلام کی بیاض مولانا کے پاس بسولی میں چھوڑ آیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُن کا خط آیا کہ تمہاری

---

[1] نہ جانے اُن کے کس گناہ کی پھٹکار پڑی ہے کہ وہ کئی سال ہوئے بہائی (مرتد) ہو گئے ہیں، میں نے خط و کتابت کے ذریعہ بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ شخص الٹا ہم مسلمانوں کو گمراہ سمجھتا ہے۔

بیاض نہ جانے کہاں غائب ہوگئی بہت تلاش کی مگر نہیں ملی، یہ قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ کسی اُستاد سے میری نسبتِ تلمذ نہ ہونے پائے!

کراچی میں جب تک وہ جٹ لینڈ میں رہے، سال کے سال رجب کے مہینہ میں "رجبی شریف" کے عنوان سے جلسے اور نعتیہ مشاعرے کا اہتمام کرتے، مجھے بڑے اصرار اور بزرگانہ شفقت و محبت کے ساتھ مشاعرے میں بلواتے اور میں حاضر ہوجاتا۔

دس بارہ سال سے اُن کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا، شعر پڑھتے اور بات کرتے میں آواز بھی کپکپانے لگتی تین مہینہ قبل شکیل بدایونی کی موت کا پرسا دینے کے لیے اُن کے یہاں گیا تو وہ صاحبِ فراش تھے، نوے سال کے قریب عمر پائی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مولانا ضیاء القادری بدایونی نے رجسٹرار قانون گو کے عہدے سے پنشن لی، وہ بڑے سیر چشم اور دوست نواز تھے۔ عرسوں اور جلسوں میں جاتے تو جتنے آدمی اُن کے ساتھ ہوتے اُن کا ریل کا کرایہ دیتے! اُن کی آمدنی کا خاصہ حصہ نذر و نیاز، فاتحہ اور میلاد کی محفلوں میں صرف ہوتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد دلی کے مشہور ماہنامہ "آستانہ" کے لیے وہ نعت و منقبت لکھتے اور اس کے خریداروں کے چندے کی وصول یابی بھی اُنہی سے متعلق تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اور یہ غیب سے اُن کی آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا ضیاء القادری بدایونی مرحوم سلسلہ قادریہ میں حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اپنے پیر و مرشد سے انہیں والہانہ محبت و عقیدت تھی، عقائد میں سو فیصدی "بدایونی اور بریلوی" اُنہیں اس کا علم تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو فریادرس، مشکل کشا اور حاجت روا نہیں مانتا اور "قادریوں" نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے جو الوہی صفات منسوب کردی ہیں اُن کو میں درست نہیں سمجھتا —— مگر مولانا نے ان مسائل کو کبھی نہیں چھیڑا میں نے خود ایک دو بار ذکر نکالا تو ٹال گئے۔

شاعری میں غالباً وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے، ہوسکتا ہے کہ اپنے خالو (یا پھوپھا) مولانا اسیر بدایونی سے مشورۂ سخن کیا ہو، علامہ اسیر بدایونی آگرہ کالج میں فارسی

کے پیکچرار تھے، اُن کے کوئی اولاد نہ تھی، مولانا ضیاء القادری ہی اُن کے وارث قرار پائے۔ میں نے مولانا اسیر بدایونی کو ۱۹۲۵ء میں دیکھا ہے، عمر پچھتر سے کیا کم ہوگی، اُن کے نام کے ساتھ "یادگار مومن" نہ جانے کس نسبت سے لکھا جاتا تھا۔ مومن تو اُن کی پیدائش سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

مولانا ضیاء القادری مرحوم نے خوش حال زندگی گزاری۔ اُن کے اکلوتے فرزند یوسف حسین قادری مرکزی حکومت پاکستان میں سیکشن افسر ہیں۔ داماد اور بیٹی کے اخراجات کے زیادہ تر کفیل مولانا ہی رہے، اس کا ان کو غم تھا کہ ان کی لڑکی اور لڑکے دونوں بے اولاد ہیں۔

مولانا ضیاء القادری کی شاعرانہ مشق، پرگوئی اور زود گوئی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی، ہزاروں اشعار تو دوسروں کو لکھ کر دے دیئے۔ ماہنامہ "آستانہ" کے لیے ہر مہینہ کئی کئی سو اشعار کہتے۔ بغداد شریف گئے تو سفر کے تمام حالات پوری جزئیات کے ساتھ نظم کر دیئے! "آستانہ" کی وجہ سے اُن کی خاصی شہرت ہوئی۔ میں ۱۹۶۹ء میں جب ساؤتھ افریقہ گیا تو وہاں ان کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا گیا اور بعض نے تو "القادری" کی نسبت سے راقم الحروف ہی کو "ضیاء القادری" سمجھا!

نثر میں انہوں نے بدایوں کی تاریخ (اکمل التاریخ) دو جلدوں میں خاصی تفصیل کے ساتھ لکھی۔ مولانا ضیاء القادری کے شاگردوں میں شکیل بدایونی نے بہت نام پیدا کیا، اُن کی وفات نے بدایوں کی تاریخ کے ایک روشن باب کو ختم کر دیا۔

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۷۰ء)

طفیلؔ احمد جمالی

تقسیمِ ہند سے قبل مسلم لیگ کا اپنا روزنامہ "منشور" دلی سے نکلتا تھا۔ سید حسن ریاض مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے اور مزاحیہ کالم (بے جان بوتل سے مسیحا کے ہاتھ میں) طفیل احمد جمالی لکھتے تھے، یہ کالم خاصہ پسند کیا جاتا تھا۔ کراچی آنے کے بعد جمالی مختلف اداروں سے وابستہ رہے، اپنا اخبار بھی نکالا مگر کچھ دن نکلنے کے بعد ٹھپ ہوگیا، شادی ہونے سے قبل اُن کا یہ عالم تھا۔

؎ دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

میری اُن سے ملاقات مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں ہوئی، رات کو اُن کے یہاں سوتے اور پھر دو دو تین تین دن تک غائب! شادی کے بعد اُن کے اوقاتِ زندگی منظم ہوگئے! اور معمولات میں ہمواری پیدا ہوگئی۔

سات سال پہلے قاہرہ ایرپورٹ سے کچھ دور پی، آئی، اے کے جہاز کا جو المناک حادثہ ہوا، اُسی جہاز سے دوسرے صحافیوں کے ساتھ اُن کی سیٹ بھی بُک تھی مگر کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ویزا یا سپورٹ کے سلسلہ میں کوئی ایسا قانونی سُقم نکل آیا ہے کہ وہ اس جہاز سے سفر نہیں کر سکتے، انہیں چند سال زندہ رہنا تھا ورنہ اس جہاز میں ہوتے تو دوسرے اہلِ قلم کے ساتھ وہ بھی اُس حادثہ کا شکار ہو جاتے۔

جمالی کے معاشی حالات میں مد و جزر آتے رہتے، کئی برس پہلے کی بات ہے، سننے میں آیا کہ وہ پریشان روزگار ہیں، مگر پھر اُن کا چین جانا ہو گیا اور پیکنگ ریڈیو سے ڈھائی تین سال وابستگی رہی! اس طرح یہ زمانہ چین اور آرام سے بسر ہوا! طفیل احمد جمالی نے مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی، یاروں کے یار، ہر مکتبۂ فکر کے ادیب اور شاعر سے سلام دُعا! کسی خاص تحریک اور جماعت سے

وہ وابستہ نہ تھے مگر طبیعت کا ایک حد تک رجحان "ترقی پسندوں" کی جانب تھا! مذہب کی مخالفت میں ایک لفظ بھی میں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا۔ بات کرتے میں کبھی کبھار ناخنوں کی کور بھی کھٹکتے جاتے! کلام میں شعریت، ترنم بھی سامعہ نواز، مشاعروں میں رنگ جما لیتے مگر بعض اوقات سامعین کی فقرہ بازی سے برہم ہو کر دو چار شعر سنانے پر اکتفا کرتے!

کسی جگہ جم کر رہنا انہیں نصیب نہیں ہوا، سال سوا سال سے انہیں سیمنٹ کی ایجنسی مل گئی تھی اور زندگی کی گاڑی کو بہرحال وہ ڈھکیلے جا رہے تھے! رازق تو اللہ تعالیٰ ہے، رزق کا ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرے دروازے کھل جاتے ہیں۔

راقم الحروف سے جب بھی ملتے بڑی محبت کے ساتھ ملتے اور گفتگو میں خردی و بزرگی کے فرق کا لحاظ رکھتے، چار پانچ مہینے ہوئے مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں اُن سے ملاقات ہوئی، شعر و شاعری کا دور بھی چلا، مزے مزے کی باتوں میں پاکستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ بھی رہا! اُن کی صحت اچھی تھی مگر اُن کا وقت آن پہنچا تھا، مکان پر حالت بگڑی تو ہسپتال جاتے ہوئے راستہ ہی میں دم توڑ دیا، پاکستان کے ادبی حلقوں میں اُن کا سوگ منایا گیا اور اخباروں میں اُن کی شخصیت پر مضامین شائع ہوئے۔

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۴ء)

ظریف جبلپوری

تقسیم ہند سے قبل ظریف جبلپوری دلی میں تھے اور وہ مجھ سے بار بار کہا کرتے تھے، کہ تم سے دلی میں کئی بار ملاقات ہوئی ہے مگر میں ظریف دہلوی کے علاوہ کسی دوسرے ظریف سے ہندوستان میں واقف نہ تھا، ایسا تعارف جو بھلایا نہ جا سکے، ظریف مرحوم سے کراچی میں ہوا اب سے چودہ پندرہ سال پہلے کوئی ادبی نشست تھی اس میں ظریف جبلپوری نے اپنی نظم ''موٹر'' گائی، یہ پہلا تعارف ہی دل پر نقش ہو گیا اور اس کے بعد جو اُن سے ملاقاتیں ملنا جلنا اور بے تکلفی رہی ہے تو اس نے دوستی اور یارانے کی صورت اختیار کر لی، کتنے بہت سے مشاعروں میں اُن کے ساتھ موٹر، بس، ریل اور ہوائی جہاز کا سفر کیا ہے ایک کمرے میں اس طرح ہم دونوں ٹھہرے ہیں کہ پلنگ کی پٹی سے پٹی ملی ہوئی، ہر وقت ہنسی خوشی کی باتیں جیسے دنیا جہان کی کوئی فکر ہمارے پاس سے بھی نہیں گزری۔

مشاعروں میں اُن کے دم سے بڑی چہل پہل اور رونق ہو جاتی، خاص طور سے نوجوانوں کے وہ بہت زیادہ پسندیدہ مزاح نگار شاعر تھے، چھ سات گھنٹے کے مشاعرے میں جہاں تیس چالیس شاعروں کی تعداد ہوتی، تنہا ظریف جبلپوری گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ شعر سناتے اور پھر بھی سننے والوں کی سیری نہ ہوتی، اتنی تالیاں، داد و تحسین کا شور اور قہقہے کم ہی شاعروں کو میسر آئے ہوں گے، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی مرحوم اور ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری، مشاعروں میں قہقہوں کی لہر دوڑا دیتی ان کے بعد کسی ظرافت نگار شاعر کا جمنا دشوار تھا۔ مگر ظریف کے اسٹیج پر آتے ہی تبسم و قہقہہ کی لہریں سیلاب بن جاتیں جس میں پورا مشاعرہ غوطے کھاتا ہوا نظر آتا وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ خوب جم کر شعر سناتے اور مشاعرے پر چھا جاتے۔

ظریف جبلپوری مرحوم غزل، نظم، رُباعی، مرثیہ، قصیدہ، منقبت ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے، اُن کے کہے ہوئے مرثیے سن کر اندازہ ہوا کہ وہ سنجیدہ شاعری

کرتے تو بھی نام پاتے۔ ان کا مزاح ہلکا پھلکا مزاح ہے۔ جس میں سادگی روانی اور بے تکلفی کے ساتھ شادابی بھی پائی جاتی ہے! ان کی نظموں میں "ٹیڈی بوائے" "ٹیڈی گرل" اور "ملکہ معظمہ کی آمد" بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہوئیں، ان میں سے جو نظم جس مشاعرے اور نشست میں بھی انہوں نے سنائی بے حد پسند کی گئی۔

ظریف مرحوم کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جب اُن کا دوسرا مجموعہ چھپ رہا تھا تو مجھ سے کہا کہ اس کتاب کی آمدنی اپنی لڑکی کی شادی پر صرف کروں گا، ان کے احباب اور قدر شناسوں نے اس مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ظریف جبلپوری کا گھریلو ماحول اور زندگی بڑے قاعدے قرینے کی تھی۔ بیوی بچوں سے انہیں لگاؤ نہیں عشق تھا۔ کھانے پہننے اور رہنے سہنے میں اعتدال و احتیاط کا لحاظ رکھتے، انہوں نے شاعروں اور شاعروں کے قدر دانوں کی محفلوں میں جام شراب کو کبھی چھوا تک نہیں اور بد کر اور شرط لگا کر کوئی کھیل نہیں کھیلا، وہ سرکاری دفتر میں جس پوسٹ پر تھے اس سے خاصہ فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر انہوں نے بڑی شرافت اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے! اور "دستِ غیب" کے ہر موقع کو پائے قناعت سے ٹھکرا دیا۔

ظریف جبلپوری شیعہ مسلک رکھتے تھے مگر میں نے اُن کی زبان سے طنز و کنایہ اور مزاح و ظرافت کے پیرایہ میں بھی ایک حرف صحابہ کرام کی شان میں گستاخانہ نہیں سُنا، کیا عجب کہ اُن کا آئینہ دل حُبِ اہلِ بیت کی لطافت کے ساتھ "بغضِ صحابہ" کی کثافت سے پاک ہو۔

راقم الحروف سے مرحوم خاص تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ انہوں نے بارہا بالاعلان کہا کہ میں دو شاعروں سے محبت کرتا ہوں جگر مراد آبادی سے اور ماہر القادری سے۔ تین مہینہ پہلے دسمبر (۱۹۶۳ء) میں مشرقی پاکستان کے سفر میں اُن کے ساتھ رہا۔ ڈھاکہ کے علاوہ سید پور، کھلنا اور چاٹگام بھی جانا ہوا، کسے خبر تھی کہ اُن کے ساتھ یہ سفر آخری سفر ہے! ڈھاکہ میں حمایت علی شاعر کو اٹوگراف دیا تو اس میں لکھا تھا ــــ

"ماہر القادری کے بعد تمام شاعروں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

دو ڈھائی سال پہلے اُن پر دل کا دورہ پڑا، بس اُس دن سے یہ خلش کبھی نہ کبھی

ہوتی رہی، میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ طب یونانی میں قلب کی قوت و تفریح کا بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دوائیں اتنی خوش ذائقہ کہ کام و دہن علاوہ از ایں معطر و معنبر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹری علاج کا معاملہ دوسرا ہے۔ ظریف جبلپوری کا اسی علاج سے سابقہ پڑا۔ ایک دن عزیزوں سے ملنے کے لیے لالوکھیت[1] گئے وہاں اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے سب کو خوب ہنسایا، چھ بجے شام کے قریب چائے پی اور چائے پیتے ہی دل میں تکلیف محسوس کی اور لیٹتے لیٹتے ذرا سی دیر میں ختم ہو گئے۔

میں نے صبح سویرے اخبار میں اُن کی "مرگِ ناگہانی" کی خبر پڑھی اور ایسا محسوس ہوا جیسے ساری فضا دھندلا سی گئی ہے، نو بجے رضویہ کالونی پہنچا، اُن کا بڑا لڑکا مجھ سے لپٹ کر بُری طرح رونے لگا۔ اُن کے چھوٹے بچے بھی روتے روتے نڈھال ہو جاتے تھے، اُن کی اہلیہ اور لڑکی کا بین سُنا نہیں جاتا تھا، دس بجے تک بہت سے سوگوار جمع ہو گئے۔ نہ جانے کتنی اشکبار آنکھیں تھیں اور دل تو سبھی کے رو رہے تھے، مسجد میں جنازہ رکھا تھا، چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا، گیارہ بجے کے قریب قبرستان باغ خراسان کی ایک قبر میں اس پیکرِ ظرافت و مزاح کو لٹا کر قبر پر تختے لگا دیے گئے اور پھر — منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخریٰ کی آوازیں! اللہ تعالیٰ کی مغفرت مرنے والے کو نصیب ہو (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۶۴ء)

---

[1] لالوکھیت کراچی کی اضافی بستی جس کو اب لیاقت آباد کہا جاتا ہے۔

ظریفؔ دہلوی

ماہنامہ "ساقی" (دہلی) میں ظریفؔ دہلوی کے مضامین چھپتے رہتے تھے، اسی واسطہ سے اُن سے غائبانہ تعارف تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں میرا دلی آنا ہوا تو میرے بے تکلف دوست صابرؔ دہلوی (مرحوم) نے پہلی ملاقات میں چھوٹتے ہی کہا کہ ماہر! ایک شخص حسنِ اتفاق سے ہاتھ آگیا ہے، خود شاعر ہے، شاعروں کا قدر داں بھی ہے اور مشاعروں میں جانے کا تو اُسے وہ شوق اور ہوکا ہے کہ کوئی حد و نہایت نہیں! تم ظریفؔ دہلوی کے نام سے ضرور واقف ہوگے۔ تمہاری دعوت اُن کے یہاں پکی ہے! اس گفتگو کے دوسرے دن ظریفؔ صاحب سے اُردو بازار میں ملنا ہوا دیکھتے ہی لپٹ گئے اور فرمایا کہ میرے یہاں دعوت کھائے بغیر آپ دلی سے جا نہیں سکتے! پھر ان کے یہاں دعوت ہوئی، کوچہ چیلان میں آصف علی مرحوم کے مکان سے قریب اُن کا نو تعمیر مکان کیا اچھی خاصی کوٹھی تھی! ایک دو ملاقاتوں ہی میں ہم ایسے بے تکلف ہوگئے، جیسے لنگوٹیا یار ہیں! پھر کچھ دنوں کے بعد کراچی کا مشاعرہ نکل آیا میں نے کہا کہ بھئی! راستہ میں اترتے اور سیر کرتے کراچی چلیں گے! شاعروں کے اس قافلہ میں تین ساتھی تھے، صابرؔ دہلوی، ظریفؔ دہلوی اور راقم الحروف پہلے ہم لاہور اترے، دن بھر سیر کی، رات کی ریل گاڑی سے چل کر سکھر پہنچے، وہاں دریائے سندھ کا مشہور "بند" (بیریج) دیکھا، سکھر میں یہ لطیفہ پیش آیا کہ روہڑی ریلوے اسٹیشن سے سکھر بیریج جانے کے لیے تانگہ کیا تو تانگہ والے نے سرکس کے گیٹ پر جا کر ہمیں اتار دیا! سکھر سے روانہ ہوکر یہ قافلہ حیدرآباد (سندھ) اترا اور وہاں سے چل کر کراچی پہنچا کہ یہی منزل مقصود تھی! پیر الٰہی بخش صاحب اُن دنوں وزیر تعلیم تھے انہوں نے اپنی کوٹھی کے قریب ایک دو منزلہ مکان میں شاعروں کے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، پیر صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرے، مولوی صاحب ہی کے ایما پر ہم نے کراچی کا دور دراز سفر اختیار کیا تھا۔ ہم تین کے علاوہ خمارؔ بارہ بنکوی بھی شاعروں

کی اس "چوکڑی" میں شامل ہو گئے۔ کئی دن خوب لطف رہا، ظریف دہلوی مرحوم عمر میں بہت بڑے تھے مگر سر لطف و رنگینی میں برابر کے شریک! وہ بوڑھے تھے لیکن دل جوان تھا! طبیعت بڑی ملنسار پائی تھی، پورے سفر میں اُن کی کسی بات سے کسی ساتھی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

اس سفر کے بعد بہت سے مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا، ہندوستان تقسیم ہوا تو ظریف دہلوی بھی پاکستان چلے آئے اور کراچی کی کسی کمپنی میں معقول مشاہرہ پر ملازم ہو گئے، حساب کتاب (ACCOUNTANCY) کا انہیں بڑا تجربہ تھا، انگریزی حکومت کے پنشن یافتہ اکاؤنٹنٹ تھے، بڑھاپے میں جوانوں سے زیادہ کام کرتے۔ ملازمت کے معاملہ میں بڑے فرض شناس، وقت کے پابند اور دیانت دار! انہوں نے کئی بار نوکری سے چھٹکارا بھی چاہا مگر کمپنی والوں نے انہیں نہ چھوڑا دو سال سے وہ خانہ نشین تھے، عمر اسّی سال سے کیا کم ہو گی، مگر شعر و شاعری کی محفلوں میں اس حالت میں بھی شریک ہوتے کہ کانپتے ہاتھوں میں بیاض ہے اور آواز ہے کہ ناتوانی اور پیرانہ ضعف کے سبب ساز کے ٹوٹے ہوئے تار کی طرح جھنجھنا کے رہ جاتی ہے۔

ظریف مرحوم کثیر الاولاد تھے۔ آخری عمر میں اپنی ایک لڑکی کی بیوگی کا غم دیکھنا پڑا، دوسرا غم بیٹے کا تھا جس نے بمبئی میں کسی گانے والی سے شادی کر لی اور وہیں کا ہو رہا، بوڑھا باپ جوان بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس گیا اور مرتے وقت تک ترستا رہا۔

"فاران" بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے، میں نے اُن کے خطوط محفوظ نہیں رکھے ورنہ انہیں یکجا کر دیا جاتا تو راقم الحروف کے مناقب کا ایک کتابچہ تو ضرور بن جاتا! کبھی کبھار زبان و بیان کی غلطی پر مجھے ٹوک بھی دیتے۔ دلّی کے اس محلہ کے رہنے والے تھے جو علم و فضل کا مرکز رہا ہے، زبان کی نزاکتوں پر بڑی گہری نظر تھی، شاعری تو اُن کا اصل رنگ اور سرمایۂ حیات ہی تھا مگر نثر نگاری میں بھی بڑے مشاق تھے۔ کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔

اردو کے مزاح نگار شاعروں میں ظریف دہلوی ممتاز مقام رکھتے تھے۔ فکر و خیال میں ندرت و شوخی اور اظہار و بیان میں پختگی! زبان کا رچاؤ سونے پر سہاگا! نظم و غزل، قطعہ اور رباعی سبھی کچھ کہتے۔ غالبؔ کی غزلوں پر اُن کی "تضمینیں" بہت خوب تھیں،

جس مشاعرے اور محفل میں پڑھ دیتے، سننے والے لوٹ لوٹ جاتے! غالب کی غزل

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے

کو تضمین کیا ـــ مہنگائی اور راشن سسٹم پر اس طرح طنز اور چوٹ کی

کوئلوں پر مہر ہے، اب آگ سلگائیں گے کیا!

ان کی سب سے زیادہ کامیاب نظم " پرانی رضائی" تھی، جس کا یہ شعر یاد رہ گیا ہے۔

اس کے ایک ایک ٹانکے میں جوں ہے
یہ رضائی مصفیٔ خوں ہے!!

اسی مہینہ ایک ادبی نشست میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کے بڑھاپے کو دیکھ کر ماتھا ٹھنکتا تھا کہ شبستانِ مزاح وظرافت کی یہ شمع اب اور زیادہ دنوں تک نہ بھڑک سکے گی۔ چند دن کے بعد روزنامہ "جنگ" میں اُن کے مرنے کی خبر پڑھی اور دل نے بوڑھے دوست کے بچھڑنے کی چبھن کو محسوس کیا۔ ظریف مرحوم کا نہ کسی انجمن اور ادبی ادارے سے تعلق تھا اور نہ کسی اخبار اور رسالے سے وابستگی تھی۔ اس لیے ان کی موت پر ادب وصحافت کی دنیا میں خاموشی طاری رہی ـــ اللہ تعالٰے مغفرت فرمائے ـــ

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۶۵ء)

مولانا ظفر علی خاں

پہلی جنگِ عظیم کا جب آغاز ہوا تو میرا بچپن تھا۔ اس دور کے دو اخباروں کی یاد کے نقش اب تک دل پر باقی ہیں۔ ایک "سیارہ" جو بڑی دھوم اور طمطراق سے نکلا مگر انگریزی حکومت اس کی بیباکی اور صاف گوئی کو چند ہفتہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ "سیارہ" کی اس نظم :۔

اک جرمنی نے مجھ سے یہ پوچھا از راہِ طنز ... ... بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ دوسرا اخبار "زمیندار" تھا جو ہمارے گاؤں میں انتہائی شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ ہمارے پورے علاقہ میں اسی اخبار کی دھوم تھی کہ جنگ کی خبریں پہنچنے کا یہی اخبار واحد ذریعہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ میرے شعور کا آغاز بھی پورے طور پر نہ ہوا تھا کہ "زمیندار" اور "ظفر علی خاں" کے نام سے کان آشنا ہو چکے تھے!

مکتب کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد اسکول میں جب میں داخل ہوا تو ساتویں جماعت کے اُردو نصاب میں مولانا ظفر علی خاں کی دو نظمیں پڑھیں اور اتنی پسند آئیں کہ ازبر ہو گئیں۔ یہ نظمیں :۔

(۱) ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی تھی زمیں وردی ہری پہنے ہوئے بانات کی
(۲) اے نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا توڑا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

ایک طرف یہ "نقوش" دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں کا نام اخباروں میں برابر چھپتا رہتا تھا۔ اور نہ صرف نام ـــــ اُن کی پُرجوش تقریریں، اُن کے دوروں اور جلوس و خیر مقدم کی تفصیلات اور اُن کے قید و بند کی خبریں بھی۔ غرض مولانا کی ذات سے بچپن سے جو لگاؤ پیدا ہوا تھا اُس کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا۔

۱۹۲۵ء میں میرا دہلی جانا ہوا۔ وہاں اخبار "ہمدرد" میں ایک غزل پڑھی جس کا مقطع تھا :۔

اُس کو آ سکتا نہیں ہرگز بھی قوالی میں لطف
جس نے جوہر اور ظفر کی یہ غزل گائی نہ ہو

اس اعتبار سے یہ غزل اپنی آپ مثال تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں

مرحوم دونوں نے مل کر یہ غزل کہی تھی۔ انہی دنوں میں اخبارات میں اعلان پڑھا کہ مولانا ظفر علی خاں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تقریر فرمائیں گے۔ مولانا مرحوم کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ بہت سویرے سے جامع مسجد میں پہنچا کہ مکبر کے آس پاس جگہ مل جائے اور وہ اس لیے کہ مکبر کے قریب ہی سیڑھیوں پر مقررین جامع مسجد میں تقریر کیا کرتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد اُس وقت تک ہندوستان میں نہ آئی تھی۔ ہر شخص مقرر کی آواز سننے کے لیے اسٹیج کی قربت چاہتا تھا۔

اُن دنوں سہ روزہ "الامان" کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین مرحوم کا جامع مسجد کے نظم و نسق پر غلبہ تھا۔ ان کے مسلک اور سیاسی روش کے مخالف لیڈروں کا جامع مسجد میں تقریر کرنا اور جلسہ کا کامیاب ہو جانا دشوار تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مولانا ظفر علی خاں تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور جلسہ میں شور مچ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولانا مرحوم نے سلطان ابن سعود کی حمایت میں کچھ کہا تھا۔ اُن کے دو چار جملوں کے بعد ہی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ چپقلش اس نوبت تک پہنچی کہ مولانا مرحوم کو جامع مسجد کے ایک گوشہ میں پناہ لینی پڑی!

دوسرے یا تیسرے دن روزنامہ "زمیندار" نظر سے گزرا۔ اُس میں اس جلسہ کی روداد عجیب انداز میں شائع ہوئی۔ عبارت تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی مگر مفہوم قریب قریب یہ تھا کہ جامع مسجد کے اس جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں ہی کی فتح رہی اور جب وہ شرپسندوں کی ہنگامہ آرائی کے بعد جامع مسجد سے باہر آئے تو سیڑھیوں تک عقیدت مند دو رویہ صفوں میں کھڑے تھے۔ روزنامہ "زمیندار" میں اس جلسہ کی جس کا میں خود عینی شاہد تھا۔ یہ روداد پڑھ کر مجھے زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ اس کا احساس ہوا کہ سیاست اور صحافت کی دنیا میں ایسے شگوفے بھی چھوٹتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد غالباً ۱۹۳۱ء میں مولانا مرحوم کی حیدرآباد دکن میں زیارت نصیب ہوئی۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک خوب زوروں پر تھی۔ اور:۔

"آزادی کے پروانے۔ بھردو جیل خانے"

کے انقلابی نعروں سے ہندوستان کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے حیدرآباد دکن میں تشریف لانے اور ایک جلسہ منعقد ہونے کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی۔ بلدہ حیدرآباد میں چوک کی مسجد کے قریب ہی ایک محلہ میں جلسہ کا انتظام تھا۔ میں بڑے

شوق کے ساتھ وہاں پہنچا مگر اس جگہ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک گلی میں دیوار کے سہارے کھڑے ہیں اور کچھ نوجوان ان کے ارد گرد جمع ہیں۔ معلوم ہوا کہ شاہی فرمان کے ذریعہ جلسہ رُکوا دیا گیا اور مولانا کو بھی آج ہی بلدہ حیدرآباد چھوڑ دینے کا حکم ہوا ہے! مجمع کی تعداد اب بڑھتی جا رہی تھی، لوگ جلسہ روکے جانے کی خبر سے کافی مشتعل تھے۔ نوجوانوں کا اصرار تھا کہ مولانا اس حکم کی خلاف ورزی فرمائیں اور یہاں گلی ہی میں تقریر کر ڈالیں۔ مگر مولانا نے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں قانون شکنی کو مصلحتاً پسند نہیں فرمایا۔ انہوں نے اتنا کہا:۔

"میں جانتا ہوں کہ ایسے "فرمان" کا اصل مرکز کہاں ہے اور کس کے اشارے سے یہ نافذ ہوا کرتے ہیں"۔

اُن کا اشارہ ریزیڈنسی کی طرف تھا کہ سیاسی معاملات میں دراندازی کرتی رہتی تھی۔ مجھے خاصہ ملال ہوا کہ دہلی میں بھی مولانا کی تقریر سننے کی حسرت جی کے جی ہی میں رہ گئی اور یہاں حیدرآباد میں ایک موقع میسر ہوا تو عین وقت کے وقت جلسہ پر پابندی لگ گئی۔

اُن دنوں ایک دیسی ریاست میں رہ کر کسی ایسے سیاسی لیڈر سے ملنا جُلنا خطرے سے باہر نہ تھا، کہ جو سرکار انگریزی کا اس قدر معتوب ہو کہ ریزیڈنسی نے اُس کے "ریاست بدر" کیے جانے کا فرمان تک جاری کرا دیا ہو۔ مگر اللہ کے فضل سے ایسے خطرات کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ میں رات کو نام پلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا، مولانا کو "خدا حافظ" کہنے کے لیے۔ ہم کل بیس پچیس آدمی مولانا کی مشایعت کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ہم سب نے بڑی دل گرفتگی کے انداز میں مولانا کو رُخصت کیا۔

اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں اُردو کانفرنس اور مشاعرہ تھا۔ میرے نام دعوت آئی۔ میری طبیعت اُن دنوں ناساز تھی۔ پھر رقمی شرائط بھی خاطر خواہ طے نہ ہو سکے۔ میں نے معذرت لکھ کر بھیج دی۔ مگر جلسے والوں نے اپنے ایک آدمی کو حیدرآباد میرے لانے کے لیے بھیج دیا اور اُن صاحب نے شدید اصرار کیا کہ آپ کو چلنا پڑے گا۔ میں تیار ہو گیا۔ بلدہ سے روانہ ہوا تو طبیعت خاصی مضمحل تھی مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ صبح سویرے کرشنا ندی کو پار کرتے ہی صوبہ مدراس کی سرحد جو آئی تو طبیعت خاصی شگفتہ ہو گئی۔ اُسی ٹرین سے مولانا ظفر علی خاں مرحوم سفر کر رہے تھے۔ اُردو کانفرنس کی صدارت کے لیے اُن کو تکلیف دی گئی تھی۔

مولانا مرحوم اور مجھے شہر مدراس کے محلہ ٹرپلیکین میں مولانا سلطان حسن بھنی کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔ یہ زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ مولانا کی قربت اور معیت مجھے نصیب ہوئی۔ اُس شاہِ ادب و سیاست کے سامنے میری حیثیت ایک مولے کی سی تھی۔ مگر اس "شتر گربگی" کے ذمہ دار جلسہ اور مشاعرے کے منتظمین تھے۔

شب میں کھانے کے بعد مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ یہ جو ہمارے میزبان" بھنی" ہیں۔ اُن کی شان میں ایک آدھ شعر کیوں نہ ہو جائے؟ مگر شرط یہ ہے کہ قافیہ" بھنی" رہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں تو ہر وقت ارتجالاً شعر کہہ سکتا ہوں۔ " بھنی" کے قافیہ کے لیے دوسرا قافیہ سوچ ہی رہا تھا کہ مولانا مرحوم نے حقہ میں کش لگاتے ہوئے ایک شعر برجستہ فرمایا اور" بھنی" کے مقابلہ میں" دہمنی" قافیہ باندھا!

اُردو کانفرنس کا افتتاح ہز ہائینس نواب صاحب بینگن پلّی نے کیا۔ مولانا مرحوم نے پُرمغز اور پُرجوش صدارتی تقریر کی۔ میں نے نظم پڑھی، جس کا مطلع تھا:۔

موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو
طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو

کانفرنس بہت کامیاب رہی مگر مشاعرہ اس سے بھی زیادہ کامیاب رہا۔

مولانا ظفر علی خاں کا سن اُس وقت ستّر کے لگ بھگ تھا۔ مگر اُن کی مصروفیات کی ہماہمی ہم جیسے جوانوں کو شرماتی تھی۔ صبح سویرے اُٹھ کر وہ ٹھنڈے پانی سے غسل فرماتے، پھر نماز پڑھتے اور اس کے بعد ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔ صبح کا یہ گشت کئی کئی میل تک رہتا۔ چلتے اس قدر تیز تھے کہ اوسط رفتار والوں کو اُن کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑتا۔ ٹہل کر واپس آتے ہی ناشتہ کرتے۔ خوراک جوانوں جیسی تھی۔ ایک دن ناشتہ کے وقت توس کو چھوتے ہوئے بولے:۔

"یہاں توس بھی ٹھکانے سے نہیں سینکے جاتے۔ کیا مدراس میں آگ بھی نہیں رہی"۔

ناشتہ کے بعد پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ ملنے والے آئے چلے جا رہے ہیں۔ ایک مل کر رخصت ہوا کہ دو اور آگئے۔ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ مل رہے ہیں۔ سیاسیات پر بحث و مناظرہ تک کی نوبت آجاتی ہے۔ پھر اخبارات کے نمائندوں کی آمد شروع ہوئی۔ اُن کے سوالات کے جوابات دے رہے ہیں۔ ایک دن میں دو دو تین تین

جگہ تقریریں؛ صبح ناشتہ کے بعد سے آدھی رات تک مسلسل مصروفیت۔ مگر اس پیر جواں عزم کے تیور تک میلے نہیں ہوتے تھے۔ ان مصروفیات سے تھوڑا بہت وقت بچتا تو اس میں اخبارات پڑھتے۔

مدراس کے جلسوں، مشاعروں اور دعوتوں سے فارغ ہو کر ہم ویلور پہنچے۔ ویلور کے نام سے کان آشنا تھے کہ سلطان ٹیپو شہید کی شہادت کے بعد اُن کے لڑکے یہیں کے قلعہ میں رکھے گئے تھے۔ وہاں شب میں ایک جلسہ ہوا۔ مولانا مرحوم مسندِ صدارت پر فائز تھے۔ میں نظم پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا ہی تھا کہ کسی نے ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پڑھا تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اُس میں لکھا تھا :۔

"میں نے ابھی ابھی ریڈیو سے سُنا ہے کہ فانی بدایونی کا انتقال ہو گیا"

اس خبر نے جلسہ میں افسردگی کی لہر دوڑا دی۔ میں نے اُس عالم میں تقریر کیا کی یُوں سمجھیے کہ نثر میں فانی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی اپنی تقریر میں اظہارِ غم فرمایا۔ مولانا مرحوم ویلور سے صوبہ مدراس کے کسی دوسرے شہر میں تشریف لے گئے اور میں بنگلور پہنچا۔ تین چار دن کے بعد مولانا بھی بنگلور آ گئے اور حُسنِ اتفاق کہ میں جن صاحب (عبد الغفور صاحب مودی) کے بنگلہ میں ٹھہرا تھا اُسی میں مولانا نے قیام فرمایا۔ اور کئی دن تک اُن کا ساتھ رہا۔

ہاں ایک بات تو رہی جاتی ہے۔ مدراس اور ویلور کے لوگوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ آؤ بھگت کی۔ اُن کے یہاں کی دعوتوں میں کھانے بھی متنوع اور لذیذ ہوتے تھے۔ مگر ذائقہ کے اختلاف کو کیا کیجیے کہ زبان کسی اور چٹخارہ کا مطالبہ کرنے لگی۔ میں نے ویلور میں مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ اگر پسند فرمائیں تو دال آپ کے ملازم سے پکوانے کا بندوبست کیا جائے۔ مولانا نے اس خوش دلی کے ساتھ میری رائے سے اتفاق کیا گویا میں نے اُن کے دل کی بات اپنی زبان سے کہہ دی۔ میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ آج دوپہر کے کھانے میں جو آپ کا مزاج چاہے تیار کرائیں مگر دال مولانا کا ملازم پکائے گا۔ آپ جنس لا کر دے دیں۔ اُن صاحب نے اُس وقت تو شرما حضوری ہامی بھر لی مگر جنس لا کر نہ دی۔ غالباً انھوں نے اس میں اپنی سُبکی محسوس کی کہ اُن کے یہاں کی دعوت میں کسی مہمان کا ملازم کوئی سالن پکائے۔ دوپہر کو دسترخوان پر کھانا چُنا گیا تو ایک بڑے سے بادیہ میں دال بھی آئی جس پر کئی کئی اُنگل

گھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو افیونی کا قصہ بچپن میں سنا کرتے تھے:۔

"اِدھر گھی اُدھر گھی، گھبرایا میراجی"

تو اسی طرح کا سابقہ ہمیں بھی پیش آرہا تھا۔ میں نے مولانا کو دیکھا اور انھوں نے مجھے۔ اور دونوں اپنی اس بے بسی پر مسکرا کر رہ گئے۔

بنگلور کے بعد ناگ پور میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ ان کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال، مسلم لیگ نیشنل گارڈ اور نیلی پوشوں کے دستہ کی سلامی کا منظر، وہ پنڈال میں مولانا کی صدارتی تقریر، ایک ایک بات حافظہ میں آج تک محفوظ ہے!

مسلم لیگ کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے مولانا لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ اُن کے جانے کے کوئی دو گھنٹے کے بعد یہ وحشت اثر خبر ملی کہ گرانڈ ایکسپریس ناگپور سے کچھ دور پہنچ کر اُلٹ گئی۔ میں ناگپور میں نواب محی الدین علی خاں مرحوم[1] کے یہاں مہمان تھا۔ اس خبر کے سنتے ہی وہ اپنی موٹر کار میں مجھے لے کر دوڑے۔ راستے میں نواب صدیق علی خاں اور مسلم لیگ کے دوسرے کارکن بھی ساتھ ہو لیے۔ ناگپور کی سڑک پر موٹروں، تانگوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا تھا۔ ایمبولینس گاڑیاں تیزی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ ہم آدھ گھنٹہ میں موقعۂ واردات پر پہنچ گئے۔ عجب منظر دیکھا، ریل کی پٹڑی جگہ جگہ سے بل کھا کر مڑ گئی تھی۔ پوری ٹرین ایک طرف کو جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ حادثہ انتہائی ہولناک تھا۔ ٹرین کو اُلٹ جانا چاہیئے تھا مگر ساری بلا انجن سے جڑے ہوئے آموں کے ڈبہ پر آ کر رہ گئی۔ جانی نقصان ذرا سا بھی نہیں ہوا۔ بس ایک مسافر کے پہونچے میں بہت ہی معمولی چوٹ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی اس شان کو بھی دکھا دیا کہ ہلاکت و تباہی کے بالکل کنارے پر پہنچا کر وہ بچا بھی سکتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

---

[1] سی پی کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے۔ انتہائی رنگین مزاج اور تفریح پسند! دہلی آتے تو "ارباب نشاط" کے نصیبے جاگ اٹھتے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے گھر کو لوٹتے۔ صوبہ متوسط (مدھیہ پردیش) میں ان کی زمینداری کا علاقہ شیر کے شکار کے لیے مشہور تھا۔ بڑے اچھے قدر انداز تھے، دیوں شیر شکار کیے۔ ناگ پور میں کوئی مذہبی اور سیاسی جلسہ اور بڑا مشاعرہ ایسا نہ ہوتا جس میں نواب صاحب مرحوم دل کھول کر مالی معاونت نہ کرتے ہوں۔ اللّٰھم اغفرہٗ

(م۔ق)

مولانا ظفر علی خاں اپنی نیلی قمیص پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے کھیت میں کھڑے تھے۔ ہم انہیں لے کر شہر آگئے۔ دوسرے یا تیسرے دن کی گاڑی سے وہ لاہور روانہ ہوئے۔ اُسی ٹرین سے حیدرآباد دکن کی سب سے بڑی پائیگاہ کے والی نواب معین الدولہ بہادر کی صاحبزادی بھوپال جارہی تھیں۔ مَردوں کا سا چوڑا پاجامہ اور کوٹ۔ سر کا جُوڑا بندھا ہوا۔ مگر انداز میں مردانہ پن! مولانا مرحوم نے برجستہ فرمایا:-

آسماں جاہ کی یہ پوتی ہیں

انقلابات ہیں زمانے کے!

ناگپور کے بعد مولانا سے ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ کرافٹ مارکیٹ کے قریب شاہ جہاں ہوٹل میں قیام تھا۔ اپنے پوتے منصور علی خاں کی شادی کے سلسلہ میں حیدرآباد دکن جارہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور معانقہ فرمایا۔ آخری بار میں نے انہیں ۱۹۵۰ء میں دیکھا۔ لاہور میں اسلام پسند طلباء نے ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ مولانا مرحوم صدرِ مشاعرہ تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ بڑھاپے کے آثار اعضا، پر ہی نہیں، آواز اور ہوش وحواس تک پر طاری ہو چکے ہیں۔ ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا اُسے دیکھ کر شعر پڑھ رہے تھے۔ اور ہاتھ تھر تھر کانپتا جاتا تھا۔ بس اس کے بعد پھر ملنا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اُن کے مرنے کی خبر سُننی پڑی۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام!

مولانا ظفر علی خاں مرحوم اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کے گریجوایٹ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں بی اے خال خال ہی ہوتے تھے۔ اسی امتیاز اور علمی اعزاز کے سبب ان کے نام کے ساتھ برسوں تک "بی اے" لکھا جاتا رہا۔ علی گڑھ کالج کے وہ نہایت ذہین اور مقبول طالب علم تھے۔ ریاست حیدرآباد دکن سے کئی سال تک ملازمت کا تعلق رہا۔ یہ وہ دَور تھا کہ حکومتِ دکن کے اہم محکموں پر انگریز چھائے ہوئے تھے۔ مولانا مرحوم نے آزاد فطرت پائی تھی۔ طبیعت میں جوش تھا اور باطل سے اُلجھنے بلکہ ٹکر لینے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ دکن میں وہ اُس پارٹی کے سرگرم کارکن بن گئے جو انگریز افسروں کے اثر و اقتدار کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ ڈاکر نام کا ایک انگریز اُن دنوں ریاست حیدرآباد میں فینانس منسٹر تھا۔ اُس ظالم نے لُوٹ مچا رکھی تھی۔ دکن کے بڑے بڑے اُمراء اُس سے دبتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی طبع خوددار اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے ایک نظم (ڈاکر نامہ) لکھی جو اس قدر مقبول اور مشہور ہوئی کہ اس کی ایک

ایک کاپی جس کی اصل قیمت آنہ دو آنہ تھی ایک ایک روپے میں بکی۔ حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا مگر لوگ چھپا چھپا کر اس کی نقلیں ایک دوسرے کے پاس بھیجتے تھے۔ میں جب سب سے پہلے حیدر آباد دکن گیا ہوں تو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کو حیدر آباد چھوڑے ہوئے تقریباً اٹھارہ سال ہو چکے تھے مگر اس وقت بھی اس نظم کا چرچا تھا۔ تین شعر :-

نہ بنگالی[1] سے بالکل ڈر نہ مدراسی کی پروا کر مگر سمجھے میں جھٹ گرجا نظر آجائے گر دا کر

یہ کہہ دو ماہر[2] الدولہ سے تم تو نثر عاری ہو پلوں میں کر چکا ہے نظم کو زیر و زبر واکر

پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت اک اینگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتروا کر

دیسی ریاستوں کو تو انگریز افسر اپنی چراگاہ سمجھتے تھے۔ ظفر علی خاں جیسے آزاد فطرت، حق گو اور انگریز دشمن انسان کو وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کا شاہی فرمان کے ذریعہ ریاست سے اخراج عمل میں آیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں آزادی کا جذبہ مسز اینی بیسنٹ کی تحریک "ہوم رول" سے بہت آگے پہنچ چکا تھا۔ گوکھلے اور تلک کی قیادت کا ہر طرف شہرہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے نہایت جوشیلی آزاد طبیعت پائی تھی۔ حیدر آباد دکن میں انگریز افسروں کے جابرانہ طرزِ عمل نے اُن میں غلامی کے خلاف اور زیادہ اکساہٹ پیدا کر دی۔ پنجاب آکر اپنے والد کے نکالے ہوئے ہفتہ دار "زمیندار" کو روزنامہ کیا اور تھوڑی سی مدت میں اپنے قلم کے زور سے "زمیندار" جیسے فرسودہ اور نامقبول نام کے اخبار کو مقبول بنا دیا۔ اسی نقطہ سے اُن کی لیڈری کا آغاز ہوا۔ خلافت اور کانگرس کی تحریکوں کے صفِ اوّل کے قائدین میں مولانا مرحوم کا شمار ہوتا تھا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بس انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار آزادی کے جرم میں قید و بند کی سزا سے دوچار ہوئے۔ سب سے پہلی بار قید سے چھوٹ کر جب دلی آئے تو عوام نے اس قدر پُرجوش استقبال کیا کہ مولانا کی اس ہر دلعزیزی سے انگریزی حکومت کو تشویش پیدا ہو گئی۔ نہرو رپورٹ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد علی برادران

[1] مصرعہ ٹھیک طرح یاد نہیں رہا۔

[2] یہ محکمۂ فوج کے غالباً معتمد تھے [3] ریاست دکن میں باقاعدہ فوج (REGULAR FORCE) کے علاوہ "فوج بے قاعدہ" بھی تھی جس کا تعلق محکمہ "نظمِ جمعیت" سے تھا۔

تو کانگرس سے علیٰحدہ ہوگئے۔ مگر غالباً مولانا مرحوم کئی سال تک کانگرس کے ساتھ رہے۔ مگر جب ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تو انھوں نے کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر انھوں نے صرف کانگرس کو چھوڑا تھا، آزادی کی جدوجہد اور انگریز دشمنی میں کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے پیچھے نہ تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک جب شباب پر آئی تو مولانا پر بڑھاپا آگیا!

شریف حسین اور سلطان ابن سعود کے مابین کشمکش کیا باقاعدہ جنگ ہوئی تو مولانا نے سلطان ابن سعود کی پُرجوش حمایت کی۔ امیر امان اللہ خاں کی ذات سے اُن کو محبت نہیں عقیدت سی تھی۔ امان اللہ خاں کی حمایت اور نادر خاں کی مخالفت میں انھوں نے اپنے قلم و زبان کا پورا زور صرف کر دیا۔ اُن کی اُس زمانہ کی ایک نظم کا یہ مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے ؎

درس غداری کا لینا ہے تو نادر خاں سے لے

کانگریس سے علیحدہ ہونے کے بعد نہ جانے کتنی تحریکیں شروع کیں اور کتنے مختلف محاذوں کو اپنے جذبات اور خیالات کی جولاں گاہ بنایا۔ عزم اور حوصلہ کا یہ عالم کہ نیلی پوشوں کی چھوٹی موٹی فوج بنا کر کھڑی کر دی!

اُردو صحافت میں مولانا مرحوم امامت کا درجہ رکھتے تھے۔ "زمیندار" نے صحافت اور قربانی دونوں چیزیں ملک کو سکھائیں اور عوام نے بھی ہر نازک موقع پر "زمیندار" کی دل کھول کر مدد کی۔

"ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ـــــ رجعتِ قہقری ـــــ نعرہ ہائے فلک شگاف"۔

اس قسم کی نہ جانے کتنی ترکیبیں صحافت کو "زمیندار" اخبار نے دی ہیں۔

ڈریپر کی مشہور کتاب (CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE) کا اُردو ترجمہ ـــــ (معرکہ مذہب و سائنس) اپنی جگہ زبان و بیان کا شاہکار ہے۔ مولانا مرحوم نے اُس زمانہ میں یہ ترجمہ کیا ہے جب کہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں "تمدنِ ہند" اور "تمدنِ عرب" کے علاوہ کسی اور اچھے ترجمہ کا نمونہ اردو زبان و ادب میں نہیں تھا۔ اس کتاب میں فلسفہ، ریاضی، تاریخ، علم کلام، فنِ تعمیر کی اصطلاحات جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مولانا نے ان کو جس خوبی سے اُردو کا قالب عطا کیا ہے وہ حقیقت میں ترجمہ کا معجزہ ہے۔ اس کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ بھی بڑے معرکہ کا ہے۔

مولانا مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ ان کی تقریر اور

گفتگو سن کر اور ان کی نظم و نثر کو پڑھ کر کوئی اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ شخص پنجاب کی کسی کرم آباد نام کی بستی میں پیدا ہوا ہے۔ یوپی کی زبان ہی نہیں لہجہ تک کو اپنے اندر جذب کر لیا اور وہاں کے ماحول سے جو کچھ سیکھا اس کے وہ آخر دم تک قدر شناس اور معترف رہے۔

شعر گوئی پر وہ قدرت کہ ذرا پلک جھپکائی اور شعر ڈھلا ڈھلا یا تیار! توانائی کے تو وہ بادشاہ تھے مگر شعر و ادب کی یہ ٹریجڈی ہے کہ صحافت و سیاست کی مصروفیات کے سبب وہ شاعری کو خاطر خواہ وقت نہ دے سکے۔ شاعری فرصت چاہتی ہے، غور و فکر چاہتی ہے۔ اس کے لیے مولانا مرحوم وقت کہاں سے لاتے۔ رفتہ رفتہ وہ خود چلتے ہوئے موضوعات پر زود گوئی کے عادی ہو گئے۔ ان کے کلام میں جہاں :۔

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتولؑ!

جیسے غیر فانی شعر ملتے ہیں وہاں :۔

"دھر رگڑا" اور "لشکر نیلی پوشوں کا، بھئی لشکر نیلی پوشوں کا"

جیسی سطحی نظمیں بھی پائی جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم اردو زبان کے خاصے اچھے مقرر تھے۔ تقریر کرتے میں جوش میں آتے تو چہرہ تمتمانے لگتا۔ لباس سادہ پہنتے تھے۔ حقہ کا وہ شوق بلکہ لت کہ ان کے نوکر کو چلتی ریل میں چلم بھرنی پڑتی۔ دین کے معاملہ میں بڑے غیرت مند اور حساس واقع ہوئے تھے۔ دین پر ذرا سی طنز بھی کوئی کرتا تو آگ بگولا ہو جاتے۔ زمانہ کے بہت کچھ سرد گرم دیکھے تھے۔ اپنی لیڈری کا چڑھاؤ بھی دیکھا اور اس کا اتار بھی!

عشقِ رسولؐ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ حضور خاتم النبیینؐ کے در کی غلامی ہی پر مرحوم نے ہمیشہ فخر کیا اور اسی مقدس نسبت کو سینہ سے لگائے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا سب سے بڑا دینی کارنامہ "قادیانیت" کے خلاف ان کا قلمی جہاد ہے۔ قادیان کے اس جھوٹے نبی اور اس کے بیٹے مرزا بشیر محمود کو انہوں نے اپنی نظموں میں ننگا کر کے چوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ قادیانیت کے خلاف ان کی ایک ایک نظم ان کے لیے سندِ شفاعت اور مغفرت کا پروانہ ہے۔

مولانا نے بہت بڑی عمر پائی۔ نوے سال کے لگ بھگ! مگر آخر؟ فنا.....!

بہت سارد یئے اُن پر جو اس جینے پہ مرتے ہیں

زندگی کو کوئی وہم و خواب اور حکایت و افسانہ سمجھ لے تو سمجھ لے مگر موت کی واقعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جس نے اس زندگی ہی کو سب کچھ سمجھا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا وہ بڑے گھاٹے میں رہا۔ مشاہیر کی موت کی خبریں سُن کر بھی کسی کو عبرت نہ ہو تو ایسے غفلت زدہ قلب کی بے حسی سے اللہ تعالےٰ کی ہزار بار پناہ !

جانے والے تجھے اعلیٰ علیین میں اُن نفوسِ قدسیہ کا قرب نصیب ہو جن کو قرآن میں " اَنعَمتَ عَلَیھِم " کہا گیا ہے اگر ارواح کو بارگاہِ احدیت میں عرض معروض کرنے کی اجازت ہو تو عرض کرنا ــــ اے معبود ! دنیا کے پردے پر تیرے محبوب نبیؐ کی اُمت ہی کو سب سے زیادہ پراگندہ اور پریشان روزگار چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہزار بداعمالیوں کے باوجود آج ساری دُنیا میں کوئی قوم تجھ سے، تیرے نبیؐ سے، تیرے بھیجے ہوئے قرآن سے نسبت رکھتی ہے تو وہ یہی مصیبت زدہ ملت ہے۔ چاروں طرف سے " ابرہوں " نے اس ملت پر ہجوم کر رکھا ہے۔ تیرے غضب کی ابابیلیں آخر کب آئیں گی اور باطل کی قوتیں کس دن پاش پاش ہوں گی۔ وقت وہ آن پڑا ہے کہ سعید روحیں تک " متٰی نصر اللہ " پکار رہی ہیں۔ مالک ! اپنی نصرت جلد نازل فرما ! بہت جلد ! (آمین)

(ماہنامہ " فاران " جنوری ۱۹۵۷ء)

سراج الدین ظفر

سراج الدین ظفر سے میری پہلی ملاقات پاکستان بننے کے بعد کراچی کے کسی مشاعرے میں ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ اب تک جاری رہا کسی نہ کسی ادبی نشست، مشاعرے یا دعوت میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا۔ شروع شروع میں اُن سے ملاقات کی یہ تقریب بھی رہی کہ میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی علمی اور تاریخی کتابوں کی تلاش میں اُن کی بک ڈپو (واقع بندر روڈ) جاتا، اور وہاں کتابوں کے بارے میں اُن سے گفتگو رہتی، یہ ملاقات دو شاعروں کی ملاقات نہیں بلکہ کتابوں کے گاہک اور ایک کتب فروش کی ملاقات تھی! جس میں مروت شناسائی اور تعارف کو دخل انداز ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔

جہاں تک مشرب اور دینی افکار و عقائد کا تعلق ہے سراج الدین ظفر اور راقم الحروف کے درمیان بعد المشرقین تھا مگر ملنے جلنے میں ایسا محسوس ہوتا کہ شاعری نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے!

کئی مشاعروں میں ایسا بھی ہوا کہ سراج الدین ظفر نے اپنا کلام سناتے ہوئے شیخ، زاہد اور پارسا کے ذکر پر راقم الحروف سے خاص طور پر خطاب کیا اور میں سامعین کی توجہ اور تبسم کا فوکس بن کر رہ گیا۔ یہ بڑا نازک وقت اور معرکہ کا ہنگام تھا، میں خاموش رہتا تو رندی و سرخوشی میرے سکوت کو اپنی فتح سمجھتی! میں نے سراج الدین ظفر ہی کی غزل میں فی البدیہہ اشعار کہے جن میں شراب نوشی اور رندی پر گہری طنز تھی، راقم الحروف کے ان شعروں نے مشاعرے کے رنگ ہی کو بدل دیا، اب میری بجائے ظفر سامعین کے قہقہوں کی زد میں تھے! ایسے تین چار معرکے رہے، پھر سراج الدین ظفر محتاط ہو گئے۔

اُن کے انتقال سے دو ہفتہ پہلے کراچی سے میر پور خاص تک ایک ہی میکروبس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اقبال صفی پوری میر کارواں تھے۔ شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج میر پور خاص میں مشاعرہ تھا، کالج کے ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے کا موقعہ ملا! باتوں

باتوں میں "روحِ رواں" اور "روح و رواں" کی بحث چھڑ گئی۔ سراج الدین ظفر کا موقف یہ تھا کہ "روحِ رواں" کی ترکیب غلط ہے! میں نے خاصی تفصیل سے بتایا کہ "روحِ رواں" کسی لحاظ سے بھی غلط نہیں ہے! بعض ادیبوں اور شاعروں کو اس لفظ (روحِ رواں) کے بارے میں بلا وجہ کا وہم ہو گیا ہے! فارسی والے بےشک "روحِ رواں" نہیں بولتے، یہ ترکیب اردو والوں کی ایجاد ہے! تابش دہلوی نے میرے موقف کی تائید کی!

میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ ظفر اپنے خسر کی بک ڈپو میں منیجر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں مگر اس دن اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اس کتاب گھر کے مالک ہیں۔ خود ہی کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے! اس سلسلہ میں ایوب خان کے دورِ حکومت کی تعریف کی۔

پیشہ اور روزگار کا یہ انتخاب بھی عجیب ہی رہا کہ سراج الدین ظفر نے بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کی بجائے ایر فورس میں ملازمت اختیار کی، وہ برسوں برطانوی فضائیہ میں پائلٹ رہے ہیں! ان کا شمار اچھے ہوا بازوں میں ہوتا تھا۔ جس شاعر کا پیشہ "پرواز" رہا ہو، اس کے شاعرانہ افکار کی اڑان بھی اونچی ہونی چاہیے۔

سراج الدین ظفر خالص مجاز اور بادہ و شاہد کے شاعر تھے، مرزا غالب فرماتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مگر سراج الدین ظفر کو مشاہدۂ حق سے کوئی لگاؤ اور مسائل تصوف سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی، اسی لیے اُن کے بادہ و صہبا، جام و مینا، زلف و رخسار اور وصل و نظارہ کا ذکر استعاروں میں نہیں بلکہ انہی معنیٰ میں ہے، جو حقیقی معنیٰ ان الفاظ کے ہیں! ظفر کی شاعری مجاز اور خالص مادی لذتیت کی شاعری ہے اس لیے اُن کے یہاں جگہ جگہ پارسائی اور زہد و تقویٰ پر شدید قسم کی طنز ملتی ہے

؎ میرا سبو چراغ کا نعم البدل ہوا
؎ نسیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے
؎ آبگینے قمریوں کی طرح بولتے رہے

ان مصرعوں سے ظفر کی شاعری کے لہجہ کے ترنم، روانی اور شادابی کا اندازہ کیا

جا سکتا ہے! کوئی شک نہیں سراج الدین ظفر شعر و سخن میں اپنا انفرادی آہنگ رکھتے ہیں۔ اور دورِ حاضر میں لذتیت کے وہ سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ غمِ دوراں کو تو انہوں نے اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ رہا "غمِ جاناں" سو وہ خلش نہیں بننے پایا۔

سراج الدین ظفر خوش پوشاک ہی نہیں خوش مزاج بھی تھے۔ مالی آسودگی بھی انہیں میسر تھی۔ ساٹھ سال کی عمر میں وہ جوانوں کی طرح کسے بندھے اور چاق چوبند رہتے مگر کئی سال سے ان کے سر کے نصف حصہ میں درد رہنے لگا تھا۔ درد کی حالت میں بھی وہ دعوتوں میں شریک ہوتے اور مشاعروں میں اپنا کلام سناتے۔ ان کی صحت ان کی درازیٔ عمر کی پیش گوئی کرتی تھی مگر قضا و قدر کے آگے کس کی چلتی ہے! ان کی آخری غزل "نعتِ رسولؐ" تھی، جو انہوں نے ٹیلی ویژن کراچی کے نعتیہ مشاعرے میں پڑھی تھی:

مدحِ شہِ کونین ہی اب زینتِ لب ہے[1]
جھک اے فلکِ پیر کہ ہنگامِ ادب ہے

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے!

(ماہنامہ "فاران"، جون ۱۹۷۲ء)

---

[1] یہ مصرعہ مجھے اسی طرح یاد ہے، شاید اصل مصرعہ کے الفاظ کچھ مختلف ہوں۔ (م۔ ق)

یادِ رفتگاں کی دوسری اور تیسری جلد بھی جلد شائع ہو رہی ہے

ان میں

جن "رفتگاں" کے تذکرے شامل ہوں گے ان کے نام یہ ہیں:

جلد دوم

خان بہادر عالم علی خان - مولانا عامر عثمانی - مولانا عبد الباری ندوی
سید عبد الجبار - پرنسپل عبد الحکیم قریشی - پروفیسر عبد الحمید صدیقی - مولانا
عبد الشکور فاروقی - مولانا عبد الحامد بدایونی - عبد الحمید اسمٰعیل - مولانا عبد الماجد دریابادی - عبید اللہ السندھی - مولوی
عبد الحق بابائے اردو - افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق - سر شیخ عبد القادر - ملک نصر اللہ خان عزیز -
مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری - مولوی عزیز الحق - مولانا عبد العزیز کوٹھہ والے - عبد القیوم خان -
نواب میر عثمان علی خان نظام دکن - عطیہ فیضی - علی اختر - چوہدری علی احمد خاں - چوہدری غلام محمد - مولانا
محی الدین غازی اجمیری - نواب فخر یار جنگ - مولانا فضل الرحمٰن انصاری - قابل اجمیری - قمر جلالوی
مولانا حمید الدین قمر فاروقی - قیسی رامپوری - حکیم کبیر الدین -

جلد سوم

حافظ مبارک علی - مجید لاہوری - مولوی مجید حسن - مولانا محمد ادریس
کاندھلوی - نواب محمد اسمٰعیل خان - حاجی محمد اصطفا خاں لکھنوی
پروفیسر محمد الیاس برنی - سید محمد امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین - مولانا محمد ایوب دہلوی -
محمد باقر خاں - محمد بشیر الابراہیمی - سید محمد جعفری - علامہ محمد حسین محوی، منشی محمد خلیل - علامہ محمد خلیل عرب
مولانا مفتی محمد شفیع - میاں محمد شفیع - مولانا سید محمد طلحہ - پیر محمد ہاشم جان مجددی - مولانا محمد یوسف امیر تبلیغی جماعت
مولانا محمد یوسف بنوری - محمد یوسف صدیقی - مرزا محمود سرحدی - ڈاکٹر محمود حسین خان - مخدوم محی الدین -
نواب نثار یار جنگ مزاج - سید مسعود رضا - مولانا مسعود عالم ندوی - نواب مکرم علی خان - ڈاکٹر ممتاز حسن -
مولانا مناظر احسن گیلانی - منظر صدیقی - ناطق لکھنوی، نواب ناظر یار جنگ - نخشب جارچوی، ڈاکٹر نذیر احمد شہید
نذیر دہقانی - سردار عبد الرب نشتر - نصرت قریشی - نظر حیدرآبادی - نوح ناروی - نہال سیوہاروی -
نیاز فتحپوری - واحد بخش قادری - ملا واحدی - سید وحید قیصر ندوی - سید وقار عظیم - ڈاکٹر ہادی حسن
اور ـــــ کچھ دوسرے مضامین